

# معاصر دینی تعلیم

مشکلات و احوال



ایفا پبلیکیشنز



# معاصر دینی تعلیم - مشکلات و احوال

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	معاصر دینی تعلیم - مشکلات و احوال
صفحات	:	۳۳۴
سن طباعت	:	فروری ۲۰۱۲
قیمت	:	۱۷۰ روپے

ناشر

ایفا پبلیکیشنز

۱۶۱- ایف، بڈسمٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

فون: 11-26981327

ای میل: ifapublications@gmail.com



## مجلس اولیٰ

- ۱- مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی
- ۲- مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
- ۳- مولانا بدر الحسن قاسمی
- ۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
- ۵- مولانا عتیق احمد پستوی
- ۶- مفتی محمد عبید اللہ سعدی



## فہرست

۱۱	پیش لفظ:	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۱۳	افتتاحی کلمات:	پروفیسر اختر الواسع
۲۱	تجاویز	

### پہلا باب: مدارس کا نصاب تعلیم

۲۹	ہندوستان کے دینی مدارس میں فقہ و اصول فقہ کا نصاب	مولانا عتیق احمد قاسمی
	درس - جائزہ اور تجویزیں	

### دوسرا باب: معاصر دینی تعلیم - مشکلات و احوال

۳۵	دینی مدارس اور ان کی اہمیت اور اس کے مسائل پر غور	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
۵۱	معاصر دینی تعلیم - تقاضے اور دشواریاں	مولانا بدر الحسن قاسمی
۶۶	چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر	پروفیسر محسن عثمانی ندوی
۷۷	معاصر دینی تعلیم اور عصر حاضر کے تقاضے	مولانا ثناء الہدی قاسمی
۸۵	دینی مدارس کے فارغین میں مطلوبہ صلاحیتوں اور استعداد	مولانا فہیم اختر ندوی
	کی کمی کے اسباب	

### تیسرا باب: مدارس کا نظام تربیت

۹۷	دینی مدارس میں تربیت کا نظام - ایک جائزہ	مولانا شہد رفیق ندوی
۱۱۰	دینی مدارس اور تربیت اساتذہ	مولانا محمد طاہر مدنی

۱۲۵	مولانا قاسم مظفر پوری	دینی مدارس اور تربیت اساتذہ و معلمین
۱۳۷	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی	طلبہ کی تقریری و تحریری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا طریقہ
۱۳۴	مولانا انیس الرحمن قاسمی	علم کی اہمیت و ضرورت
۱۵۲	مولانا وارث مظہری	تدریس میں مشق اور ہوم ورک کی اہمیت
۱۶۰	ڈاکٹر سرور عالم ندوی	دینی مدارس اور تربیت اساتذہ
۱۶۵	مولانا محمد شبلی قاسمی	مساجد اور نظام تعلیم

### چوتھا باب: مدارس اور کتب خانے

۱۷۳	مولانا ارشد فاروقی	دینی مدارس کے کتب خانے - جمود و ترقی کے آپنے میں
۱۸۹	مولانا رضوان احمد ندوی	دینی مدارس اور کتب خانے

### پانچواں باب: مدارس میں عربی کی تعلیم

۱۹۷	مولانا واضح رشید ندوی	ہندوستان میں عربی زبان و ادب ماضی اور حال کے آئینہ میں
۲۰۷	ڈاکٹر سمیع اختر	دینی مدارس میں عربی زبان ذریعہ تعلیم ضرورت و تدابیر
۲۳۵	مولانا وثیق احمد ندوی	دینی مدارس میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کرنے کی ضرورت اور اس کی تدبیریں

### چھٹا باب: مدارس میں ریسرچ و تحقیق

۲۴۹	مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی	دینی مدارس کے شعبہ ہائے اختصاص میں ریسرچ و تحقیق
-----	-----------------------------------	--

### ساتواں باب: مدارس کی اسناد اور مقابلہ جاتی امتحانات

۲۵۹	پروفیسر سعود عالم قاسمی	یونیورسٹی میں مدارس کی اسناد کا معادلہ
۲۷۱	مولانا ابوالکلام قاسمی	مدارس کے فارغین اور مقابلہ جاتی امتحانات



## آٹھواں باب: مدارس کے مسائل

- ۲۸۱ دینی مدارس اور طلبہ کے طعام اور رہائش کا معیار مولانا غطریف شہباز ندوی
- ۲۹۳ دینی مدارس و مکاتب میں تادیب و تنبیہ مولانا نورالحق رحمانی
- ۳۰۴ عصری اور علوم اسلامیہ کو ایک نئے تعلیمی انقلاب سے پروفیسر احمد سجاد  
ہمکنار کرنے کی ضرورت
- ۳۱۳ مدارس اسلامیہ اور میڈیکل سائنس ڈاکٹر فخر عالم
- ۳۲۴ بہار کے ملحقہ مدارس - مسائل، مشکلات اور حل مولانا وصی احمد شمسی





## پیش لفظ

کسی بھی فکر کے بقا اور ارتقاء کے لئے تعلیم بنیادی وسیلہ ہے حکومت و اقتدار سے محرومی کے باوجود تعلیم بہترین ہتھیار ہے جس کے ذریعہ کسی دین کا تحفظ کیا جاسکتا ہے اسی نقطہ نظر سے جب اس ملک پر انگریزوں کے اقتدار کی گرفت مضبوط ہو گئی تو کچھ بالغ نظر بلند نگاہ اور وقت کے نباض علماء و مشائخ نے تحریک مدارس کی بنیاد رکھی، اس تحریک نے ایک طرف ایسی قبولیت اور پذیرائی حاصل کی کہ اسلامی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی اور مثال مل سکے، دوسری طرف دین کی اشاعت و حفاظت کے مقصد کو حاصل کرنے میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی اس کی مثال بھی کم ہی مل پائے گی، آج بھی برصغیر کے چپہ چپہ میں اس تحریک کے نقوش ثبت ہیں، اگر یہ نہ ہوتے تو گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت اور ان کے دین کو باقی رکھنا دشوار ہو جاتا۔

ان مدارس کی خدمات جہاں ناقابل فراموش ہیں وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنے کو ہم آہنگ کرنے کا جو عمل ہونا چاہئے تھا اصحاب بصیرت علماء کا خیال ہے کہ اس پر توجہ کم کی گئی ہے اور بعض جہتوں سے ہمارے اس نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے، چونکہ یہ مدارس تمام ملی خدمات کا سرچشمہ بنیں اور گویا امت کی شہ رگ ہیں اس لئے اکیڈمی دینی مدارس و جامعات کے نظام تعلیم و تربیت کو بے حد اہمیت دیتی ہے، اکیڈمی کی جانب سے مدارس میں محاضرات اور ورکشاپ کے پروگرام منظم کئے جاتے ہیں، سمیناروں میں نہ صرف مدارس کے اساتذہ بلکہ منتخب طلبہ کو بھی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے بزرگوں کے طریقہ کو اچھی طرح طرح سمجھ سکے بلکہ خاص طور پر دینی مدارس سے مربوط پروگرام بھی رکھے جاتے

ہیں، چنانچہ مدارس میں فقہ کی تعلیم، معاشیات کی تعلیم اور عربی زبان و ادب کی تعلیم و افتاء و قضاء کی تربیت وغیرہ پر مستقل پروگرام رکھے گئے ہیں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ”معاصر دینی تعلیم - مشکلات و احوال“ مسائل اور حل کے عنوان سے ۲۱-۲۲ ستمبر ۲۰۱۱ء کو امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ و جھارکھنڈ کے اشتراک سے ایک سمینار منعقد ہوا جس میں دینی مدارس کے نصاب، طریقہ تعلیم، تعلیمی وسائل، طلبہ کو حل کتاب کے طریقہ تدابیر، اساتذہ کی تربیت، مدارس میں عصری علوم کی شمولیت، عصری درسگاہوں کے ساتھ دینی درسگاہوں کے اسناد کا موازنہ، کتب خانہ وغیرہ مدارس سے مربوط مختلف مسائل پر بڑے اہم مقالات پیش کئے گئے، انہیں مقالات کا مجموعہ اس وقت قارئین کے سامنے ہیں امید ہے کہ یہ مجموعہ دینی مدارس کے لئے رہنما خطوط فراہم کرے گا اور مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کے لئے غذا فراہم ہوگی، نیز مدارس کے کردار کو مزید موثر بنانے کی طرف ارباب مدارس کی توجہ مبذول ہو سکے گی۔ اس مجموعہ کو محبت عزیز مولانا صفدر زبیر ندوی صاحب (رفیق شعبہ علمی) نے محنت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ دینی مدارس کی اندرونی اور بیرونی فتنوں سے حفاظت فرمائے اور اس مجموعہ کو امت کے لئے نفع کا ذریعہ بنائے۔ واللہ هو المستعان۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۲۱ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ

۱۴ فروری ۲۰۱۲ء



## افتتاحی کلمات

### معاصر دینی تعلیم: مشکلات و احوال

☆ پروفیسر اختر الواسع ☆

حضرات اکابر، علماء کرام، دانشوران اور خیر خواہان مدارس دینیہ یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ دینی تعلیم کے معاصر مسائل اور احوال کے اہم ترین اور حساس موضوع پر اپنی فکر و نظر پیش کرنے کے لئے مجھے یہاں مدعو کیا گیا ہے۔ دینی تعلیم سے نسبت ہمارا سرمایہ افتخار ہے، اسی سے ہماری زندگی میں معنویت اور آخرت میں ہماری کامرانی وابستہ ہے، میں اپنی زندگی کے ان لمحات کو اپنا اثاثہ سمجھتا ہوں جن میں مجھے دینی تعلیم کے اکابرین کی ذلہ ربائی کی سعادتیں میسر ہوتی رہتی ہیں۔ شاید میرے اسی تعلق کو اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ داران نے میرے لئے وجہ افتخار بناتے ہوئے آج مجھے آپ سے ہم کلام ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔

حضرات سامعین! اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ سمینار وقت کی ایک اہم ضرورت کی جانب ہم سب کو متوجہ کر رہا ہے۔ اور اس کام کے لئے اکیڈمی ہی سب سے موزوں پلیٹ فارم ہے۔ اکیڈمی نے خالص فقہی مباحث کے ساتھ ساتھ انتہائی سنجیدہ علمی اور فکری موضوعات پر مذاکروں ☆ وائس چیرمین: دہلی اردو اکادمی (حکومت قومی راجدھانی دہلی)، ڈائریکٹر: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، صدر: اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اور سمیناروں کے ذریعہ ملک و بیرون ملک کے اہل علم، اہل دانش اور ارباب نظر کے یہاں جو مقام، وقار اور اعتبار حاصل کیا ہے، اس تناظر میں ہمیں یقین ہے کہ اکیڈمی کی آواز علمی محفلوں میں ضرور گوش شنوا حاصل کرے گی۔

یہ بات مزید خوشی اور اعزاز کی ہے کہ امارت شرعیہ کی سرزمین پھلواری شریف (پٹنہ) میں اس سمینار کا انعقاد عمل میں آ رہا ہے۔ امارت شرعیہ کی خدمات ہندستان میں مابعد اسلامی حکومت مسلمانوں کی ملی و شرعی تاریخ کی پیشانی پر ایک سنہرا حرف ہے، اور اس نے دنیا کے غیر مسلم مخلوط سماج میں مسلمانوں کی دینی زندگی کا ایک نمونہ بھی قائم کیا ہے۔ پھلواری شریف کی سرزمین خانقاہ مجیبیہ کی نسبت سے بھی ایک اہم مقام رکھتی ہے جس نے علم و تقویٰ اور روحانیت کی روشنی سے ان گنت زندگیوں کو روشنی بخشی ہے اس طرح اس سرزمین پر اس سمینار کو کئی جہتوں سے وقار حاصل ہوتی ہے۔

میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ داروں اور امارت شرعیہ کے وابستگان سب کا شکر گزار ہوں کہ مجھے آج یہاں آپ سے معاصر دینی تعلیم کے موضوع پر گفتگو کا موقع مل رہا ہے۔ 1857 کے بعد کی آشوب ناک صورت حال میں علما نے برصغیر ہند میں مدارس کی شکل میں دینی تعلیم کا جو نظام قائم کیا، وہ بلاشبہ اس خطے کے علما کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یہ دیار ہند میں تحفظ دین اور سرمایہ ملت کی نگہبانی کی سب سے اہم اور بنیادی کوشش تھی، جو پوری طرح کامیاب رہی۔ اسلامی حکومت کے اختتام کے بعد اگر بروقت یہ کوشش نہ کی گئی ہوتی تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس خطے میں اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی صورت حال آج کیا ہوتی؟ ملک کی آزادی بعد کے نئے مرحلے میں دینی تعلیم کے نظام کو مزید پھلنے اور پھولنے کا موقع ملا اور ملک کے طول و عرض میں ہزاروں کی تعداد میں مدارس و مکاتب قائم ہوتے چلے گئے۔ اس وقت ہندی مسلمانوں کا کوئی دوسرا سماجی ادارہ مدارس کی طرح وسیع و ہمہ گیر نہیں ہے۔ مدالیں کی خدمات کو

صرف مسلم سماج کی خدمات کے تناظر میں بھی دیکھنا صحیح نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی شرح خواندگی کو بڑھانے اور ملک کو باکروار شہری فراہم کرنے کا کام بھی نہایت اہمیت کے ساتھ مدارس نے انجام دیا ہے۔ یہ کچھ کم اہمیت کی بات نہیں ہے کہ ملک کے پہلے وزیر تعلیم (مولانا ابوالکلام آزاد) بھی بنیادی طور پر مدارس کے نظام تعلیم کا ہی پروردہ تھے۔ یہ اسی نظام تعلیم کا امتیاز ہے کہ اس کے ذریعہ نئی نسل کو کیریئری سازی کے بجائے اخلاق و کردار سازی کی تعلیم دی جاتی ہے اور انفرادیت پسندی کے بجائے ان کے اندر اجتماعیت پسندی اور سماجی مفاد کے لیے قربانی دینے کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے۔ معاصر دینی تعلیم کا یہ نظام ہندوستانی مسلمانوں کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بدلے ہوئے سماجی حالات اور عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں اس نظام میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اس تبدیلی کا مقصد اس نظام تعلیم کی اہمیت کو کم کرنا نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ عہد میں علماء اور فاضلین مدارس کو جو وسیع اور گونا گوں کردار ادا کرنا ہے۔ اس لحاظ سے معاصر دینی تعلیم کا نصاب و نظام بہت کچھ اصلاح کا متقاضی ہے۔ عالم گیریت کے موجودہ عہد میں ایک طرف فاضلین مدارس کو تہذیبی چیلنجوں سے واقف ہونا اور ان چیلنجوں کے جواب کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کرنا ہے، دوسری طرف دنیا کے ایک گاؤں کی شکل اختیار کر لینے کے ساتھ اسلامی دعوت کو عالمی سطح پر انجام دینے کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا ہے۔ تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی پوری ہو سکے کہ ایک وقت وہ آئے گا جب اسلام کا حکم دنیا کے تمام کچے پکے گھروں میں داخل ہو جائے گا (مسند احمد) دینی تعلیم کا معاصر نظام اور ڈھانچہ طلبہ مدارس جیسی شعوری تربیت اور ان کے اندر اس کام کی انجام دہی کی ایسی صلاحیت پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ ضرورت ہے کہ نہایت حکمت و بصیرت کے ساتھ اس تعلیمی نظام کی روح کو جوں کا توں برقرار رکھتے ہوئے اس کے خدو خال میں مناسب تبدیلی لائی جائے۔

حضرات علمائے کرام و اہل دانش! معاصر دینی تعلیم کو اس وقت جو مشکلات اور چیلنجز درپیش ہیں، ان میں میری نظر میں سب سے اہم چیلنج یہی ہے کہ کس طرح موجودہ نصاب کو دور جدید کے دینی، علمی اور تہذیبی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ دوسرا بڑا چیلنج مدارس کے کردار کے حوالے سے دنیا بھر میں مدارس کے خلاف چلائی جانے والی بدنامی کی مہم ہے جس کے تحت مدارس پر انتہا پسندانہ افکار و رجحانات کو فروغ دینے کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔ اس مہم کی ہمہ گیری اور قوت کے زیر اثر اب خود بہت سے مسلمان بھی اس پروپیگنڈے کو حقیقت کی ترجمانی سمجھنے لگے ہیں۔ میں پورے اخلاص کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ جس پیمانے پر، جن وسائل و ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے، یہ شرانگیز مہم چلائی جا رہی ہے، اس کے مقابلے کے لیے ہمارے فضلاء مدارس کی جیسی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے، وہ نہیں ہو پا رہی ہے۔

ہمارے طلبہ و فضلاء مدارس کی اکثریت انگریزی سے واقف نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ بہت بڑی تعداد ایسی ہے، جو آٹھ دس سال مدارس میں عربی پڑھنے کے بعد بھی عربی بولنے پڑھنے پر بھی قادر نہیں ہو پاتی۔ یہ بہت بڑی کمی کی بات ہے۔

اسی طرح یہ بھی بڑی حد تک حقیقت ہے کہ دس سالہ تعلیم کے بعد بھی فاضلین کی بڑی تعداد معاصر دنیا کے مسائل، چیلنجز اور اسلام کے تئیں اشکالات و سوالات سے آگاہ نہیں ہوتی ہے۔ ایسے میں ان سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ موجودہ عہد کے تہذیبی چیلنجوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور دین میں تفقہ کی ذمہ داری ادا کرنے کے ساتھ اس کے پیغام کو دنیا میں عام کرنے میں متوقع رول ادا کر سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کے پورے عرصے میں نصاب میں تبدیلی کے موضوع پر بحث ہوتی رہی ہے خود علما کی صفوں سے اٹھنے والی جن اہم شخصیات نے سب سے زیادہ نصاب کی تبدیلی پر زور دیا، ان میں علامہ شبلی نعمانی سرفہرست ہیں۔ وہ نصاب تعلیم کے نقص کو ہی قوم کے زوال کا



بنیادی سبب گردانتے تھے۔ جیسا کہ مقالات شبلی میں شامل ”ندوہ اور نصاب تعلیم“ کے عنوان سے لکھے گئے اپنے مضمون میں انھوں نے برملا اس بات کا اظہار کیا ہے۔ (مقالات شبلی، ج: ۳، ص: ۱۲۸، ۱۹۵۵) اپنے ایک خطبے میں انھوں نے کہا تھا:

اسلام کے ابتدائی عہد سے لے کر آج تک ہر زمانے میں ضرورت کے موافق مذہبی تعلیم کا نصاب بدلتا آیا ہے۔ آج بھی ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم موجودہ زمانے کی ضرورت کے موافق بدلا جائے اور یہی چیز ہے کہ جس کے نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہندوستان میں سینکڑوں ہزاروں عربی مدرسے موجود ہیں۔ لیکن ان سے قوم کی مذہبی ضرورتیں بالکل رفع نہیں ہوتیں۔

(خطبات شبلی ص: ۶۰، ۱۹۹۵، دارالمصنفین، اعظم گڑھ)

اسی طرح مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بھی کئی موقعوں پر مدارس کے نصاب تعلیم کے تعلق سے اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مدارس کے نصاب میں جو کتابیں اس وقت شامل ہیں، ان میں سے اکثر اس عہد کی ہیں جب کہ ان کے لفظوں میں ”اسلامی علوم کا دماغی تنزل شروع ہو چکا تھا“ (خطبات آزاد ص: ۳۵۴) لیکن اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ جس شخصیت نے سب سے زیادہ غور و خوض کیا اور اپنی فکر اور مطالعے کو ”ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت“ کے نام سے مرتب کیا وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے شاگرد رشید مناظر احسن گیلانیؒ تھے۔ سب سے زیادہ شدت کے ساتھ انھوں نے ہی اس بات کو دہرایا کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں دینی اور دنیاوی تعلیم کے عنوان سے جو حیثیت پیدا ہو گئی ہے۔ اسے دور کر کے مسلمانوں کے عہد زریں کی طرح ایک ہی نظام تعلیم رائج کیا جائے۔ ان کی نظر میں اس کا فائدہ یہ ہوگا:

دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی۔ ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہوگا اور ہر گریجویٹ عالم، ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ہی ملا۔ عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا (ہندوستان کا نظام تعلیم و تربیت، ج: ۲، ص: ۴۰۴)۔

حضرات علما و اہل دانش! ہمارے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ کیا کسی بھی سطح پر ایسی کوشش ہو سکتی ہے کہ جدید و قدیم کی تفریق کو ختم کرتے ہوئے، کیونکہ قصہ جدید و قدیم بلاشبہ دلیل کم نظری ہے، اس واحد نظام تعلیم کو پھر سے متعارف کرانے کی کوشش کی جائے جس کے تحت ایک ہی درس اور درس گاہ سے مجدد الف ثانی، وزیر سلطنت سعد اللہ اور تاج محل کے معمار احمد لاہوری جیسی شخصیات پیدا ہوئی تھیں۔ مولانا علی میاں ندویؒ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ: ”تعلیم کی موجودہ شہوت یعنی دوئی غیر اسلامی اقتدار کی بدعت ہے۔“

(بحوالہ عربی اسلامی مدارس کا نظام تعلیم، خدا بخش لاہوری، پٹنہ، ص: ۱۲)

حضرات! اگر دونوں نظام تعلیم کی یکجائی ممکن نہ ہو تو کم از کم ان دونوں کو قریب تر کرنے کی کوششیں تو کی ہی جاسکتی ہیں۔ ہمیں اس پر غور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

نصاب میں مناسب تبدیلی کے علاوہ اہم مسئلہ طریقہ تعلیم و تدریس کا بھی ہے۔ اس بات کا احساس ہمارے موجودہ اکابرین کو بھی ہے کہ دینی تعلیم کا جو اصل مقصد ہے یعنی تفقہ فی الدین، اس حوالے سے بھی مدارس سے نکلنے والی جدید نسل کی تعلیمی صلاحیت کا معیار قابل اطمینان نہیں ہے۔ یہ بنیادی طور پر ہمارے مدارس کے طریقہ تدریس کی کمزوری کا نتیجہ ہے ورنہ حقیقت میں موجودہ نصاب کا غالب عنصر فقہ کی تعلیم پر مشتمل ہے۔ ایسے میں فضلاء مدارس کا

سب سے مضبوط پہلو یہی ہونا چاہئے۔ ان کے اندر تقفہ اور اجتہاد کی ایسی صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ دین کی روح اس کے مزاج اور شریعت کے اصولوں کی روشنی میں جدید مسائل کا قابل عمل حل پیش کر سکیں۔

معزز حاضرین! معاصر دینی تعلیم کے نظام کے حوالے سے کچھ اور بھی مسائل و مشکلات ہیں جن کا ہمیں حل ڈھونڈنا ہے۔ ایک بڑا مسئلہ مسلکی چپقلش کا ہے جس نے مختلف مکاتب فکر کے مدارس کو ایک دوسرے سے تقریباً بے گانہ سا کر دیا ہے۔ مختلف مدارس میں اب تک طلبہ کو مناظرے کی تربیت دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور مناظرے اور مجادلے کا نہیں بلکہ مکالمے کا ہے۔ مکالمے کے ذریعہ ہی ہم اپنی نظریاتی کشمکش کو دور کر سکتے ہیں اور ہمارے مابین مفاہمت اور ہم آہنگی کی راہیں استوار ہو سکتی ہیں۔ میں پورے اخلاص کے ساتھ اس بات میں یقین رکھتا ہوں کہ قرآن و سنت کی تعلیم مسلکی بحث و مباحثے سے الگ ہٹ کر دی جانی چاہئے۔ میری طرح لوگوں کی بہت بڑی تعداد اسی سوچ کی حامل ہے۔ تمام مسالک کے لوگوں کو ایک باضابطہ معاہداتی اقدام کے تحت مسلکی کشمکش کو ہوا دینے والے لٹریچر کی اشاعت روک دینی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جب تک اپنے داخلی حصار کو مضبوط نہیں کریں گے، ہم خارجی دخل اندازیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

ایک دوسرا اہم مسئلہ فضلاء مدارس کے معاش کا ہے۔ مدارس کے فضلاء کی نئی نسل میں بعض اخلاقی کمزوریوں کی جوشکاہیں مل رہی ہیں۔ ان کی وجہ ان کی معاشی صورتحال ہے۔ مدارس پر لکھنے اور بولنے والوں کا ایک طبقہ اس کے حل کے لیے مدارس میں تکنیکی تعلیم کی تجویز پیش کرتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند جیسے ام المدارس میں دارالصنائع جیسے شعبے کا قیام اسی لیے عمل میں آیا تھا جس کے تحت خطاطی اور جلد سازی جیسے فنون کی تربیت کا نظام آج بھی قائم ہے۔ سوال یہ ہے کہ طلبہ کو معاشی ہنر سکھانے کے اس تصور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا کسی سطح پر صنعت و حرفت کی

تربیت کو مدارس میں رواج دیا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا کیا جاسکے تو یہ مدارس کے حق میں فال نیک ہوگا۔ اسی طرح اس پر بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ طلبہ کی عمومی تعداد کو ضروری دینی تعلیم دینے کے بعد ایک سند دے کر فارغ کر دیا جائے، تاکہ وہ اپنی معاشی ضروریات سے متعلق کسی تعلیم یا ہنر سیکھنے میں مصروف ہو جائیں۔ اور عالم و فاضل کی مخصوص اعلیٰ تعلیم صرف انہی طلبہ کو معیاری انداز سے دیا جائے جو اسی میدان میں خدمت انجام دینے کے لئے شعوری طور پر تیار ہو جائیں۔

حضرات سامعین کرام! یہ معاصر دینی تعلیم کی مشکلات و احوال کے تعلق سے ہماری فکر اور گزارشات کا خلاصہ ہے جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ اگر ہماری کوئی بات کسی کے لیے دینی تکلیف کا باعث ہو تو میں اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔





## تجاویز

### معاصر دینی تعلیم - مشکلات و احوال

معاصر دینی تعلیم - مشکلات و احوال کے موضوع پر دو روزہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے تعاون و اشتراک سے مورخہ ۲۱-۲۲ ستمبر ۲۰۱۱ء مطابق ۲۲-۲۳ شوال ۱۴۳۲ھ المعبد العالی للتدرب فی القضاء والافتاء، پھلواری شریف، پٹنہ کے کنونشن ہال میں منعقد ہوا۔ جس میں مختلف مدارس کے ذمہ داران و اساتذہ نیز دیگر تعلیم گاہوں کے اصحاب علم و فکر نے شرکت فرمائی۔ دینی تعلیم کے مختلف مراحل اور ان کے نصاب و نظام اور جدید حالات اور تقاضوں کے پس منظر میں فضلاء مدارس کے مطلوبہ کردار پر مقالات پڑھے گئے اور مذاکرات ہوئے، شرکاء سمینار نے درج ذیل تجاویز منظور فرمائی:

#### ۱- ابتدائی دینی تعلیم

الف: مسلمان بچے اور بچیوں کو دین کی بنیادی باتوں سے واقف کرانا، ان کے والدین، سرپرستوں اور مسلم سماج کی ذمہ داری ہے۔ بچپن ہی میں ایمان کی جڑوں کو راسخ کرنا، ضروریات دین سے واقف کرنا اور قرآن پاک کی تعلیم سہل ہوتی ہے۔ اسی مقصد سے ہمارے بزرگوں نے گاؤں گاؤں، محلے محلے مکاتب کا نظام قائم کیا۔ یہ سمینار مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہے کہ مکاتب اسلامیہ کے نظام کو مزید مضبوط کریں اور پھیلائیں۔ اس بات کی کوشش کریں کہ ہمارا کوئی گاؤں اور محلہ معیاری مکتب سے خالی

نہ ہو اور ان مکاتب کا تعلیمی و تربیتی نظام بہتر سے بہتر ہو کیونکہ دینی بنیادی تعلیم صحت کے ساتھ قرآن سکھانا عقائد و ایمان کی باتیں بتانا فرض عین ہیں۔

ب- یہ سمینار ائمہ و علماء اور ملت پر اثر رکھنے والے سربراہ آوردہ افراد سے اپیل کرتا ہے کہ یہ حضرات ملت اسلامیہ ہند یہ میں احساس پیدا کریں کہ دینی مکاتب ملت کا عظیم سرمایہ ہیں اور ان کی کوششوں سے ہماری نئی نسل میں دین و ایمان کی آبیاری ہوتی ہے۔ لہذا اپنے بچوں کو ان مکاتب میں تعلیم دیں تاکہ ہمارے بچے دین کی بنیادوں سے واقف ہوں اور ان کے دلوں میں بچپن ہی سے ایمان راسخ ہو سکے۔

ج- یہ سمینار مکاتب اسلامیہ کے ذمہ داروں سے یہ اپیل کرتا ہے کہ اپنے نصاب تعلیم میں دینی مضامین کے علاوہ ان مضامین کو بھی اہمیت کے ساتھ شامل کریں جن کو پڑھے بغیر ہمارے بچے اور بچیاں تعلیم کے اگلے مرحلے میں داخل نہیں ہو سکتے۔

د- یہ سمینار مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے اسکولوں کے ذمہ داروں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اپنے نصاب تعلیم میں مسلمان بچوں کے لئے دینیات کا مضمون لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کریں اور دینیات کے مضمون کو پڑھانے کے لئے باصلاحیت، لائق افراد کو بحال کریں، نیز اپنے اسکولوں میں اچھا تربیتی و اخلاقی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

ه- ہمارے بچوں کی بڑی تعداد ابتداء ہی سے ایسے اسکولوں کا رخ کرتی ہے جن میں نہ صرف یہ کہ دینی تعلیم کا کوئی نظم نہیں ہوتا، بلکہ وہاں بچوں کو مخالف اسلام افکار و نظریات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایسے بچوں کو کلمہ، نماز اور ضروریات دین کی تعلیم دینا ان کے والدین، سرپرستوں اور مسلم سماج کی ذمہ داری ہے۔ ان بچوں کے لئے صباچی یا مسائی مکاتب قائم کئے جائیں اور تعطیلات کے موقع پر ان کے لئے دین کی بنیادی باتوں سے

واقفیت کی خاطر مختصر مدتی تعلیمی و تربیتی پروگرام منعقد کیا جائے۔

## ۲- مدارس کی تعلیم:

الف- برصغیر کے دینی مدارس ملت اسلامیہ کا عظیم ترین سرمایہ ہیں اور برصغیر میں دینی اور ایمانی ماحول پیدا کرنے اور مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کو راسخ کرنے اور ان میں دین و شریعت پر عمل پیرا ہونے کے جذبات بیدار کرنے میں ان مدارس کا بڑا عظیم رول رہا ہے اور آج بھی یہ مدارس مسلمانوں کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ سمینار مسلمانان ہند سے اپیل کرتا ہے کہ ان مدارس کی قدر و قیمت کو پہچانیں، انہیں اپنی اہم ترین بنیادی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے مدارس کے نظام کو وسیع و مستحکم کرنے کی کوشش کریں۔

ب- مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران اور اساتذہ کو بھی اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ مدارس کا پھیلاؤ تو بہت ہو رہا ہے لیکن تعلیم و تربیت کے معیار میں تیزی کے ساتھ انحطاط ہوتا جا رہا ہے۔ یہ چیز مدارس کے اساتذہ و ذمہ داران و ہمدردان کے لئے تشویش اور فکر مندی کی ہے۔ یہ سمینار اپنے عظیم مدارس کے ذمہ داران سے درخواست کرتا ہے کہ وہ خود احتسابی کے جذبہ کے ساتھ انحطاط کے اسباب کا گہرائی سے جائزہ لیں اور ان اسباب کے ازالہ کی تدبیریں کریں اور مدارس کے تعلیم و تربیت کے معیار کو بہتر سے بہتر کرنے کے لئے اقدامات اور فیصلے کریں اور مدارس کی نافعیت کو محسوس کریں۔

مدارس اسلامیہ کے فارغین کو مسلمانوں کی دینی رہنمائی اور فکری قیادت کا کام انجام دینا ہوتا ہے اس لئے ان کا اپنے زمانہ کے حالات، سماج کے مسائل و مشکلات، قوم کی

ضروریات و نفسیات سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے بزرگوں نے ہر دور میں مدارس کے نصاب و نظام میں تبدیلیاں کی ہیں۔ ایسی تبدیلیاں جو مدارس کی روح اور مقصد کو متاثر نہ کرے بلکہ ان کو قوت پہنچائیں اور علماء کو کارگاہ حیات میں رہنمائی کے قابل بنائیں، اس لئے یہ سمینار ذمہ داران مدارس اور اکابر علماء سے درخواست کرتا ہے کہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے مدارس کے نصاب و نظام کا جائزہ لیتے رہیں اور جن عصری مضامین کا تعلیم کے جس مرحلے میں اضافہ کرنا مناسب ہو ان کا اضافہ کریں اور ان عصری مضامین پر نصابی نقطہ نظر سے مختصر کتابیں تیار کریں جن کا نصاب میں شامل کرنا ممکن ہو۔

یہ واقعہ ہے کہ مدارس کے مادی وسائل بہت محدود ہیں اور مسلمانوں کے جذبہ خیر کی بنیاد پر یہ ادارے تعلیم و تربیت کا نظم چلا رہے ہیں اور مدارس کے اساتذہ و کارکنان انتہائی قلیل تنخواہوں پر قناعت اور اخلاص کے ساتھ اپنی تدریسی و تربیتی ذمہ داریوں کو انجام دے رہے ہیں۔ اس کے باوجود یہ سمینار مدارس کے ذمہ داران کو اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ مدارس کے ذمہ داران مدارس کے اساتذہ و کارکنان کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافہ کی طرف توجہ فرمائیں اور دستیاب مادی وسائل کو اراضی و تعمیرات سے زیادہ اساتذہ و طلبہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں صرف کریں۔

### ۳- اساتذہ کی تربیت:

الف- مدارس کے معیار تعلیم و تربیت کو بلند کرنے کے لئے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ جو باصلاحیت فضلاء مدارس درس و تدرس کو اپنا میدان عمل بنانا چاہتے ہیں ان کے لئے ایک سالہ یا ششماہی ٹریننگ کورس رکھا جائے اور انہیں فضلاء کو مدارس میں تدریس کا



موقع دیا جائے جو مذکورہ بالا تربیتی کورس مکمل کر چکے ہوں۔ اس مقصد کے لئے یہ سمینار مرکزی دینی مدارس (دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء، مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ) کے ذمہ داروں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے یہاں اس طرح کا تربیتی کورس جاری کریں اور اس میں انہیں فضلاء کو داخل کیا جائے جن کی بنیادی صلاحیت مضبوط ہو اور اخلاق و کردار بہتر ہو، تاکہ مدارس اسلامیہ کو بہتر اساتذہ مہیا ہو سکیں۔

ب۔ اساتذہ کی ٹریننگ کے لئے تربیتی کورس کا انتظام ہونے سے پہلے عبوری طور پر ایسا کیا جانا مفید ہے کہ ہفتہ دو ہفتہ کا تربیتی پروگرام ترتیب دے کر تجربہ کار اساتذہ اور ماہرین تعلیم کے محاضرات دلوائے جائیں اور ان میں نوجوان فضلاء اور نوجوان اساتذہ کو شریک کیا جائے۔

ج۔ یہ سمینار مدارس کے ذمہ داروں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کے لئے سال دو سال میں مختلف علوم پر مختصر مدتی (ہفتہ دس دن کا) تربیتی پروگرام منعقد کریں جس میں ان علوم کے ماہرین اپنے محاضرات پیش کر سکیں۔ اساتذہ کے ساتھ مذاکرات کر سکیں، تاکہ اساتذہ کو اپنے موضوع کے بارے میں زیادہ واقفیت حاصل ہو سکے اور وہ اپنے علم و فن سے متعلق نئی تحقیقات سے واقف ہو سکیں۔

#### ۴۔ تخصصات کے کورسز:

ذہن اور باصلاحیت فارغین مدارس کو مختلف میدانوں میں تیار کرنے کے لئے تخصصات کے کورسز انتہائی ضروری ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ مختلف بڑے دینی مدارس میں تخصصات کے مختلف کورس جاری ہیں اور تخصصات کے لئے چند مستقل ادارے بھی قائم ہیں۔ لیکن ابھی اس کام کو مزید مربوط و منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا سے درخواست



کرتا ہے کہ وہ بڑے مدارس (جہاں تخصصات کے کورسز جاری ہیں) سے رابطہ کر کے مختلف علوم میں تخصصات کے کورسز کا جائزہ لے۔ اور ان کا نصاب تیار کرنے کی کوشش کرے۔ نیز جن میدانوں میں تخصصات کی ضرورت ہے اور ان میں اس طرح کا کورس جاری نہیں ہے ان کی نشاندہی کریں اور ان کا خاکہ تیار کر کے ماہرین کی مدد اور مشوروں سے انہیں حتمی شکل دے۔



پہلا باب  
مدارس کا نصاب تعلیم



## ہندوستان کے دینی مدارس میں فقہ و اصول فقہ کا نصاب درس - جائزہ اور تجویزیں

مولانا عتیق احمد قاسمی ☆

### دینی مدارس کا پس منظر

ہندوستان میں مروجہ دینی مدارس کے قیام کا ایک خاص پس منظر ہے، اسے سامنے رکھے بغیر ان مدارس کا بنیادی مقصد متعین کرنا اور ان کے نصاب اور نظام کا دیانتدارانہ تجزیہ ممکن نہیں ہے، ہندوستان میں جب مسلم حکومتیں قائم تھیں نیز ان حکومتوں کے زیر سایہ مختلف وزراء، امراء، نوابوں اور جاگیرداروں کی سرپرستی میں اسلامی علوم کی درسگاہیں قائم تھیں، یہ درسگاہیں مروجہ درسگاہوں سے کافی مختلف تھیں، جہاں بھی کوئی تبحر، متدین اور باکمال صاحب درس عالم افادہ اور فیض رسانی کیلئے بیٹھ گیا وہاں ایک درسگاہ قائم ہو گئی، اس کی علمی حیثیت اور شہرت کے اعتبار سے دور و نزدیک سے طالبان علوم دینیہ کھینچ کھینچ کر جمع ہو جاتے، اور اپنے حوصلہ اور ظرف کے بقدر علوم دینیہ کے ہیرے جواہر سے اپنے دامن بھر لیتے، حلقہ درس میں شمولیت کی اجازت استاد کی مرضی پر موقوف ہوتی، اگر وہ خواہش مند طالب علم کی صلاحیت و صلاح، جذبہ طلب اور اخلاص و نیت کے بارے میں مطمئن ہوتا تو اسے اپنے حلقہ درس میں شامل کر لیتا۔ تعلیم کا نظام کیا ہوگا، کیا کتابیں پڑھائی جائیں گی، روزانہ کتنے اسباق ہوں گے، کون شاگرد کس کس درس میں

☆ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

شریک ہوگا، یہ تمام امور استاذ کے اختیار میں تھے۔ ان درسگاہوں میں تعلیم کے دو ہی ارکان تھے: یعنی استاد اور شاگرد، انتظامیہ کے نام سے کوئی تیسرا عنصر نہیں تھا جو اس تعلیم میں دخل ہو بلکہ امور تعلیم میں بنیادی عامل کا کام کرے جیسا کہ آج کل ہے۔

ان قدیم درسگاہوں میں کہیں تو طلباء کے اخراجات کا تکفل درسگاہ کی طرف سے ہوتا تھا، یہ صورت حال وہاں ہوتی تھی جہاں حکومت یا کسی امیر و وزیر نے درسگاہ میں داخل ہونے والے طلباء کے اخراجات کا تکفل اپنے ذمہ لے لیا ہوتا، یا اس درسگاہ پر بڑی بڑی جائدادیں اور آراضی وقف ہوتیں، ان اوقاف کی آمدنیوں سے وہاں زیر تعلیم طلباء کے وظائف دیئے جاتے تھے، لیکن اکثر درسگاہوں میں طلبہ کے اخراجات کا بار درسگاہ کے ذمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ طلبہ خود اپنے اخراجات کے ذمہ دار ہوتے تھے، وہ جہاں سے بھی اسکا نظم کریں، اپنے گھر سے لائیں یا کسی مقامی صاحب خیر کو کفالت پر آمادہ کر لیں، یا کسی مسجد وغیرہ میں امامت یا مؤذنی کا فریضہ انجام دے کر اپنے قیام و طعام کا انتظام کریں، طلباء کے اخراجات کا باقاعدہ نظم نہ ہونے کی وجہ سے طالبان علوم دینیہ کی ایک بڑی تعداد وہ تھی جن کے مصارف کا کوئی مستقل بندوبست نہیں تھا، علوم دینیہ کے شوق و طلب کا ان پر اتنا غلبہ تھا کہ انتہائی بے سروسامانی اور فاقہ مستی کی حالت میں اپنی تعلیم کے ایام پورے کرتے، کتنے ایسے تھے جنہیں روزانہ ایک وقت بھی آسودگی کے ساتھ کھانا میسر نہیں آتا تھا، ہماری علمی تاریخ میں ایسے طالبان علوم نبوت کے نام بہت کثرت سے ملتے ہیں جنہوں نے ہر طرح کی تنگ دستی اور شدید ناموافق حالات کے باوجود اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور تعلیم کی تکمیل کے بعد آسمان علم و تحقیق کے چاند تارے بن کر چمکے۔

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایسے باعزیمت اور صاحب کمال مدرسین و علماء بھی بکثرت ملتے ہیں جنہوں نے تعلیم دین کا اہم اور پاکیزہ فرض انجام دیتے ہوئے کسی طرح کی مادی منفعت اٹھانا اپنے لئے حرام سمجھا، مسلم حکومتوں اور وزراء و امراء کی مالی اعانت کی پیش کش کو



پوری شان بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیا، انھوں نے یہ بات گوارہ نہیں کی کہ اس اہم دینی فریضہ کی ادائیگی پر کسی سے کوئی معاوضہ قبول کریں، ہندوستان کا یہ قدیم نظام تعلیم جسے ہم انفرادی نظام تعلیم کا نام بھی دے سکتے ہیں اس میں طالبان علوم دینیہ کیلئے کچھ پریشانیاں ضرور تھیں، لیکن ان پریشانیوں کا یہ ثمرہ تھا کہ اس راہ میں وہی لوگ قدم رکھتے تھے جن کے اندر علم کی سچی طلب اور مشکلات کو جھیلنے کا حوصلہ ہوتا تھا، جن کا ذوق طلب ناقص یا ہمت کوتاہ ہوتی تھی وہ لوگ دو قدم چلنے کے بعد ہی الٹے پاؤں لوٹ جاتے تھے، موجودہ دور میں وسائل کی فراوانی کی وجہ سے غیر حقیقی طلبہ علم کی کثرت نے ہمارے مدارس کیلئے جو سنگین خطرات پیدا کر دیئے ہیں اس سے یہ قدیم درسگاہیں محفوظ تھیں، ہماری ان قدیم درسگاہوں میں طلبہ کا یہ ہجوم تو نہیں ہوتا تھا لیکن جتنے طلبہ بھی ہوتے تھے ان کا دل دماغ اخلاص نیت اور طلب صادق سے معمور ہوتا تھا وہ لوگ تن آسانی کے بغیر ہر طرح کی مشکلات اور مخالف حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے تھے، طالب علمی کے ایام میں چونکہ وہ ہر طرح کے تنگ و ترش حالات سے گزر چکے ہوتے تھے اس لئے آئندہ پیش آنے والے حوصلہ شکن اور روح فرسا حالات میں ان کے پائے استقامت ڈگمگاتے نہیں تھے اور زندگی کے ہر امتحان میں کامیابی سے گزر جاتے تھے۔

### ہندوستان میں فقہ کی تعلیم

ہندوستان میں سیکڑوں سال تک مسلم حکومتیں قائم رہیں، ان حکومتوں کے زیر سایہ اسلام کا عدالتی نظام پورے ہندوستان میں کھلی یا جزیی طور پر نافذ رہا، حکومت کا عدالتی نظام چلانے کے لئے فقہ اسلامی خصوصاً فقہ حنفی پر دسترس رکھنے والے علماء کی ضرورت تھی، مسلم دور حکومت میں عوام کی دینی رہنمائی اور روزمرہ کے مسائل و مشکلات میں شرعی احکام بتانے کیلئے مفتیان کرام کا تقرر بھی ہوتا تھا، مسلم حکومتوں کے دور میں قاضی اور مفتی کا منصب بڑا معزز اور اہم منصب تھا، حکومت کی جانب سے ان حضرات کو معقول مشاہرے ملتے تھے، قاضیوں کی عدالت میں عام

شہریوں کے علاوہ امراء و وزراء اور سلاطین تک کے مقدمات آتے تھے، اور قاضی شریعت کا فیصلہ ہر ایک پر نافذ ہوتا تھا، ان اسباب کی بنا پر دینی علوم حاصل کرنے والے طلباء کی توجہ فقہ و اصول فقہ پر زیادہ ہوتی تھی، ہندوستان کے مسلم سلاطین کے دور میں فقہ اسلامی میں درک رکھنے والے علماء اور اصحاب افتاء کی جو غیر معمولی پذیرائی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ بلاد اسلامیہ سے کھینچ کھینچ کر ممتاز ترین فقہاء اور اصحاب افتاء ہندوستان کی سرزمین پر جمع ہو گئے، ان کی آمد سے جہاں ہندوستان کا علمی وقار بڑھا وہیں فقہ کے درس و تدریس کا معیار بھی اونچا ہوا، عالم اسلام پر تاتاریوں کی یلغار اور لرزہ خیز مظالم نے بہت سے یگانہ روزگار ممتاز ترین فقہاء کو مجبور کیا کہ وہ ماوراء النہر، خراسان اور دوسرے بلاد اسلامیہ سے ترک وطن کر کے ہندوستان کی طرف ہجرت کریں، کیونکہ خوش قسمتی سے ہندوستان تاتاریوں کی ترک تازیوں سے محفوظ رہا اور ہندوستان کے مسلم حکمران باہر سے آنے والے علماء و فقہاء کا پوری گرم جوشی سے استقبال کرتے رہے، ان کی خدمت میں اونچے اونچے منصب اور جاگیر پیش کرتے رہے۔

ان مختلف اسباب کی بنا پر ہندوستان میں فقہ اسلامی خصوصاً فقہ حنفی کو بہت فروغ حاصل ہوا، ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں میں سب سے زیادہ زور فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم پر رہا کیونکہ فقہ میں کمال پیدا کرنے کے بعد معاش کا باعزت راستہ کھلا ہوا تھا، عدالتی نظام چلانے کے لئے حکومت کو بڑی تعداد میں ماہرین فقہ و فتاویٰ درکار تھے، فوراً ہی قاضی کا منصب مل جاتا تھا، تاریخ ہند کے بیشتر ادوار میں فقہ و اصول فقہ کی تحصیل معیار فضیلت سمجھی جاتی تھی۔

نزہۃ الخواطر کے مصنف مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ”ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات“ میں بہت اختصار اور جامعیت کے ساتھ ہندوستان کے قدیم نظام درس اور نصاب میں آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیا ہے، انھوں نے ہندوستان کے قدیم نصاب درس کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے، ان کی تقسیم کے مطابق دور اول کا

آغاز ساتویں صدی ہجری سے ہوتا ہے، اور دسویں صدی ہجری پر یہ دور ختم ہو جاتا ہے، نصاب درس کے اس دور میں مولانا مرحوم کی تحقیق کے مطابق فقہ میں ہدایہ اور اصول فقہ میں منار، اس کی شروح اور اصول بزدوی کی تدریس کا رواج تھا، دور اول کے تحت مولانا مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

”اس طبقہ کے علماء کرام تلاش کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا ہمارے زمانہ میں منطق

و فلسفہ معیار فضیلت ہے، ویسا ہی اس زمانہ میں فقہ اور اصول فقہ معیار فضیلت تھا“ (ص ۱۰)۔

مولانا عبدالحی صاحب کی تحقیق کے مطابق دور دوم میں فقہ کے نصاب میں شرح وقایہ کا اضافہ ہوا، اور دور سوم میں اصول فقہ کے نصاب میں حسامی اور توضیح و تلویح کا کچھ حصہ شامل ہوا۔ دور چہارم کا آغاز ملا نظام الدین سے ہوا، ان کے پرزور ہاتھوں سے درس نظامی کی بنیاد رکھی گئی جو کچھ جزوی تغیرات کے ساتھ اب بھی جاری ہے، ملا نظام الدین کے نصاب درس میں فقہ میں شرح وقایہ، ہدایہ اولین و ہدایہ آخرین اور اصول فقہ میں نور الانوار، توضیح و تلویح، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ) شامل تھیں۔

حضرت مولانا عبدالحی صاحب درس نظامی کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں امعان نظر اور قوت مطالعہ کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ طلبہ میں (بشرطیکہ تحقیق کے ساتھ پڑھا ہو) قوت مطالعہ، وقت نظر، احتمال آفرینی اور قوت قریبہ بیدار ہو جاتی ہے، کسی فن میں طالب علم کو بالفعل کمال حاصل نہیں ہوتا مگر وہ اپنے شوق اور جانفشانی سے جس علم میں چاہے کمال پیدا کر سکتا ہے، میں نے تحقیق کے ساتھ پڑھنے کی قید اس واسطے لگائی ہے کہ اب طریقہ تعلیم بگڑ گیا ہے، ملا نظام الدین کا طریقہ درس یہ تھا کہ وہ کتابی خصوصیتوں کا چنداں لحاظ نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب کو ایک ذریعہ قرار دے کر اصل فن کی تعلیم دیتے تھے، اسی طرز تعلیم نے ملا کمال الدین، بحر العلوم، حمد اللہ جیسے اہل کمال پیدا کئے تھے“ (ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات، ص: ۱۸)۔

## فقہ و اصول فقہ کا موجودہ نصاب درس

اس وقت ہندوستان کے دینی مدارس میں فقہ اور اصول فقہ کی جو کتابیں شامل درس ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔ جن دینی مدارس میں فارسی زبان شامل نصاب ہے اور عربی نحو و صرف کی ابتدائی کتابیں فارسی زبان میں ہیں، ان میں ابتدائی مرحلہ میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی مالا بدمنہ پڑھائی جاتی ہے، اس کے بعد فقہ کی درج ذیل کتابیں بالترتیب فراغت تک پڑھائی جاتی ہیں۔

(۱) نور الایضاح، (۲) قدوری، (۳) کنز الدقائق، (۴) شرح وقایہ، (۵) ہدایہ کامل، (۶) سراجی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ان سے ملحق مدارس میں نور الایضاح کی جگہ ”الفقہ المیسر“ شامل درس کی گئی ہے، کنز الدقائق بہت سے نظامی اور غیر نظامی مدارس میں نصاب درس سے خارج کی جا چکی ہے، اور اس کی جگہ کوئی دوسری کتاب شامل نہیں کی گئی ہے، قدوری کہیں تو مکمل شامل نصاب ہے (خواہ پوری کتاب کی تعلیم مکمل نہ ہو سکے) اور کہیں عبادات کے ابواب حذف کر کے باقی کتاب شامل نصاب ہے، کچھ مدارس مزید اختصار و انتخاب سے کام لیتے ہوئے ان ابواب کو بھی نصاب سے خارج کر دیا ہے جن کی ضرورت عملی زندگی میں عموماً پیش نہیں آتی، مثلاً کتاب العتق وغیرہ، شرح وقایہ کی دونوں ابتدائی جلدیں بعض مدارس کے نصاب میں شامل ہیں اور بعض مدارس میں صرف جلد اول پر اکتفا کیا گیا ہے، ہدایہ اولین تقریباً تمام ہی مدارس میں شامل نصاب ہے، لیکن ہدایہ آخرین بہت سے مدارس کے نصاب میں شامل نہیں ہے، بعض مدارس میں ہدایہ آخرین کو یا اس کے منتخب ابواب کو عالمیت کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد فضیلت کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے، جامعہ سید احمد شہید کٹولی میں ہدایہ سے پہلے علامہ علاء الدین سمرقندی کی کتاب تحفۃ الفقہاء کو شامل نصاب کیا گیا ہے اور اس کو چند سالوں پر تقسیم کیا گیا ہے، یہ



کتاب اپنے انداز اور اسلوب کے اعتبار سے بہت سہل ہے اور فقہ حنفی کی اہم کتابوں میں ہے، امید ہے کہ اس کا تدریسی تجربہ کامیاب ہوگا، فرائض کی مشہور کتاب سراجی تقریباً تمام مدارس میں شامل نصاب ہے، باب المناسخہ کے ختم تک اس کا درس ہوتا ہے، بعض مدارس میں مشہور فلسفی و فقیہ امام ابن رشد کی کتاب بذایۃ المجتہد کا کچھ حصہ شامل نصاب ہے۔

اصول فقہ کا نصاب درس تمام ہی مدارس میں بہت مختصر ہے، عام طور سے مدارس میں طلباء کو اصول فقہ کی دو ہی کتابیں پڑھنے کو ملتی ہیں: (۱) اصول الشاشی (۲) نور الانوار، اصول الشاشی تو عام طور سے مکمل شامل نصاب ہے لیکن تدریسی شغف و انہماک میں کمی کی وجہ سے اب یہ مختصر کتاب بھی سال کے آخر تک عموماً مکمل نہیں ہو پاتی، نور الانوار تو مکمل شامل نصاب ہی نہیں، اکثر مدارس میں صرف کتاب اللہ کے مباحث شامل نصاب ہیں، اس مختصر ترین نصاب کی وجہ سے طالب علم اصول فقہ کے مسائل میں گورارہ جاتا ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس سے ملحق مدارس میں نور الانوار کی جگہ عبدالوہاب خلاف کی کتاب علم اصول الفقہ شامل نصاب ہے، بعض مدارس کے نصاب میں حسامی کا کچھ حصہ بھی شامل درس ہے، کچھ بڑے مدارس نے فراغت کے بعد تربیت افتاء کا ایک سالہ کورس جاری کر رکھا ہے، اس ایک سالہ نصاب میں فقہ کی عموماً درج ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) الاشبہ والنظائر فن اول (قواعد فقہیہ والا حصہ) (۲) شرح عقود رسم المفتی (۳) در مختار کا مقدمہ اور بعض ابواب (۴) سراجی مکمل مشقوں کے ساتھ۔

بعض مدارس اور اداروں نے فضلاء مدارس کے لئے تخصص فی الفقہ کا دو سالہ نصاب جاری کیا ہے، اس نصاب میں کچھ مضامین اور کتابیں زیادہ ہیں، دو سالہ نصاب بنانے میں اس بات کا بھی دخل ہے کہ فضلاء مدارس کا علمی معیار گرتا جا رہا ہے، جن کتابوں اور مضامین کو وہ پڑھ چکے ہوتے ہیں ان میں بھی وہ کمزور ہوتے ہیں۔



## حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کا بصیرت افروز تجربہ

پاکستان کے مشہور محدث اور عالم دین اور علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے ”عربی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم“ کے موضوع پر ایک بڑا اہم اور فکر انگیز مضمون تحریر فرمایا تھا جو ۷۵-۱۹۷۴ء میں ہندو پاک کے مختلف جرائد میں بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ پھر دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند نے حضرت مولانا حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کے تائیدی نوٹ کے ساتھ اسے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا، اس مضمون میں مدارس اسلامیہ کے نصاب و نظام کے بارے میں بڑے قیمتی مشورے اور تجویزیں شامل ہیں، یہ مشورے اور تجویزیں کسی ”اجنبی اور دخیل“ کی طرف سے نہیں ہیں، بلکہ اپنے ہی گھر کی ایک ایسی بلند قامت شخصیت کی طرف سے ہیں جس کی زندگی درس و تدریس ہی میں گزری، اور جس کا مقام بلند مدارس کے حلقوں میں بھی تسلیم شدہ ہے، مولانا نصابی کتابوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مدارس دینیہ عربیہ میں اس وقت جو نصاب تعلیم رائج ہے حدیث و فقہ کی چند کتابوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد زیادہ تر ساتویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے قرون کی یادگار ہے، جہاں سے صحیح معنی میں علمی انحطاط کا دور شروع ہو چکا تھا، قدامت کی وہ تالیفات جن میں علم کی روح موجود تھی، عبارت سلیس و شگفتہ، مسائل و قواعد واضح، جن میں نہ عبارتی تعقیدات تھیں، نہ دور از کار ابحاث، جن کے پڑھنے سے صحیح معنی میں دل و دماغ متاثر ہو سکتے تھے، نہ وقت ضائع ہوتا تھا، نہ دماغ پر بوجھ کا خطرہ ہوتا تھا، ان کی جگہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں، جن میں سب سے زیادہ کمال اختصار نویسی کو سمجھا گیا، زیادہ زور لفظی بحثوں پر دیا گیا، لفظی موشگافیاں شروع ہوئیں، اگر یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کاغذ تو کم خرچ کیا گیا لیکن وقت و دماغ کو اس کے حل پر زیادہ صرف کیا گیا، بڑا کمال یہی سمجھا گیا کہ عبارت ایسی دقیق و غامض ہو جس کے لئے شرح و حاشیہ کی ضرورت ہو، کئی کئی تو جہات کے بغیر حل نہ ہو، آخر یہ علمی عیاشی نہیں تو اور کیا ہے، میرے ناقص

خیال میں یہ علم کا سب سے بڑا فتنہ تھا جس سے علوم اور اسلامی معارف کو بڑا نقصان پہونچا۔ بطور مثال اسلامی علوم میں اصول فقہ کو لیجئے جو علوم دین اور علوم اجتہاد میں ایک لطیف ترین فن ہے جو قرآن و سنت سے نئے نئے استنباطات کے لئے سب سے اہم راستہ تھا، جس کی باقاعدہ تدوین کا فخر دولت عباسیہ کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ کو حاصل ہے، اور امت میں اس کے بعد سب سے پہلی کتاب امام محمد ابن اور لیس الشافعی کی کتاب ”الرسالہ“ ہے جو عرصہ ہوا کہ مصر میں ”کتاب الام“ کے ساتھ چھپ چکی تھی اور اب کچھ عرصہ ہوا بہت آب و تاب سے دوبارہ قاہرہ سے شائع ہوئی ہے، اسی فن میں امام ابو بکر رازی بھاص (متوفی ۷۲۰ھ) نے کتاب ”الفصول فی الاصول“ لکھی جس کا ایک عمدہ نسخہ دارالکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے اور جس کی نقل راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی ڈابھیل حال کراچی کے لئے ہندوستان و پاکستان آئی، امام فخر الاسلام بزدوی نے ”کتاب الاصول“ لکھی جس کی عمدہ ترین شرح عبدالعزیز بخاری کی ہے، جو ترکی کے سابق دارالخلافہ سے دو دفعہ شائع ہوئی اور جس کی محیر العقول عظیم ترین شرح امیر کاتب عماد الدین اتقانی کی ”الشامل“ دس جلدوں میں دارالکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے، اور اس کا ایک نسخہ استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں ہے، لیکن افسوس کہ دونوں جگہ ابتدائی دو ڈھائی جزء کا نقص ہے، اس کی نقل بھی راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی میں آچکی ہے، امام شمس الائمہ سرخسی نے ”کتاب الاصول“ لکھی جس کے نسخے ترکی و مصر میں موجود ہیں، یہ اور اس کے علاوہ اس فن میں متقدمین کی عمدہ اور نافع کتابیں ہیں، اس کے علاوہ اس فن میں امام ابو زید دہوسی کی کتاب ”تقویم الادلہ“ بے نظیر ہے۔

اب خیال فرمائیے کہ ایسی نادرہ روزگار کتابوں کی جگہ ابن ہمام کی ”تحریر الاصول“ اور ابن حاجب کی ”مختصر الاصول“ اور بیضاوی کی ”منہاج الاصول“ یا ابوالبرکات نسفی کی ”منار الاصول“ یا صدر الشریعہ کی ”تنقیح الاصول“ نے لے لی۔ اگر ”تحریر الاصول“ کی شرح ”التقریر والتجہیر“ ابن امیر الحاج کی نہ ہو اور قاضی بیضاوی کی منہاج کی شرح الاسنوی کی نہ ہو تو یہ

چستانیں امت کے کیا کام آسکتی ہیں؟ یہ مانا کہ ان میں کچھ دقیق و لطیف ان کے مختارات یا خصوصی ابحاث بھی ہیں لیکن دوسری طرف مہمات جس تعبیر میں ادا ہوتی ہیں وہ کوئی علمی روح بیدار کرنے کیلئے مفید نہیں ہو سکتیں“ (مدارس عربیہ کا نصاب و نظام تعلیم، ص ۱۲ تا ۹)۔

حضرت مولانا بنوریؒ نے اصول فقہ کی جن اہم ترین کتابوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے اکثر اس وقت غیر مطبوعہ تھیں لیکن الحمد للہ اب وہ سب کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان سے استفادہ کرنے اور انہیں درسی حلقوں میں رائج کرنے کی ضرورت ہے۔

### چند مشورے

مدارس عربیہ میں رائج فقہی نصاب درس کے جائزہ کے بعد اس کے تعلق سے چند تجاویز اور مشورے اس امید کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں کہ مدارس عربیہ کے ذمہ دار علماء اور ماہرین تعلیم ان پر غور کریں گے، اور ان کے مفید اجزاء کو قبول کر لیں گے۔

۱۔ فقہی نصاب درس کا اس طرح ترتیب دیا جانا از حد ضروری ہے کہ فراغت سے پہلے تمام ابواب فقہیہ کم از کم ایک بار طالب علم کی نگاہ سے گزر جائیں، اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ فقہ کی ایک جامع کتاب جس میں فقہ کے تمام ابواب شامل ہوں، مثلاً قدوری، اسے کامل طور پر شامل نصاب کیا جائے، خواہ اس کی تعلیم ایک سال کے بجائے دو سال میں ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ نصاب میں شامل کی جانے والی مختلف کتابوں کی جلدوں اور ابواب کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ فقہ کا کوئی اہم باب چھوٹے نہ پائے حتیٰ کہ وہ ابواب جن کی موجودہ حالات میں بظاہر ضرورت نہیں ہے، مثلاً کتاب العتق وغیرہ، ان ابواب کے مسائل کا بھی کم از کم ایک بار طالب علم کی نظر سے گزرنا ضروری ہے، کیوں کہ ان ابواب کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینے کی صورت میں ان سے تعلق رکھنے والی آیات اور احادیث طلباء کے لئے معمر بن جاتی ہیں، اور ان ابواب فقہیہ نیز ان سے متعلق آیات و احادیث میں جو اصولی ہدایات اور تعلیمات پنہاں ہیں ان سے طالب علم



محروم رہ جاتا ہے، خلاصہ یہ ہیکہ نصاب فقہ کا اس طرح ترتیب دیا جانا ضروری ہے کہ عالمیت کا مرحلہ عبور کرنے سے پہلے کم از کم ایک بار طالب علم کی نگاہ تمام ابواب فقہیہ پر ہو جائے۔

۲- طالب علم کے سامنے مسائل کے تکرار و اعادہ سے یہ فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ وہ مسائل طالب علم کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں، لیکن تکرار و اعادہ کا یہ عمل اس طرح نہیں ہونا چاہئے کہ بعض ابواب فقہیہ کے مسائل تو بار بار پڑھائے جائیں اور بعض ابواب فقہیہ سے طالب علم بالکل گورارہ جائے، مختلف مدارس عربیہ کے نصاب کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آئی کہ بہت سے مدارس میں نصاب کی ترتیب اس انداز سے ہے کہ عبادات کے مسائل تو طالب علم کے سامنے بار بار آتے ہیں، احوال شخصیہ، نکاح و طلاق وغیرہ کے مسائل صرف ایک بار پڑھائے جاتے ہیں اور معاملات (خرید و فروخت وغیرہ) کے ابواب ایک بار بھی طالب علم کی نگاہ سے نہیں گزرتے، مثلاً بعض مدارس میں فقہ کا نصاب اس طرح ہے کہ ابتداءً ”ملا بدمنہ“ کا درس ہوتا ہے، اور اس میں بھی عبادات کے حصے پر اکتفا کیا جاتا ہے، اس کے بعد ”نور الایضاح“ کی تعلیم ہوتی ہے، اس کے ساتھ ”قدوری“ کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے، ”قدوری“ کے بعد ”کنز الدقائق“ کے ابواب عبادات شامل نصاب ہیں، کنز الدقائق کے بعد شرح وقایہ جلد اول کی تعلیم ہوتی ہے، شرح وقایہ جلد اول کے بعد ہدایہ جلد اول اور ہدایہ جلد ثانی کے کچھ ابواب شامل نصاب ہیں، ظاہر ہے کہ جن طلباء نے فقہ کا یہ نصاب پڑھا ان کے سامنے عبادات کے مسائل تو پانچ بار آئے اور احوال شخصیہ (نکاح و طلاق وغیرہ) کے مسائل صرف ایک بار آئے وہ بھی کچھ ہی مسائل، معاملات کے مسائل ان کے سامنے ایک بار بھی نہیں آئے، اس طرح کا نصاب درس پڑھنے والے فضلاء تعلیم کی تکمیل کے بعد بھی فقہ کے اکثر ابواب سے نا آشنا رہ جاتے ہیں، زندگی کے روزمرہ کے مسائل کے بارے میں وہ امت کی رہنمائی کس طرح کر سکتے ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ جن مدارس کے نصاب تعلیم میں اس طرح کا عدم توازن ہو، اسے درست کیا جانا چاہئے، عبادات کے مسائل کا پانچ پانچ بار اعادہ

ضروری نہیں ہے، اگر کنز الدقائق اور شرح وقایہ کو نصاب سے خارج کر کے نور الایضاح کے بعد قدوری کی مکمل تعلیم دی جائے اور قدوری کے بعد ہدایہ کی ابتدائی دو جلدیں اور ہدایہ آخرین کے منتخب ابواب طالب علم کو پڑھا دیئے جائیں تو زیادہ مفید رہے گا۔

۳- تمام ہی مدارس کا اصول فقہ کا نصاب بہت ہی ادھورا ہے، اصول فقہ ہی کی اچھی تعلیم اور تمرین کے ذریعہ طلباء کا فقہی ذوق پروان چڑھ سکتا ہے، ان میں فقیہانہ ژرف نگاہی اور قوت استنباط پیدا ہو سکتی ہے، ہمارے فقہاء مجتہدین نے ان ہی اصولوں کا استعمال کر کے فقہ کا عظیم الشان ذخیرہ تیار کیا، اپنے دور کے مسائل حل کئے، دور حاضر میں پیش آنے والے ہزاروں نئے مسائل کا صحیح شرعی حل اسی وقت تلاش کیا جاسکتا ہے جب کہ فقہاء مجتہدین کے اصول اجتہاد و استنباط (جو اصولی فقہ کی صورت میں مدوٹ ہو چکے ہیں) کو بروئے کار لا کر ان کا حل تلاش کیا جائے، اس وقت مدارس عربیہ میں اصول فقہ کی تعلیم عموماً اس نقطہ نظر سے ہوتی ہی نہیں کہ ہمیں ان اصولوں کو برتنا ہے اور ان کے ذریعہ نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے، اصول فقہ کی تعلیم کا انداز یہ ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص میوزیم میں جا کر وہاں محفوظ قدیم ترین آلات جنگ کے بارے میں یہ تعارف کرائے کہ یہ بندوق فلاں بادشاہ کے دور میں تیار ہوئی اور فلاں جنگ میں استعمال ہوئی اور اس توپ کو فلاں بادشاہ نے فلاں معرکہ میں استعمال کیا۔

اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مدارس میں اصول فقہ کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے، اصول فقہ کی تعلیم ایک زندہ علم کی حیثیت سے دی جائے، اور طلباء کو ان اصولوں کے استعمال کی مشق کرائی جائے، کوئی بھی اصل یا ضابطہ پڑھا کر ایک دو روایتی مثالوں پر اکتفا کرنے کے بجائے طلباء کو اس کا عادی بنایا جائے کہ وہ مختلف ابواب فقہیہ کے مسائل میں اس کا اجراء کریں، تاکہ ان کی قوت استنباط میں جلا پیدا ہو اور نئے مسائل میں ان اصولوں کو استعمال کر سکیں۔

عام طور سے مدارس میں اصول فقہ کی سب سے پہلی کتاب اصول الشاشی پڑھائی جاتی



ہے، اصول الشاشی میں زیادہ تر اشارہ و اختصار سے کام لیا گیا ہے، ابتدائی مرحلہ میں طلباء کی ذہنی سطح سے یہ کتاب بلند معلوم ہوتی ہے، اصول الشاشی سے پہلے کوئی ایک ایسی کتاب شامل نصاب ہونی چاہئے جس میں انتہائی سادہ و سہل انداز میں اصول الفقہ کے مبادی کا بیان ہو، اور اس کی اہم اصطلاحات کی آسان تشریح کی گئی ہو، اس وقت عموماً مدارس میں اصول فقہ کی صرف دو کتابیں شامل نصاب ہیں: (۱) اصول الشاشی (۲) نور الانوار، اصول الشاشی مختصر ہونے کے باوجود مکمل نہیں ہو پاتی، عموماً کتاب اللہ کے مباحث ختم کراتے کراتے سال گزر جاتا ہے، کسی استاذ نے زیادہ محنت کی تو سنت اور اجماع کی بحث پڑھادی، قیاس کی بحث تو عموماً پڑھانے سے رہ جاتی ہے، حالانکہ مسائل کے استنباط و استخراج میں مباحث قیاس کی بڑی اہمیت ہے۔ ”نور الانوار“ کا صرف ابتدائی حصہ جو کتاب اللہ کے مباحث پر مشتمل ہے پڑھایا جاتا ہے، عام طور سے مدارس میں اصول فقہ کے نصاب کی یہ پوری کائنات ہے، بعض مدارس میں حسامی کا کچھ حصہ بھی شامل درس ہے، ظاہر بات ہے کہ اتنا سا نصاب پڑھنے سے اصول فقہ کے مسائل سے پوری واقفیت تو کجا ادنیٰ شناسائی بھی نہیں ہو پاتی۔

۴- یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد زندگی کے اکثر شعبوں میں انقلاب سا آ گیا ہے، انیسویں صدی کی تیز رفتار سائنسی اور سماجی تبدیلیوں نے دنیا کی کایا پلٹ دی، تجارت، لین دین، صنعت و حرفت کی نئی نئی شکلیں وجود میں آ چکی ہیں، اقتصادیات و معاشیات کا ڈھانچہ کلیۃً تبدیل ہو چکا ہے، ان دو صدیوں کی تیز رفتار تبدیلیوں نے جو مسائل کھڑے کئے، اسلام نے ان کا حل بھی پیش کیا، ہمارے فقہی نصاب درس میں متقدمین کی جو کتابیں شامل نصاب ہیں اور جن کا ذکر بار بار آچکا ہے ان میں نئے تبدیل شدہ حالات اور نئے مسائل کا ذکر نہیں ہے، اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ایسی کتاب ترتیب دے کر شامل نصاب کی جائے جس میں اہم ترین نئے مسائل کا تعارف اور ان کا شرعی حل پیش کیا گیا ہو، دور حاضر کے فقہاء اور فقہ اکیڈمیوں نے نئے مسائل

پر جو کام کیا ہے انہیں سامنے رکھ کر ایسی کتاب مرتب کی جاسکتی ہے۔

۵- تمام بڑے مدارس میں تخصص فی الفقہ کا دو سالہ کورس رکھا جائے، فارغ ہونے والے ذہین طلباء جنہیں فقہ سے خصوصی دلچسپی و شغف ہوا انہیں تخصص فی الفقہ میں معقول وظیفہ کے ساتھ داخل کیا جائے، تخصص فی الفقہ کا نصاب اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اسے پڑھنے سے آیات احکام اور احادیث احکام پر گہری نظر ہو، مجتہدین و فقہاء کے علمی سرمایہ سے کامل واقفیت ہو، اس بات کی کوشش کی جائے کہ تخصص کے طلبہ چاروں فقہی مسالک کی اہم شخصیات اور اہم کتابوں سے واقف ہو جائیں اور ان سے استفادہ کر سکیں، ان میں وسعت نظری اور وسعت ظرفی پیدا ہو، نئے مسائل اور نئے حالات کا صحیح علم و احساس پیدا ہو، تحقیق و استنباط کی صلاحیت پر و ان چڑھے اور دور حاضر میں اسلامی قانون کے نفاذ کی لگن اور تڑپ پیدا ہو، تخصص فی الفقہ میں پڑھنے والے طلباء اس لائق ہو جائیں کہ وہ دور حاضر میں اسلامی قانون کی صحیح تعبیر و تشریح کرنے کے ساتھ اسلامی قانون کی ابدیت اور برتری ثابت کر سکیں اور مغربی قوانین کے مقابلہ میں اسلامی قانون کے خصائص و امتیازات پر روشنی ڈال سکیں۔

۶- فقہ کے ساتھ نئی معاشیات اور اصول قانون کو بھی داخل نصاب کیا جائے، ہمیں امید ہے کہ دینی مدارس کے ذہین اور محنتی طلباء کو جدید معاشیات اور اصول قانون سے آشنا کرنے میں اس سے کہیں کم وقت خرچ ہوگا جتنا وقت ان موضوعات کی تعلیم کے لئے کالجوں میں درکار ہوتا ہے، جدید معاشیات اور اصول قانون سے واقف ہونے کے بعد ہمارے فضلاء اس بات کے اہل ہو جائیں گے کہ وہ نئے دور کی زبان و اصطلاح میں اسلام کے اقتصادی نظام اور اسلامی اصول قانون کی جامعیت اور برتری ثابت کریں اور دنیا کے سامنے ہر شعبہ زندگی کا وہ عادلانہ نظام پیش کریں جس کی جستجو دنیا بھر کے اہل فکر و دانش کو پریشان کئے ہوئے ہے۔



دوسرا باب

معاصر دینی تعلیم - مشکلات و احوال



## دینی مدارس: ان کی اہمیت اور ان کے مسائل پر غور

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ☆

ہماری مذہبی علوم کی بڑی درسگاہیں ہماری ملت کے فرزندوں کو اسلامی علوم و تعلیمات سے گہری واقفیت رکھنے والے ایسے افراد مہیا کرتی ہیں، جو مذہبی معاملات میں نہ صرف یہ کہ ان کی ضرورت پوری کریں بلکہ وقت کے دوسرے پیچیدہ دینی معاملات میں ان کی رہبری کریں، تاکہ مسلمانوں کی زندگی مذہبی طور پر مضبوط رہے، لیکن خود مسلمانوں کے بعض دانشور حضرات ان دینی مدارس کو غیر ضروری سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک دینی تعلیم کی ایسی اہمیت نہیں کہ اس کے لئے علاحدہ سے کوئی بڑا انتظام کیا جائے کیونکہ دین کا علم ان کے نزدیک صرف چند معمولی باتوں تک محدود ہے، جو کہ بلا کسی خاص نظم و انتظام کے خود بخود معلوم ہو سکتا ہے، ان کا یہ خیال صرف ایک سطحی خیال ہے، مسلمانوں کی زندگی میں دین ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے اور تفصیلی انداز سے تعلق رکھتا ہے، اور ان کی زندگی میں پوری وسعت رکھتا ہے، اس بات کو وہ حضرات نہیں سمجھتے، وہ مغرب کے لادینی نقطہ نظر سے ہی سوچتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ دین کی تعلیم کے لئے اتنی وسعت اور اس کو باقاعدہ نظام دینے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر وہ دین کو زندگی میں وسیع مقام نہ دیتے ہوئے اس کو مسلمان کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہی مان لیں تو جس طرح انسانوں کو ان کی خالص دنیاوی زندگی کے لئے میڈیکل کالجوں کی ضرورت ہے، تاکہ لوگوں کی صحت مند زندگی کے تحفظ کی اہم ضرورت پوری ہوتی رہے، اور جس طرح لا کالجوں کی ضرورت ہے کہ حکومت وقت کے

☆ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ



قوانین سے واقفیت رکھنے والے ماہرین پیدا ہوں، اور قانونی تحفظ کا انتظام ہو، اسی طرح مسلمانوں کی دینی زندگی کو اگر صرف ایک پہلو ہی سے تسلیم کر لیا جائے تو بھی انہیں ہمارے ان دینی مدارس کی اہمیت کو ماننا پڑے گا، کہ اس ضرورت کے انتظام کے لئے ایسی درسگاہوں کی ضرورت ہے جہاں ان کے دینی معاملات کے ماہر تیار کئے جاسکیں، حالانکہ اسلام میں مذہب زندگی کا صرف ایک پہلو ہی نہیں، بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر احکام و تعلیمات رکھتا ہے، جن کے جاننے اور ان پر عمل کئے بغیر ہم زندگی کو اپنے پروردگار کے حکم کے مطابق نہیں بنا سکتے۔

دراصل مغربی فکر کے رہنماؤں کی طرف سے تعلیمی مسئلہ میں جو تصور دیا گیا، وہ ان کے ایک طرفہ صرف دنیاوی تصور کا حامل ہے، ان کا نصاب جب جاری ہوا تو اس نے ایک صدی کے عرصہ میں مسلمانوں کی نئی نسل کے ذہنوں کی تشکیل میں خاصی حد تک اسی فکر و رجحان کو اپنے رنگ میں رنگ دیا جس میں صرف دنیاوی مقاصد کو ہی کافی سمجھا گیا، اور چونکہ عوام الناس اپنے سطحی ذہن کے سبب دنیاوی کامیابی کو اہمیت زیادہ دیتے ہیں، اس لئے ان کو صرف حکومت کی سرپرستی والا نظام ہی اپنی ضرورت کے مطابق نظر آیا، چنانچہ ملک کے عامۃ الناس اور ایسے دانشور جن کے ذہن میں آخرت کا تصور مضبوط نہیں، وہ صرف اسی نقطہ نظر کو کافی سمجھنے لگے۔ اس میں دینی پہلو کی طرف بالکل توجہ نہ تھی، اس طرح مسلمانوں کی مذہبی تعلیمات اور عقائد و اقدار کے سلسلہ میں جو خلاء پیدا ہو رہا تھا، اس سے بچانے کے لئے ضروری تدبیر اختیار کرنے کی طرف ان کے دانشوروں کو توجہ نہیں ہوئی۔ اسی کے تدارک کے لئے ہمارے اس دور کے علماء نے توجہ کی، اور دینی مدارس قائم کئے اور ان کی بنیادی سطح پر دینی مضامین کے ساتھ رائج الوقت زبان اور معلوماتی مضامین کو بھی داخل نصاب کیا۔

پھر تعلیم کی اونچی سطح پر دینی علوم میں پیشگی اور حسب ضرورت رہنمائی اور دینی تقاضوں کو صحیح طریقہ سے حل کرنے کی ضرورت کو پورا کرنے میں دینی علوم میں گہرائی اور اختصاص پیدا کرنے کی جواہمیت ہے، اس کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، اس کو زائد از ضرورت سمجھنا مغربی فکر

ورحان کو اپنا لینے سے پیدا ہوا ہے، یہ اسلامی فکر و عقیدہ کے بالکل خلاف ہے، اور یہ دراصل مغربی فکر کے الحادی تصور کے اثر سے پیدا ہوا ہے۔ مذہبی علوم کی مقدار اور اس میں دیئے جانے والے وقت کو گھٹانے کی جو بات کہی جاتی ہے، اس کی بنیاد دراصل مذہبی علوم کی وسعت اور ان میں اختصاص پیدا کرنے کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہے، ہماری مغربی نقطہ نظر کی تعلیم گاہیں جن کا نظام دراصل مغربی سامراج کے عہد میں شروع ہوا، وہ ایسے افراد پیدا کر رہی ہیں جن میں اسلامی نقطہ نظر کے اعتبار سے اس طرح کا خیال پیدا ہو جاتا ہے، وہ اگر اسلامی عقیدہ اور اس کی ساری تعلیمات کو اہمیت نہیں دیتے تو وہ کم از کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ مذہبی درس گاہوں کی اسلامی علوم میں تخصّص پیدا کرنے کے عمل کو مسلمانوں کی ایک اہم تعلیمی ضرورت سمجھ کر انہیں اپنا کام کرنے دیں، اور وہ خود اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اپنی تعلیم گاہوں کے ابتدائی مرحلہ کی تعلیم میں دینی عقیدہ اور بنیادی احکام کے مضمون کو بھی شامل نصاب کریں۔ اس کو داخل نصاب کرنے میں ان کا کوئی حرج نہیں، بلکہ ان کا شامل کرنا آغاز تعلیم میں مسلمان بچوں میں دینی بنیادوں کو مضبوط رکھنے کی ضرورت کی بنا پر بہت ہی مناسب اور ضروری ہے، افسوس یہ ہے کہ وہ دینی تقاضے کے مضامین کو اپنے نصاب میں جگہ نہیں دیتے، اور اس کے نتیجے میں وہاں کے فیض یافتہ حضرات بجائے اپنے تعلیمی نظام کے اس نقص کو محسوس کرتے، وہ ہماری دینی تعلیم گاہوں کی طرف سے دینی ضرورت کو حل کرنے کا جو نظم کیا جاتا ہے اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اکثر دینی مدارس اپنے بنیادی، ابتدائی اور متوسط تعلیم کے مرحلہ میں نصاب تعلیم کے ان دونوں پہلوؤں کو جمع کرتے ہیں، اور زندگی کے تقاضوں کے حامل علوم و معلومات کو شامل نصاب کرنے لگے ہیں، البتہ وہ اپنے نظام تعلیم کے اوپر کے درجات میں امت کی دینی رہبری اور دینی معاملات پر پورا عبور حاصل کرنے کی استعداد پیدا کرنے کے لائق توجہ و نظم کو اختیار کرتے ہیں، تاکہ امت کی اس پہلو کی ضرورت پوری ہو، ہمارے عصری علوم کی ان ابتدائی تعلیم کی تعلیم گاہوں میں اگر دونوں پہلوؤں کی ضرورت پورا کرنے کا عمل ہو تو مغربی فکر کے لائے ہوئے نظام تعلیم کے دونوں پہلوؤں کے درمیان جمع

کرنے کی صورت میں تھی وہ جامعیت اب بھی قائم کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ مسلمانوں کی دینی تعلیم کی اس ضرورت کو سمجھا اور مانا جائے، اس کام کو عصری درسگاہیں اپنے وسیع وسائل کے ذریعہ سے زیادہ آسانی سے کر سکتی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ہماری دینی درسگاہیں بہت تنگ اور محدود وسائل رکھتی ہیں، اس لئے ان کے لئے تعلیم کی متعدد اور مختلف شاخوں کو پورے طور پر جمع کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ اس کے باوجود ہمارے دینی مدارس اپنے ابتدائی اور ایک حد تک ثانوی مرحلہ میں دینی پہلو کا حق ادا کرتے ہوئے زندگی کے دیگر لازمی تقاضوں کا لحاظ اپنے محدود وسائل کے ساتھ کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں، چنانچہ ان کے ابتدائی مرحلہ کے نصاب میں رائج الوقت زبان اور لازمی سماجی مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں، جس سے دین اور دنیا کے دونوں پہلوؤں کی جامعیت حاصل ہو جاتی ہے، اس کو اگر ہمارے جدید فکر کے دانشور دیکھ لیں تو ان دینی مدارس کے متعلق انہیں صحیح رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اس کے برخلاف رائج تعلیمی نظام میں مسلمانوں کی زندگی کی مذہبی ضرورت کو بالکل نظر انداز کر دیئے جانے سے اس سلسلے میں جو خلا پیدا ہوتا ہے، اس کے نتیجہ میں اسلامی عقیدہ و عمل کے لئے جو خطرہ پیدا ہوتا ہے، اس کو ڈھیان میں رکھتے ہوئے غیرت اسلامی کے حامل مسلمانوں نے اسی تدارک کے لئے اسلامی تشخص اور دینی تقاضے کو سامنے رکھتے ہوئے ہی یہ ضرورت سمجھی کہ دینی تعلیم کے لئے علاحدہ سے نظام قائم کیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ صحیح دینی عقیدہ و اسلامی تصور کا جو خلا ہو رہا ہے، اس کا تدارک جس حد تک بھی ہو سکے کیا جائے، اس کے لئے علماء دین مخصوص دینی مدرسے قائم کرنے پر مجبور ہوئے، اور تعلیم کے اعلیٰ مرحلہ میں علوم اسلامیہ کے ماہر علماء تیار کرنے کا انتظام کیا، تاکہ جدید حاصل مادی فکر کے اثر سے پیدا ہونے والے اسلام مخالف اثرات کا مقابلہ کیا جاسکے، اور امت اسلامیہ کے دینی تشخص اور زندگی کے صالح تصور کو جس حد تک ہو سکے بچانے کا کام انجام دیا جاسکے، اسی ضرورت کو محسوس کر کے سامراجی حکومت کے زمانہ میں ہمارے علماء کرام نے دینی مدرسوں کے قیام کا اقدام کیا، اور مغرب کے خالص مادی فکر کی



حامل درسگاہوں سے نکلنے والوں میں جو دینی کمی ہے، اس کا تدارک ہو، اس کی بنا پر ہمارے مدارس کا یہ نظام بنا۔ اب آزادی کے دور میں سہولت ہے کہ ہم جدید حالات کے لحاظ سے جو ضرورت محسوس ہو، اس کو امت اسلامیہ کے دینی تقاضے کا لحاظ رکھتے ہوئے نصاب میں شامل کریں، تاکہ امت مسلمہ کے مذہبی تحفظ کے لئے جو نظم کیا جاسکے کیا جائے، اور مسلم عوام کو ضروری دینی رہنمائی بھی ملے، جس کے ذریعہ وہ زندگی کو اسلامی اقدار کے مطابق استوار کر سکیں، اسی فکر مندی کے باعث ملک کے علمائے دین نے دینی مدارس قائم کئے تھے جو مادی وسائل کی سخت کمی کے باوجود اہل اسلام کو ان کے دینی تقاضے سے واقف کراتے، اور علوم دینیہ اور اس کی ضرورت کے مطابق ان مدارس کو چلاتے رہے، مسلمانوں کا مذہب سے جو تعلق ہے اس کی بنا پر عوام کی طرف سے علماء کی کوششوں کو عام طور سے سراہا اور پسند کیا جاتا ہے۔

ہمارے ان دینی مدارس پر ایک یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں تعلیم حاصل کرنے والے زندگی کے دیگر تقاضوں سے صرف نظر کرتے ہیں، اور ایسے افراد پیدا کرتے ہیں جو سوائے نماز روزے کے زندگی کی دوسری ضروریات کو پورا کر سکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور نہ حالات زمانہ کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لوگوں کا یہ اعتراض ان کی بے خبری کی وجہ سے ہے، انہوں نے ان مدارس سے حاصل ہونے والی صلاحیتوں کو جاننے کی کوشش نہیں کی، یہ مدارس اگرچہ خالص دینی علوم کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، لیکن یہ ابتدائی مرحلہ کی تعلیم میں زندگی کے ضروری پہلوؤں کی تعلیم کو بھی جگہ دیتے ہیں، اور اوپر کی تعلیم میں بھی زندگی کے ضروری تقاضوں سے بھی حسب استطاعت واقف کر دیتے ہیں۔

موجودہ عہد کی یہ بات بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ مسلم دشمنی کا نیا رجحان مسلمانوں کے دینی شعور کو ختم کرنے کی سازش کے رجحان میں آتا ہے۔ عالمی پیمانہ پر اس امت اسلامیہ کو بے اثر بلکہ بے نام و نشان کر دینے کی کوشش ہو رہی ہے، جگہ جگہ ان کے بقا اور دین کے ساتھ ان کے تعلق کو ختم کر دینے کی سازشیں چل رہی ہیں، کہیں علمی و فکری میدان میں، کہیں تمدنی

وتاریخی میدان میں، کہیں سیاسی و سماجی میدان میں ایسے ایسے فتنہ کھڑے کئے جا رہے ہیں کہ اگر ان کے مقابلہ کے لئے ممتاز اہل علم و اعلیٰ صلاحیت کے علماء و فضلاء تیار کرنے کا کام نہ کیا گیا، تو اس امت کے وجود کو خطرہ پیش آ سکتا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے ہمارے اعلیٰ دینی تعلیم کے اداروں کی اہمیت کو کم نہ سمجھنا چاہئے ان کی حیثیت اسلامی عقیدہ و فکر کے قلعوں کی ہے، اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی اہمیت سمجھنا چاہئے، اور ان کو تقویت پہنچانا چاہئے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے ان اعلیٰ دینی تعلیم کے اداروں میں حالات حاضرہ اور موجودہ خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے نصاب میں ترمیم و اضافہ کا عمل جاری ہے۔





## معاصر دینی تعلیم - تقاضے اور دشواریاں

☆ مولانا بدر الحسن القاسمی (کویت) ☆

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کو اللہ تعالیٰ نے گہرا علم اور غیر معمولی بصیرت عطا کی تھی، ان کا دماغ نہایت زرخیز، حافظہ بیحد قوی، اور دل انتہائی روشن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انکو عبقریانہ خصوصیات کے ساتھ نہایت رواں قلم اور بے انتہا فصیح و بلیغ زبان بھی عطا کی تھی۔ وہ بے مثال محقق، عظیم قلم کار بھی کچھ تھے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے والے ”القاسم“ کی ادارت اس زمانہ میں کی جب علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حبیب الرحمن عثمانی اور مولانا اعجاز علی جیسے نامور ارباب علم و فضل موجود تھے۔ انکے بارے میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا قول ہے کہ ”مناظر احسن کے سارے مناظر احسن ہیں“

انہوں نے ۹ سال تک ٹونک میں منطق و فلسفہ اور دیگر عقلی علوم میں امامت کا درجہ رکھنے والے حکیم برکات احمد ٹونکی سے صرف منطق و فلسفہ اور دیگر عقلی علوم پڑھے تھے، پھر دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی بابرکت صحبت سے فیضیاب اور علامہ انور شاہ کشمیری کے دریائے علم سے بہرہ ور ہوئے، علامہ سید سلیمان ندوی نے انکے بارے میں لکھا ہے کہ مولانا گیلانی کا قلم اسلام کی طرف سے دفاع میں تیغ رانی کا کام کرتا ہے۔

انہوں نے قدیم ماحول میں رہنے اور روایتی علوم و فنون سے حظ وافر پانے کے بعد جدید

☆ نائب صدر اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

دانشگاہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں صدر شعبہ دینیات پر فائزہ کرا ایک عالم کو فیضیاب کیا۔ انکی مایہ ناز کتاب ”ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت“ ہمارے دینی مدارس کے نصاب کی عہد پر عہد ترقیوں، تبدیلیوں، خوبیوں اور خرابیوں سب کی بہترین داستان ہے۔ ہمارے ”درس نظامی“ پر ایرانی ثقافت کا کتنا گہرا اثر رہا ہے اس کا اندازہ اس کتاب سے لگایا جاتا ہے۔

میر باقر داماد کی لغو دلا یعنی کتاب ”لائق المبین“ نے کتنے دنوں تک لوگوں کے ذہنوں کو اپنا اسیر رکھا، صدر الدین شیرازی کی ”اسفار اربعہ“ اور پھر صدر ”اور ملا محمود کی ”شمس بازغہ“ وغیرہ کیوں لکھی گئیں اور طبقہ علماء کے نصاب کا جز کس طرح بنیں یہ ایک دلچسپ داستان ہے اور اس پس منظر کو رکھے بغیر نصاب کی بہت سی کتابوں کے بارے میں ہمارا ذہن و دماغ صاف نہیں ہو سکتا، اور نہ اس طرح کی کتابوں سے جذباتی وابستگی ختم ہو سکتی ہے۔

نصاب تعلیم کی کتابوں کے بارے میں ہر حلقہ اپنا الگ نقطہ نظر رکھتا ہے۔ جامعہ ازہر کے قدیم نصاب اور برصغیر کے مدارس کے نصابوں میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم کے سلسلہ میں بڑی حد تک مماثلت تھی جو اب باقی نہیں رہی، اور خلیجی ریاستوں کی تعلیم گاہوں کا نصاب اور نظام تعلیم اس سے قطعی الگ ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس سے پہلے جب حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کا اور میرا بعض خلیجی ملکوں سعودی عرب، متحدہ عرب امارات وغیرہ کا سفر ہوا تو اس سفر میں بہت سی دلچسپ باتیں پیش آئیں۔

ریاض میں ہم لوگ سعودی عرب کے سابق مفتی شیخ عبدالعزیز بن باز کے مہمان تھے، ہمارے اور شیخ کے درمیان واسطہ نامور ادیب ورحالہ (سیاح) دسیوں کتابوں کے مصنف معالی الشیخ محمد بن ناصر العبودی (حال مساعد امین عام رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ) تھے۔ شیخ ابن باز بلند پایہ عالم اور عقیدہ کے معاملہ میں بڑے پختہ اور غیور انسان تھے، جس چیز کو وہ حق سمجھتے اس کا برملا اظہار کرتے

تھے، پہلے دن تو انہوں نے بڑی پرتپاک دعوت کی جس میں متعدد اہل علم شریک تھے، ایک صاحب نے شیخ کے کان میں کچھ پھونکا تا کہ شیخ دارالعلوم سے بدظن ہو جائیں تو اگلے دن مجلس میں جیسے ہی میں نے سلام کیا اور ٹاپینا ہونے کے باوجود محض آواز سے شیخ لوگوں کو پہچان لیا کرتے تھے انہوں نے فرمایا: شیخ بدر کیف الحال؟ پھر اگلا جملہ بیٹھتے ہی یہ ارشاد فرمایا کہ:

سمعنا انکم اشاعرة! (میں نے یہ سنا ہے کہ تم لوگ (اہل دیوبند) عقیدہ کے لحاظ

سے اشعری ہو)

میں نے برجستہ کہا کہ:

اول کتاب یدرس عندنا فی العقیدة هی "العقیدة الطحاویة" (ہمارے

یہاں عقیدہ کی پہلی کتاب جو پڑھائی جاتی ہے وہ "عقیدہ طحاویہ" ہے)

شیخ نے حیرت کے ساتھ سوال کیا:

انتم تدرسون العقیدة الطحاویة؟ (اچھا، تم لوگ عقیدہ طحاویہ پڑھتے ہو؟)

میں نے عرض کیا کہ ہمارے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم یا رئیس الجامعہ شیخ محمد طیب

صاحب نے "العقیدة الطحاویة" کی شرح بھی لکھی ہے یہ سنکر شیخ خاموش ہو گئے۔

ظاہر ہے امام طحاویؒ احناف کے بلند پایہ امام ہیں اور انہوں نے "العقیدة الطحاویة" کے

نام سے امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے عقیدہ کی ترجمانی کی ہے اسلئے اصل

الاصول تو وہی ہے۔ جہاں تک متاخرین میں شرح عقائد نسفی اور شرح مواقف وغیرہ کی تدریس

کے رواج کی بات ہے تو وہ بعد کے حالات کا نتیجہ اور باطل فرقوں کی تردید کے طور پر نصاب تعلیم کا

جز بنی ہیں، اور امت کے دو تہائی علماء اشاعرہ و ماترید یہ ہی کہلاتے ہیں چنانچہ علامہ ابن حجر

عسقلانیؒ، امام نوویؒ، امام خطابیؒ اور دیگر بیشتر فقہاء و محدثین اسی زمرہ میں آتے ہیں جنکی علمی عظمت

اور جلالت شان کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ انکی دینی و علمی خدمات کا انکار، ان کی کتابیں ہی

شروح حدیث میں ہر مسلک و مذہب کے لوگوں کیلئے مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اسی سفر میں شیخ محمد بن ناصر العبودی نے ایک شب اپنے گھر میں ہم لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا، اور اس مجلس میں اپنے استاذ اور سعودی عرب کے نامور عالم، قضاء کونسل کے سابق سربراہ، موجودہ امام حرم شیخ صالح بن حمید کے والد ماجد شیخ عبداللہ بن حمیدؒ کو بھی عقیدت سے بلایا اور ہم لوگوں کا ان سے تعارف کرایا۔

شیخ ابن حمیدؒ ایک بلند پایہ فقیہ اور فقہ حنبلی پر دسترس رکھنے والے بڑے عالم تھے اور شیخ ابن بازؒ کی طرح اتفاق سے بینائی سے بھی محروم تھے لیکن ان کا دل علم نبویؐ کے نور سے منور تھا۔ تعارف کے ساتھ ہی انہوں نے سوال کیا کہ:

تم لوگ دارالعلوم دیوبند یا ہندوستان میں علم تفسیر میں کیا پڑھاتے ہو؟  
میں نے عرض کیا کہ:

”تفسیر جلالین“ انہوں نے دریافت کیا کہ: اس کے بعد؟ میں نے کہا کہ ”تفسیر بیضاوی“ تو شیخ نے کسی قدر دہشت و استغراب کے ساتھ فرمایا کہ:  
فیہ تاویل (اس میں آیات صفات کی تاویل کی گئی ہے)  
میں نے عرض کیا کہ:

نحن نعرف بأن فیہ تاویلا ولكن لا نستکف حتی من ”الکشاف“  
للمنحصری مع أن فیہ اعتزالا، ونری أن هذه مسئوليۃ المدرس أن ینبہ الطلاب  
علی ما فیہ من أخطاء۔

(ہمیں معلوم ہے کہ اس میں تاویل ہے لیکن ہم لوگ یہ جانتے ہوئے کہ مختصر کی تفسیر کشاف میں اعتزال ہے اس کے پڑھانے سے نہیں ہچکچاتے کیونکہ ہمارے یہاں یہ مدرس کی ذمہ



داری ہے کہ کتاب میں پائی جانے والی غلطیوں پر طلبہ کو متنبہ کرے اور اسکی کمزوری کو ظاہر کرے)  
 شیخ تو یہ سکر خاموش ہو گئے، میں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا کہ:

نختار کتب المنهج الدراسي للتأهيل وليس لإعطاء المعلومات،  
 فالذی یدرس تفسیر البیضاوی یرتفع أن یتعامل مع تفسیر الرازی وتفسیر  
 الزمخشری، لكن من یرتفع بتفسیر ابن کثیر فی الدراسة لا یمکن القدرة  
 لفهم ما فیہما من نقاط الضعف۔

(ہمارے یہاں کا طریقہ کاریہ ہے کہ ہم نصاب کیلئے ایسی کتابیں اختیار کرتے ہیں جن  
 سے پڑھنے والوں میں فنی صلاحیت پیدا ہو، یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ان کے ذہنوں کو زیادہ سے زیادہ  
 معلومات سے بھر دیا جائے چنانچہ ہمارے خیال میں جس شخص نے تفسیر بیضاوی سمجھ کر پڑھ لی ہو اس  
 کے لئے امام رازی کی تفسیر اور زمخشری کی الکشاف کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، لیکن جس نے صرف  
 تفسیر ابن کثیر پڑھی ہو تو اس میں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی کہ وہ ان کتابوں کی باریکیوں اور انکی  
 کمزوریوں کو سمجھ سکے)

برصغیر کے دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی بحث کے آغاز پر ایک صدی سے زائد  
 عرصہ گزر چکا ہے لیکن تبدیلی کے حامیوں اور نصاب کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی وکالت کرنے  
 والوں میں کوئی فریق بھی ایک دوسرے کو اپنے نقطہ نظر کا قائل نہ کر سکا۔

ندوة العلماء کی تحریک اسی مقصد سے شروع ہوئی، اور تبدیل شدہ نصاب کے مطابق سیکڑوں  
 مدارس قائم ہوئے لیکن ”درس نظامی“ کو مثالی اور آئیڈیل نصاب سمجھنے والے مدارس کی نہ تو تعداد کم ہوئی  
 اور نہ ان کا اثر کم ہوا اور دونوں ہی طرح کے مدارس اپنی اپنی ڈگر پر چلتے رہے، البتہ زمانہ کی تبدیلی کے  
 ساتھ ”درس نظامی“ میں معقولات کا حصہ بتدریج کم ہوتا رہا اور نحو و صرف اور معانی و بیان کی بھی بعض  
 مشکل کتابیں نصاب سے خارج کر دی گئیں لیکن اصل ڈھانچہ میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں ہوئی۔



قدیم نصاب کے حامیوں کا کہنا ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسی شخصیتیں جس نصاب تعلیم سے پیدا ہوئیں، اور خاص طور پر شرعی علوم یعنی تفسیر و حدیث اور فقہ اصول میں جس دقت نظر کے حامل یہ لوگ ہوئے ہیں ویسی صلاحیت پیدا کرنے میں تبدیل شدہ نصاب کامیاب نہیں رہا ہے جبکہ اصل مقصود شرعی علوم میں مہارت ہی ہے، محض عربی یا اردو میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کر لینا دینی مدارس کے قیام کا ہرگز مقصد نہیں رہا ہے۔

جبکہ تبدیلی کی وکالت کرنے والوں کا خیال یہ ہے کہ قدیم نصاب کے مطابق عربی زبان کے قواعد نحو و صرف و بلاغت و معانی کی مشکل ترین کتابیں سالہا سال پڑھتے رہنے کے باوجود نہ عربی زبان میں اپنے مافی الضمیر کی قدرت پیدا ہوتی ہے اور نہ تصنیف و تالیف کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے اور ساری زندگی نصابی کتابوں کے شروح و حواشی میں بسر ہو جاتی ہے، اس طرح کسی علم کے بارے میں معلومات بڑھتی ہیں اور نہ کسی فن میں مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

تجربات کی روشنی میں دونوں ہی فریق کے دلائل وزنی ہیں لیکن ہماری رائے میں دونوں ہی طرز کے نصاب پر اکتفا کرنے والوں میں نقص کے کچھ پہلو ایسے رہ جاتے ہیں کہ نہ تو قدیم نصاب تعلیم ہی کافی قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ مروجہ تبدیل شدہ نصاب سے ہی دینی ”عالم گری“ کی صنعت کو فروغ ملتا ہے بلکہ ”کچھ اود“ کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے، اور یہی ”کچھ اور“ وہ ہے جسکی تلافی یا جس کے حصول کا وسیلہ ہماری آج کی بحث و گفتگو کا عنوان بلکہ ہمارے اس سمینار کا حاصل ہونا چاہئے۔

جس طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کو دارالعلوم دیوبند کی ”پیداوار“ نہیں کہا جاسکتا بلکہ ”دارالعلوم دیوبند“ ان کی پیداوار ہے اور خود انکی اپنی تعلیم تو دہلی کالج کے مولانا مملوک علی صاحبؒ اور دیگر اعیان کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے اور پھر قدرت کی طرف سے خصوصی فیض اور عطیہ کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح مولانا سید سلیمان ندویؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا محمد علی مونگیریؒ وغیرہ نہ تو دار

العلوم ندوۃ العلماء کی ”پیداوار“ ہیں اور نہ ندوۃ العلماء کے نصاب کو پڑھ کر ان کو علم و فضل کا وہ مقام ملا جس پر وہ فائز تھے، علامہ شبلی کے استاذ مولانا قازوق چریا کوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری وغیرہ تھے، اور سید صاحب کی تعلیم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دیگر روایتی مدرسوں میں ہوئی تھی، اور مولانا محمد علی مونگیریؒ تو خود ندوہ کے بانی ہیں ”ندوہ“ ان کا بانی نہیں ہے۔

اس لئے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ دینی و ادبی علوم و فنون کی مہارت نہ تو محض اس مدرسہ کی دین ہے اور نہ اس مدرسہ کی۔ ”درس نظامی“ کی ترتیب سے پہلے بھی ائمہ دین پیدا ہوتے رہے ہیں اور دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے بغیر بھی محدث، مفسر، فقیہ اور ادیب و مصنف بھی کچھ پیدا ہوتے رہے ہیں۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی  
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزند ی

در اصل شخصیت سازی یا علماء گری میں نصاب تعلیم ہی بنیادی عامل نہیں ہے بلکہ بہت سے دیگر عوامل میں سے ایک عامل یہ بھی ہے، اسلئے موجودہ علمی انحطاط کو نصاب تعلیم سے جوڑنا صحیح نہیں ہے، آج بھی محض درس نظامی پڑھنے والوں میں اچھی صلاحیت کے لوگ پیدا ہو رہے ہیں اور درس نظامی کو چھوڑ کر دوسرے نصاب تعلیم کو اپنانے والوں میں بھی باصلاحیت لوگوں کی کمی نہیں ہے، البتہ اگر تناسب دیکھا جائے تو دونوں ہی سلسلوں میں زبردست انحطاط پایا جاتا ہے جسکی بڑی وجہ آئیڈیل شخصیتوں کی کمی اور ائمہ علم و فن کا فقدان ہے۔ نمایاں شخصیتیں نہ نصاب سے بنتی ہیں اور نہ تدریس و تعلیم کے نظام سے، شخصیتوں کی تعمیر میں سب سے زیادہ مؤثر عنصر آئیڈیل شخصیتوں کا وجود ہے چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے گرد سارے عقلائے روزگار جمع ہو گئے تھے اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگردوں میں ہر ایک شخص دائرہ علم کی حیثیت رکھتا تھا۔ علامہ محمد یوسف بنوریؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ،

مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانی بھی حضرات شاہ صاحب کی مثالی شخصیت اور نادرہ روزگار وجود کو دیکھ کر عظیم شخصیتیں بنی تھیں۔

اسی طرح علامہ شبلی نعمانی کے گرد جس طرح علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الباقی ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، مسعود عالم ندوی وغیرہ جیسے قلمکار جمع ہو گئے تھے وہ شبلی صاحب ہی کا اثر تھا، اس طرح کے نمونے ہمیشہ دیکھنے کو نہیں ملتے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے اپنے گاؤں میں بیٹھ کر بڑے بڑے محدثین پیدا کئے جو محض انکی شخصیت کا فیض تھا نہ مدرسہ کا، نہ نصاب تعلیم کا۔

اس کے باوجود نصاب و نظام تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک معاملہ ”معاصر دینی تعلیم“ اور عصر حاضر کے تقاضوں کا ہے تو بلاشبہ اس وقت ہمارے ادارے جس طرح چل رہے ہیں انہیں نہ تو وقت کے تقاضوں کا پورا ادراک ہے اور نہ واقعی دینی ضرورتوں کی تکمیل کے اسباب، اسلئے ان کارخانوں سے جو خام مال تیار ہو رہا ہے اس سے مارکیٹ کی ضرورت پوری نہیں ہو پا رہی ہے اور ”خدمت دین“ کا نعرہ لگانے والوں کی کثرت کے باوجود خدمت دین کے بیشتر محاذ خالی نظر آ رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے قدیم نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے کہ موجودہ زمانہ کے علماء مغربی علوم یا یورپی ثقافت و تہذیب اور زبان و لٹریچر کو پڑھنے پڑھانے سے متوحش ہیں، سوال یہ ہے کہ ”یونان“ کہاں ہے؟ اور کیا یونانی علوم اس زمانہ کے ”مغربی علوم“ کی حیثیت نہیں رکھتے، پھر یونانی منطق و فلسفہ کی اتنی محبت اور انکی حمایت پر اتنا زور اور موجودہ مغربی علوم کے مفید عنصر سے اتنی نفرت کیوں؟!

نامور مصلح علامہ رشید رضا مصری کی جب علامہ شبلی کی دعوت پر ہندوستان آمد ہوئی تو انہوں نے جیسا کہ خود ہی اپنے مشہور روزگار مجلہ ”المنار“ میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کی مخالفتوں کے

باوجود دارالعلوم دیوبند کو دیکھنا بھی ضروری سمجھا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی موجودگی میں ان کا استقبال ہوا اور حضرت شاہ صاحب کی وہ معرکہ الآراء تقریر سپاسنامہ کے طور پر سنی جسمیں حضرت شاہ صاحبؒ نے ائمہ مذاہب اربعہ کے طریقہ استدلال پر محققانہ نظر ڈالی تھی اور جس سے رشید رضا اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے مصر واپس جانے کے بعد ”المنار“ میں ایک مستقل آرٹیکل لکھا کہ:

وجدت هذه الجامعة فوق كل ثناء وانتقاد ورأيت فيها نهضة علمية جديدة.  
(میں نے اس ادارہ کو ہر طرح کی تنقید سے بالاتر پایا اور مجھے اس میں نئی علمی نشأت کے آثار نظر آئے)

غایت تاثر میں یہاں تک لکھ گئے کہ:

لولم أر هذه الجامعة في الهند والتي تستحق أن تلقب بأزهر الهند  
لرجعت من الهند حزينا.

(اگر میں ہندوستان میں اس ادارہ کو نہ دیکھتا جو بلاشبہ ازہر ہند کہلانے کا مستحق ہے تو میں ہندوستان سے غمگین لوٹتا)

اس استقبالیہ اجلاس کے دوران اپنے خطاب میں جو دو سوال اکابر دیوبند سے انہوں نے کئے تھے انہیں ایک تو سیاسی نوعیت کا تھا کہ انگریزوں کے خلاف اس وقت آپ جہاد کر رہے ہیں اور ہندوستان سے انکونکا لئے کیلئے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سات سمندر پار سے آئی ہوئی انگریزوں کی ظالم ٹولی جو اپنی تعداد کے لحاظ سے چھوٹی سی ہے جب چلی جائے گی اور اس کے بعد آپ ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کی ماتحتی میں ہوں گے اس وقت آپ کا کیا حال ہوگا اس کے لئے آپ نے کیا سوچا ہے؟

دوسرا سوال یہ تھا کہ آج تک آپ قدیم یونانی منطق و فلسفہ کو اپنے نصاب کا جز بنائے



ہوئے ہیں جبکہ خود اہل مغرب نے بھی انکو چھوڑ دیا ہے اور ان فلسفیانہ نظریات کی تردید کر دی ہے پھر آپ جدید علوم کو چھوڑ کر انکو اپنے گلے سے کیوں لگائے ہوئے ہیں؟

پہلے سوال کے جواب میں کہا گیا تھا کہ مقصد صرف ہندوستان نہیں پورے عالم اسلام کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانا ہے، اور دوسرے سوال کا جواب یہ دیا گیا کہ ہمیں چونکہ مختلف فرقوں کے ساتھ مناظرے کرنے پڑتے ہیں اسلئے یونانی فلسفہ و منطق کی تعلیم کی ضرورت ہے اس پر علامہ رشید رضاؒ نے کہا کہ امید ہے کہ آپ کی یہ ضرورت جلد ختم ہو جائے گی۔

علامہ انور شاہ صاحبؒ کے معتبر شاگردوں کا بیان ہے کہ آپ نے فلسفہ جدیدہ کی بعض کتابیں اپنے طور پر بعض شاگردوں کو پڑھانے کا سلسلہ خود ہی شروع فرمادیا تھا۔

مسئلہ اس وقت صرف منطق و فلسفہ کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے یا انکو اپنے نصاب کے جز کے طور پر باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس خواہ ”درس نظامی“ کے سلسلہ کے ہوں یا تبدیل شدہ نصاب کو رائج کرنے والے کیا ان سے ہماری دینی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں اور ”دعوت دین“ یا ”دفاع عن الدین“ کی عوامی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے نیز ”تفقہ فی الدین“ رکھنے والے اس ”طائفہ“ کو تیار کرنے میں ہمارے یہ دینی قلعے کامیاب ہیں جو عصر حاضر میں پیدا ہونے والے نئے اور پیچیدہ مسائل کا فقہی حل پیش کر سکیں؟

ہماری نظر میں - دعوت دین علی وجہ البصیرۃ

- دفاع عن الدین عن کفاءة واقذار

- اور ”تفقہ فی الدین“ رکھنے والے گروہ کی تیاری میں ہمارے دینی مدارس کی کامیابی مبصرین کی نظر میں مشکوک ہوتی جا رہی ہے، اور رب کائنات کی طرف سے ”ذہانت و قوت حفظ“ کی عطا میں کمی نہ ہونے کے باوجود ”ائمہ دین“ یا فقہ و حدیث و تفسیر کے ماہرین کا پیدا ہونا ختم نہیں تو بڑی حد تک کم ضرور ہو گیا ہے۔



اگر برصغیر کے ساتھ خلیجی ریاستوں اور عالم اسلام میں پائی جانے والی تعلیم گاہوں کو بھی جامع ازہر سمیت شامل کر لیا جائے اور وہاں سے دینی تعلیم حاصل کر کے نکلنے والوں کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ عمومی انحطاط سے بھی ادارے دو چار ہیں، اور اب مصر میں بھی شیخ ابوزہرہ، عبد الوہاب خلاف، مصطفیٰ شلمی، اور ابراہیم مدکور جیسے فقہی بصیرت رکھنے والے لوگ پیدا نہیں ہو رہے ہیں جو یقیناً ایک بڑا المیہ ہے۔

جامع ازہر کے ساتھ تو ٹریجڈی یہ رہی ہے کہ گزشتہ تقریباً نصف صدی سے ترقی کے نام پر اسکی روح نکالی جاتی رہی ہے۔

خلیجی ریاستوں میں جو اسلامی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں یا عام یونیورسٹیوں میں جو اسلامی شریعت، فقہ و اصول یا حدیث و تفسیر کے شعبے قائم ہوئے انہیں بہت سی خوبیوں کے باوجود بعض چیزیں شروع سے ایسی شامل رہیں جو علمی گہرائی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں، کچھ کا تعلق نصابی کتابوں سے ہے اور کچھ کا مخصوص طرح کے تعلیمی نظام کی پابندی سے پھر بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن سے برصغیر کے روایتی دینی تعلیمی نظام کی سدھار میں مدد ملی جاسکتی ہے۔

مثال کے طور پر ”اصول حدیث“ یا ”علم مصطلح الحدیث“ کی تعلیم کیلئے صرف حافظ ابن حجرؒ کی ”نخبۃ الفکر“ یا اس کی شرح ”نزهۃ النظر“ پر اکتفا کرنے سے فنی بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اگر ”طرز کہن“ پر ہی اڑنا ہے تب بھی مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی مرتب کردہ اور عبدالفتاح ابو غدہ کی تحقیق کے ساتھ شائع شدہ ”عربی خط قواعد فی علم الحدیث“ یا اس طرح کی کوئی اور کتاب پڑھانا بیکسروری ہے۔ فنی اصطلاحات سے اجمالی طور پر روشناس کرنے کیلئے شیخ محمود الطحان کی ”تیسیر مصطلح الحدیث“ بھی اچھی ہے۔

اسی طرح اصول تفسیر میں محض شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فارسی کتاب کا عربی ترجمہ پڑھا دینے سے علم تفسیر کی مبادیات کا بھی پورے طور پر علم نہیں ہو پاتا، اور نہ پڑھنے والوں کے ذہن

ودماغ میں تفسیر و تاویل کا فرق، وحی کی شکلیں، قرآن کے اعجاز کی وجوہ، نزول قرآن کی ترتیب، معتمد اور غیر معتمد اور مآثور و غیر مآثور تفسیر کے بارے میں بنیادی معلومات آ پاتی ہیں، اسلئے ضرورت ہے کہ عرب یونیورسٹیوں کی طرح شیخ مناع القطان کی ”مباحث فی علوم القرآن“ یا صحیح الصالح کی ”مباحث فی علوم القرآن“ یا عبد العظیم الزرقانی کی ”مناہل العرفان“ کی تلخیص وغیرہ نصاب کا جز ہوں تاکہ علم تفسیر میں اختصاص رکھنے والے کی دلچسپی محض جلالین کی شروح اور بیضاوی کے حواشی تک محدود نہ رہے۔

درس نظامی اور خاص طور پر دارالعلوم دیوبند کا امتیاز ”دورہ حدیث“ رہا ہے لیکن یہ امتیاز بھی مظاہر العلوم میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور دیوبند میں شیخ الحدیث استاذ گرامی حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب کے جوہر کی حد تک تھا، اس کے بعد سے جو حال ہے وہ محتاج بیان نہیں، اور موجودہ عہد کے بعض شیخ الحدیثوں کی حدیث فہمی کے نمونے دیکھ کر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ع

ناائقہ سر بہ گریباں ہے، اسے کیا کہئے؟

مولانا محمد یونس صاحب ”البتہ انفرادی مقام کے حامل ہیں، انکی فنی مہارت قابل تعریف ہے۔

برصغیر (ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش) میں ”دورہ حدیث“ کا بابرکت نظام آج بھی اپنے اندر بہت سی خوبیاں لئے ہوئے ہے لیکن جو کمی پہلے محسوس کی جا رہی تھی وہ اب بھی ہے کہ شروع کے تقریباً ۶ ماہ مقدمات اور استقبال و استدبار قبلہ، آمین بالجہر، قراءۃ فاتحہ خلف الامام جیسے اختلافی مسائل میں حنفی نقطہ نظر کی ترجیح میں صرف ہو جاتے ہیں، اور پھر حقیقی دورہ شروع ہوتا ہے جس میں عبارت کی خواندگی ہوتی ہے اور استہاذ کا کام صرف سننا رہ جاتا ہے، اس کی وجہ سے بہت سے ابواب اس طرح گزرتے ہیں کہ جیسے پڑھے ہی نہیں گئے۔

اس کا علاج دارالعلوم کراچی میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے یہ کیا تھا کہ صحاح کی تمام کتابوں کے ابواب اس طرح متعین کر دیئے جائیں کہ پورے ذخیرہ پر کم از کم ایک بار تحقیقی نظر سمجھوں کی پڑ جائے، مثال کے طور پر صحیح مسلم میں اگر کتاب الایمان اور کتاب البیوع کے ابواب طے کئے ہیں تو پھر دوسری کتابوں میں ان ابواب پر تفصیلی بحث نہ کی جائے۔ اسی طرح اگر سنن ابی داؤد یا ترمذی میں عبادات سے متعلق ابواب تحقیق سے پڑھائے جاتے ہیں تو دوسری کتابوں میں ان ابواب پر زور نہ دیا جائے۔ شرح معانی لا آثار اور مؤطا امام محمدؒ ”مقارنہ بین المذاہب“ کی بہترین کتابیں ہیں انکو مزید اہتمام سے پڑھانے کی ضرورت ہے خواہ دورہ حدیث سے پہلے ہی کیوں نہ ہو۔

عرب جامعات کا حال اس سلسلہ میں اور بھی ابتر ہے۔ منتخبات کے طور پر صحیح بخاری وغیرہ کی چند حدیثیں پڑھائی جاتی ہیں، صحاح ستہ اور معانی لا آثار اور امام مالکؒ اور محمدؒ کی مؤطا پڑھانے کا نہ رواج ہے اور نہ امکان، انفرادی طور پر کسی شیخ سے کچھ ابواب یا پوری کتاب سنکر کوئی اجازت لے لے یہ اور بات ہے جس کا ذوق آجکل بڑھتا جا رہا ہے۔

لیکن ان جامعات میں ”مصطلح حدیث“ اور ”تخریج حدیث“ وغیرہ کے فن کو زیادہ اہتمام سے پڑھایا جاتا ہے جس میں سے کچھ کاررواج ہمارے مدارس میں ہونا چاہئے، اسی طرح باطل افکار و عقائد کی تردید کیلئے جو چیزیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں نہ تو موجودہ زمانہ کی گمراہیوں کا ذکر ہوتا ہے اور نہ قدیم فرقوں کا ہی، انکے صحیح مآخذ سے تعارف اور یہ دونوں ہی باتیں اصلاح طلب ہیں، موجودہ زمانہ میں ”سیاست شرعیہ“ کو بھی مستقل مضمون کی حیثیت سے نصاب تعلیم کا جز ہونا چاہئے لیکن اس کی طرف بھی توجہ نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ”نصاب تعلیم“ کا مسئلہ بعض وجوہ سے اور خاص طور پر اس لئے کہ

ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے

ادھر یہ رٹ ہے کہ ساقی صراحی مے لا

اہل منطق کی اصطلاح میں ”جذرا صم“ بن گیا ہے یعنی اس کا کوئی عمومی حل صحیح ارادہ نہ ہونے کی وجہ سے ممکن نہیں ہے۔

اس وقت جتنے نصاب رائج ہیں سبھی میں کمی بیشی یا کاٹ چھانٹ کی ضرورت ہے۔ نہ ”درس نظامی“ ہی قرآنی منصوبات میں سے ہے اور نہ ”تبدیل شدہ“ نصاب کے نتائج ہی فقہ و حدیث و تفسیر کے ماہرین پیدا کرنے میں سو فیصد کامیاب کہے جاسکتے ہیں، دونوں کے بیچ کی راہ نکالی جاسکتی ہے اور عرب یونیورسٹیوں میں قائم کلیۃ الشریعہ کے طرز تعلیم سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جہاں کتاب نہیں ”مواد“ کی تعلیم ہوتی ہے۔

”مواد“ کی تعلیم کیلئے اس طرح کے اساتذہ پہلے تیار کرنے ہوں گے، متن اور اس کے حواشی پر اکتفا کے بجائے پورے موضوع پر دستیاب مصادر سے فائدہ اٹھانے اور انکی بنیاد پر ”محاضرات“ کا ذوق پیدا کرنا پڑے گا۔

اس نظام کی خرابی یہ ہے کہ اس میں ”فقہ“ کے پورے ذخیرے سے آشنائی نہیں ہو پاتی، اور ہدایہ، مسلم الثبوت اور اس طرح کی کتابوں سے استفادہ کی یونیورسٹی کے طلبہ میں صلاحیت بھی نہیں پیدا ہو پاتی جتنے ”مواد“ تین چار سالوں میں پڑھ لئے ان پر تو خوب ذہن حاوی ہو جاتا ہے لیکن ”غیر مظان“ سے مسائل تلاش کرنے کیلئے پھر پرانے طرز کے علماء کی ہی ضرورت پیش آتی ہے۔

میری نظر میں موجودہ تناظر میں اور جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دینی تعلیم کے نظام و نصاب کی بہتر شکل اسی وقت سامنے آسکتی ہے جب دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، فقہ اکیڈمی، امارت شریعہ یا کسی اور مرکزی ادارے کی نگرانی میں ایک باقاعدہ ”کلیۃ الشریعہ“ کا قیام عمل میں آئے جس میں درس نظامی، ندوۃ العلماء، اور عرب ملکوں کے شریعت کالج کے نظام و نصاب کا ”صالح عنصر“ رکھ کر افراد سازی کی کوشش کی جائے۔



مولانا محمد رضوان القاسمی مرحوم کی زندگی میں خیال تھا کہ دارالعلوم سمیل السلام اس طرح کے تجربہ کیلئے موزوں جگہ ثابت ہوگی لیکن انکی وفات کے بعد

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

دارالعلوم امارت شرعیہ کا خواب بھی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ نے روایتی انداز کا مدرسہ قائم کرنے کیلئے نہیں دیکھا تھا، حضرت قاضی صاحبؒ کے انتقال کے بعد یہ خواب بھی ادھورا ہی رہ گیا، اسی طرح اب تو مولانا شاہد روح اللہ رحمانی کے بقول: ع

اب کھلونوں سے کھیلو جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

شریعت کی تعلیم کا عالمی طور پر مقبول ڈگریوں سے مربوط ہونا بھی ضروری ہے ورنہ جس طرح ۱۸ اور ۲۰ سال کی تعلیم کے باوجود ہم جیسے افراد جنکے لئے عربی اور انگلش دونوں زبانوں میں ”بے زبانی ہے زباں میری“ ٹائٹل بن گیا ہے، اسی طرح طویل عرصہ تک دینی تعلیم حاصل کرنے اور ہر طرح کا کمال حاصل کر لینے کے باوجود پڑھ لکھ کر ”ناخواندگی“ کا عالمی الزام لگتا رہے گا۔

آج جبکہ سارا عالم ایک گاؤں کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور باطل قوتیں شرک والحاد اور بے حیائی و اخلاقی انارکی کو پھیلانے کیلئے جدید ٹکنالوجی کا بھرپور استعمال کر رہی ہیں ان پر روک لگانے کیلئے ٹیلیویشن سے لیکر انٹرنیٹ اور ”میڈیا“ کے دیگر بھی وسائل پر دسترس رکھے بغیر دین کی خدمت کا خواب پورا نہیں ہو سکے گا، اور نسل کی نسل کفر والحاد کے دلدل میں پھنستی چلی جائیگی، اور ہم اپنے آپ کو لوگوں کی ہدایت و اصلاح کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کر پائیں گے۔

”دینی مدارس و جامعات میں فقہ و اصول کی تعلیم اور جدید تقاضے“ کے عنوان سے جو مقالہ میں نے دیوبند کے سمینار کیلئے لکھا تھا اس مضمون کو اسی کا تکملہ سمجھنا چاہئے، اس لئے مزید کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ واللہ ولی التوفیق،،،





## چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر

☆ پروفیسر محسن عثمانی ندوی

وہ نبوت کے چشمہ حیواں سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے کشتزاروں میں ڈالتا ہے۔ یہ عبارت اس مقالہ کا اقتباس ہے جسے دارالعلوم دیوبند میں اساتذہ اور طلبہ کے سامنے پڑھا گیا تھا اور مقالہ کا عنوان تھا ”طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں“۔ مقالہ نگار جو وقت کے ایک بڑے عالم ہونے کے ساتھ ذہنِ ثابت بھی رکھتے تھے اور دل روشن بھی، کوئی اور نہیں مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ انہوں نے مقالہ میں کارِ مدرسہ کو بہت خوبی سے بیان کر دیا۔ یعنی مدرسہ کے فضلا کا کام اور مقام یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کر سکیں؛ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے مدارس دینیہ میں طلبہ اساتذہ اور فارغین کو نبوت کے چشمہ حیواں سے کتنی واقفیت ہوتی ہے اور کتنی صلاحیت ہوتی ہے اور جتنی واقفیت ہوتی ہے کیا اس کے عشرِ عشر کے برابر بھی واقفیت زندگی کے کشتزاروں کے بارے میں ہو جاتی ہے؟ اگر واقفیت ہو جاتی ہے تو کام صرف عملی جامہ پہنانے کا باقی رہتا ہے اور اگر واقفیت نہیں ہوتی ہے اور بالکل ہی نہیں ہوتی ہے تو کشتزاروں سے پوری واقفیت کے بغیر اس میں چشمہ حیواں سے پانی کیسے ڈالا جاسکتا ہے اور اس عظیم الشان مشن سے کیسے عہدہ برآ ہوا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا کی تحریر بہت پرسوز اور بصیرت افروز تھی، مولانا نے طاقت و رلجہ میں مدرسہ کے ذمہ داروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ”مدرسہ کا تعطل اور قیادت سے کنارہ کشی، کسی

☆ صدر شعبہ عربی، EFL یونیورسٹی، حیدرآباد

منزل پر قیام خود کشی کا مرادف ہے اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کے ہم معنی ہے اور کوئی خود شناس اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔

زندگی کا وہ کشت زار کیا ہے جس کا مولانا نے اپنے خطابِ بلغ میں تذکرہ کیا ہے؟ دنیا کے تمام علمی تحقیقی ادارے اس کشت زار کی حقیقت اور ماہیت پر کام کرنے کے سوا اور کیا ہیں۔ نیچرل سائنس ہو یا سوشل سائنس، آرٹس ہو یا لسانیات، ٹکنالوجی اور اس کی انواع و اقسام، ہر شعبہ علم کا تعلق اسی کشت زار سے ہے جس کے صرف ایک معمولی جز پر ہزاروں انسان نظریہ سازی کرنے پر اپنی عمر اور توانائی صرف کر ڈالتے ہیں، ان ہی صحیح اور غلط نظریوں پر نظام ہائے زندگی کی بنیادیں استوار کی جاتی ہیں۔ ان ہی نظریات کی حمایت یا مخالفت میں انقلاب آتے ہیں اور حکومتیں بنتی اور بگڑتی ہیں، سماج کی تعمیر یا تخریب ہوتی ہے۔ نظریات کی حیثیت ایک سیلاب کی ہوتی ہے۔ کوئی نظریہ صحیح یا غلط جب دل میں جڑ پکڑ لیتا ہے اور دماغ میں سرایت کر جاتا ہے تو پھر وہ ایک سیل سبک سیروز میں گیر کے مانند ہو جاتا ہے، اس کی طغیانی کھیتوں کو اور اس کی فصلوں کو بہا لے جاتی ہے اور کوئی چیز آسانی کے ساتھ اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی ہے۔ سماجی علوم اور سائنس کے نظریات کا علم اور ان کے زشت و خوب کے تمیز کا علم ہی کشت زار کا علم ہے، جب اس کشت زار کے بارے میں کوئی علم نہ ہوگا اور خوب و نا خوب کی تمیز نہ ہوگی تو انسان کوئی کلیدی رول زندگی میں ادا نہیں کر سکے گا۔ وہ زندگی کے تمام میدانوں میں سرگرم عمل اور سرگرم کار نہیں ہو سکے گا اور پھر تعطل اور قیادت سے کنارہ کشی کا شکار ہو جائے گا۔ اسی لئے ہمارے مدرسے کے فضلاء تعطل اور دنیا کی قیادت سے کنارہ کشی کا شکار ہو چکے ہیں۔ انہیں خبر ہی نہیں کہ کن نظریات پر دنیا کا اجتماعی اور سماجی نظام چل رہا ہے۔ تہذیب کی بنیاد کیا ہے اور دنیا میں تہذیبوں کا اختلاف کیوں ہے۔ مختلف نظامہائے حیات کے درمیان سرد جنگ کیوں جاری رہتی ہے۔ سیاسی اور تمدنی انقلابات کیوں آتے ہیں، فکری قیادتیں کیا کیا ہیں اور ان کے درمیان ٹکراؤ کیوں رہتا ہے۔ ان

فکری قیادتوں کا مقابلہ کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام باتوں سے لاعلمی اور بے خبری کی وجہ سے ہمارے طلبہ فراغت کے بعد علمی اور فکری رہبری سے قاصر رہتے ہیں اور ملکی اور عالمی سطح پر کوئی مثبت رول ادا نہیں کر سکتے ہیں، اور پھر انقلاب روزگاری گردشوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جنہیں اپنے زمانہ کی امامت کرنا چاہئے تھا وہ کہنہ دماغ بن کر زمانہ کے پیرو بن جاتے ہیں۔ ان کا ذہن اتنا چھوٹا ہو جاتا ہے کہ فقہ کے اجتہادی مسائل بہت مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں اور ان سے سرمو انحراف پر واویلا مچانے لگتے ہیں۔ مسلکی اختلاف ان کا پسندیدہ میدان جنگ ہوتا ہے۔ حضرت مولانا علی میاں نے قرآن و سنت کے علوم کے لئے چشمہ حیواں کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ اس چشمہ حیواں تک سب کی تو نہیں البتہ کچھ طلباء ہائے مدارس کی رسائی ضرور ہو جاتی ہے لیکن زندگی کے کشت زار تک کسی ایک طالب علم کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔ اور رسائی کے لئے جن زبانوں کی تحصیل اور ان میں مہارت کی ضرورت ہے ان میں طلبہ ناخواندگی کا شکار رہتے ہیں۔ اور سماج کا ایک عضو معطل بن کر جینا ان کا مقدور ہو جاتا ہے۔

ایک زمانہ میں یونانی علوم کا دور دورہ تھا اور شہرہ تھا ان ہی علوم کے ذریعہ دنیا کو سمجھا جاسکتا تھا۔ ان علوم کی حیثیت اس زمانہ کے کشت زار کی تھی امام غزالی نے یونانی علوم میں مہارت تامہ حاصل کی تھی، خود دور آخر میں درس نظامی کے نام سے جو تعلیمی نظام قائم کیا گیا تھا وہ بھی دین و دنیا کی غلط تفریق سے خالی تھا۔ دین و دنیا اور قدیم و جدید کی تفریق وہ بدعت ہے جو مسلمانوں کے نظام ثقافت مدرسے میں بہت بعد میں سرایت کر گئی ہے اور اس نظام کے پروردہ علماء اور فضلاء نے زندگی کے کشت زار کو سمجھنے کے لائق ہوتے ہیں اور نہ کشت زار کو چشمہ حیواں سے سیراب کرنے کے قابل۔ وہ ایک خول میں بند رہتے ہیں۔ مدارس کے ذمہ داروں کا ذہن اتنا محدود ہو جاتا ہے کہ نظام مدرسے اور ثقافت کی تشکیل جدید کی باتیں انہیں برا فرہ خستہ کر دیتی ہیں۔ وہ فقہی مویشیوں کو ہی اصل علم سمجھتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے کام پر (جو یقیناً نیک اور اچھا کام ہوتا ہے) مطمئن اور قانع رہتے

ہیں۔ ستاروں سے آگے کسی جہاں کا نہ تو علم نہیں ہوتا ہے اور نہ وہاں تک پہنچنے کا ان کے دل میں کوئی جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ ان کی نگاہ محدودان کا ثقافتی دائرہ محدود تر ہوتا ہے۔

مولانا علی میاں ندویؒ میری دانست میں وہ پہلے عالم دین ہیں جنہوں نے علم کی دینی اور دنیوی تفریق کی مخالفت کی ہے اور علم کو ایک اکائی قرار دیا ہے (ملاحظہ ہو مولانا کی تقریر، کتاب دعوت فکر و عمل) یہ حرف راز جو مولانا کی زبان سے نکلا مدرسہ کے حلقہ میں حرف مسموع نہ ہو سکا۔ مدرسہ کے اصاغر سے لے کر اکابر تک سب دینی اور دنیوی جدید اور قدیم کی تقسیم کے قائل رہے۔ چشمہ حیوان سے پانی لینے اور زندگی کے کشتزاروں میں ڈالنے کا مولانا علی میاںؒ کا پیغام دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم اور اس طرز کے مدارس کے عالی مقام ذمہ داروں نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا، ان حضرات نے مولانا کے احترام میں کوئی کمی نہیں کی۔ تبلیغی جماعت کے بانی اور دیگر ذمہ دار بزرگوں کا تعلق بھی دیوبند کے مدرسہ فکر سے تھا۔ یہ سب لوگ مولانا علی میاںؒ کا بہت احترام کرتے تھے لیکن کسی کے پاس وہ گوش حقیقت نیوش نہ تھا جو مولانا کی باتوں کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے تیار ہو جاتا۔ مولانا نے جن بزرگوں کو اپنا روحانی مربی اور مرشد بنایا وہ سب مولانا کے علمی تصنیفی عظمت کے قائل اور ان کی عالی نسبتی کے معترف تھے اور ان کی سیرت و شرافت اور روحانیت و اخلاق سے آگاہ تھے۔ وہ مولانا کے تابندہ افکار سے بھی آشنا تھے۔ لیکن یہ آشنائی قبول حق اور کسی تبدیلی اور انقلاب فکر کا پیش خیمہ نہ بن سکی۔ نظام تعلیم وہی رہا سوچنے کا اسلوب اور انداز جوں کا توں قائم رہا۔ جمود و تعطل میں کوئی کمی نہیں آئی اور انسانیت کی قیادت سے کنارہ کشی اسی طرح باقی رہی، زندگی اور زمانہ کا دھارا اسی طرح بہتا رہا اور علماء اس میں کسی تبدیلی سے قاصر رہے۔ مولانا کی بات اگر سنی جاسکتی تھی تو مدرسوں اور تبلیغی جماعت کے دائروں میں نہیں بلکہ جماعت اسلامی کے حلقوں میں اور جدید دانش گاہوں میں۔ ان حضرات کا ذہنی افق نسبتاً زیادہ وسیع تھا۔ لیکن مولانا مدارس کے حلقوں ہی سے زیادہ قریب تھے کیوں کہ مولانا کے نزدیک بھی



اور دوسرے حضرات کے نزدیک بھی مولانا مودودیؒ اور ان کی جماعت کے لوگوں میں روحانیت کی اور تصوف و سلوک کی کمی رہ گئی تھی۔ دنیا کی امامت اور قیادت کے سلسلہ میں مولانا مودودیؒ کا نقطہ نظر مولانا علی میاںؒ کے نقطہ نظر کے مطابق تھا بلکہ اس میں تھوڑا غلو بھی ہو گیا تھا اور انہوں نے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں کی تشریح بھی اسی کے زیر اثر کر ڈالی تھی۔ جدید دانشوری کے اس حلقہ کے پاس کشتی موجود تھی لیکن پتواریں خامی تھی یعنی تقویٰ اور روحانیت میں نقص تھا اس لئے مولانا کے نزدیک ساحل مراد تک پہنچنا اس کشتی کے ذریعہ ممکن نہ تھا مزید یہ کہ اس حلقہ کے پاس تربیت کے لئے علمی معیار کے مدرسے بھی زیادہ نہ تھے جن کی حیثیت مولانا کی نگاہ میں اسلام کے قلعوں کی تھی۔ مولانا علی میاںؒ کے لئے دوسری مشکل یہ تھی کہ جن بزرگوں سے اور مدارس کے جن حلقوں سے وہ قریب تھے وہ حدیث و فقہ کے روایتی انداز کے ماہر تو ضرور تھے لیکن ”کشت زار“ کے بارے میں ان کی واقفیت بہت زیادہ کمزور اور برائے نام تھی اور اس بارے میں ان کی فکری بصیرت کی دیگ کے سارے چاول کچے رہ گئے تھے۔ ان کے پاس وہ کشتی ہی نہ تھی جو ساحل تک پہنچا دیتی۔

اب رہی بات ندوۃ العلماء کی جس کی سربراہی خود مولانا علی میاںؒ کے ہاتھ میں تھی۔ ندوہ نے اپنی تاریخ میں وہ صلاحیتیں طلبہ میں ضرور پیدا کر دی تھیں کہ شائستہ شگفتہ اور سلیس اردو میں علمی اور اسلامی اور تاریخی موضوعات پر تصنیف اور تالیف کا کام کریں۔ ندوہ نے وہ صلاحیت بھی پیدا کر دی تھی کہ وہاں کے بہت سے فارغین عربوں کو خطاب کر سکیں اور ان کا مقام یاد دلا سکیں لیکن مغربی ملکوں کے لئے ایسے باصلاحیت علماء نہیں پیدا ہو سکے جو ان کی زبان میں اسلام کی دعوت دے سکیں اور جس کا خواب علامہ شبلیؒ نے دیکھا تھا۔ ندوۃ العلماء کے نصاب میں مزید اصلاح و انقلاب کی ضرورت تھی جو بوجہ نہ ہو سکی۔ عربی کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھانے کی ندوہ کی تحریک دیوبند نے قبول کر لی۔ دیوبند اور اس طرز کے اداروں سے بھی عربی زبان کے لکھنے والے پیدا ہونے لگے۔ لیکن وہ علماء نہ ندوہ سے پیدا ہو سکے اور نہ دیوبند سے جو یورپ اور امریکہ



مکے لوگوں کو خطاب کر سکیں اور جن کی آواز مغرب کے ایوانوں سے ٹکرائے اور وہاں کے رہنے والوں کے دلوں میں ارتعاش پیدا کر دے، خود اندرون ملک غیر مسلموں کے تعلیم یافتہ حلقوں میں علماء ابلاغ و ترسیل کی زبان سے محرومی کی وجہ سے اجنبی بن کر رہ گئے۔ مدارس سے فارغ ہو کر جو لوگ جدید دانش گاہوں میں گئے وہ عربی اردو اور فارسی کے ہو کر رہ گئے وہ خود زمانہ کے تقاضوں سے بے خبر رہے وہ غیر مسلموں میں کیا کام کرتے۔ خود مسلمانوں کے درمیان بھی ان کی خدمت کا کوئی قابل ذکر ریکارڈ نہیں ہے۔ یہ بے چارے چند پروفیسر حضرات ہمیشہ احساس کمتری کے شکار رہے، ان میں بہت شاذ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کو عربی اور اسلامی علوم سکھانے کی فکر کی ہو۔ دین کی خدمت کا کام بحیثیت مجموعی، مسلمانوں کے دائرہ میں صحیح، دینی مدارس کے علماء ہی نے کیا، کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے۔“

نہ صرف ہندوستان میں بلکہ عالمی سطح پر مسلمانوں کا قیادت میں کوئی رول نہیں ہے۔ ایجادات اور انکشافات کی دنیا میں اور نئے نئے تصورات اور نظریات کے افق پر دور دور تک ان کا کوئی نام نہیں ہے۔ علماء عالم انسانیت کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں۔ اور اس کی وجہ نظام تعلیم کی ثنویت ہے اور یہ ثنویت نظام فکر کی غلطی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ جب تک دین کے بارے میں یہ تصور باقی رہے گا کہ وہ صرف عاقبت بخیر ہونے کا ذریعہ ہے۔ اس کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور اگر دنیا کی قیادت اور قوموں کی امامت دوسروں کے ہاتھ میں رہے تو یہ کسی رنج و فکر کی بات نہیں تو پھر کبھی عزت اور طاقت ہاتھ نہیں آسکتی ہے۔ دین کا سیاست سے کیا رشتہ ہے اس کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے سیرت النبی کے ساتویں حصے کا مطالعہ ضروری ہے جس کا مقدمہ مولانا علی میاں کے قلم سے ہے۔ جب تک آیت عبادت اور آیت خلافت دونوں کو سامنے رکھ کر نظام فکر، نظام تعلیم اور نظام عمل کی اصلاح نہیں ہوگی محرومی اور پسماندگی سے نجات نہیں حاصل ہو سکے گی۔ خلافت ارضی کا تعلق دنیا کے انتظام و انصرام اور اس کے لئے صلاحیتوں کے حصول سے ہے۔ بقائے ذات اور

اثبات ذات ایک مذہبی تصور ہے، کیوں کہ زندگی کا مقصد ہر میدان میں حسن عمل ہے۔ ”لیلوکم ایکم أحسن عملاً“۔ افسوس یہی ہے کہ دین کے روایتی تصور میں حسن عمل کا مطلب خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات رہ گیا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ حسن عمل کے معنی اول اطاعت احکام ہیں لیکن تعمیر جہاں اور زندگی کے اختیار کردہ میدان میں پر فلشن یعنی مہارت عمل بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے اور اسی لئے آیت کے فوری بعد پر فلشن یعنی کمال حسن کا تذکرہ آیا ہے، آسمانوں کی وسعت اور اس کی مانگ میں چمکتی ہوئی کہکشاں اور اس کی قباء پر جگمگ کرتے ہوئے ستاروں کی تابانی یہ جمال و کمال سب کچھ انسان کو ہر کام میں حسن عمل کی اور جمالیاتی قدروں کی رعایت کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ حسن عمل کا تعلق دنیا کے نظم و نسق اور در بست اور تسخیر فطرت سے بھی ہے۔ یہ بات سورہ انعام کی آخری آیت سے بھی ثابت ہے جس میں حسن عمل کو خلافت ارض سے مربوط کیا گیا ہے، کہا گیا ہے کہ ”اور اسی نے تم کو نائب کیا زمین میں اور بلند کر دیئے اس نے تمہارے درجے ایک پر ایک، تاکہ آزمائے تم کو ان صلاحیتوں میں اور استعداد لیاقت میں جو اس نے تم کو عطا کی ہیں“۔ ایک آیت میں حسن عمل کی تلقین کے ساتھ خلافت ارضی کا تذکرہ بھی ہے۔ اگر خلافت ارضی کا تعلق کچھ بھی مقام انسانیت سے اور مقصد انسانیت سے ہے تو ہمارے نظام تعلیم اور نظام ثقافت کو اس سے ہم آہنگ ہونا چاہئے چونکہ کائنات کے انتظام میں اور تسخیر فطرت میں گونا گوں صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف قسم کی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ان ہی صلاحیتوں کے ذریعہ انسان کے حسن عمل کا امتحان ہوتا ہے۔ مختلف قسم کی صلاحیتوں کو جلا دینے کے لئے علم ضروری ہے۔

قرآن و سنت میں جہاں جہاں حصول علم کی تلقین ہے وہاں علم سے مراد بس علم ہے دینی اور دنیوی علم کی تفریق کے بغیر۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جو علم سکھایا تھا وہ اشیاء اور ان کے خواص کا علم تھا ”علم آدم الاسماء کلھا“ سائنس اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی نے حضرت داؤد کو زرہ سازی کا علم عطا کیا تھا۔ ”وعلمناه صنعة لبوس“ اس دور کی انفارمیشن ٹکنالوجی، ٹیلی کمیونیکیشن اور انجینئرنگ بھی دائرہ علم میں داخل ہیں، یہ کہنا غلط ہے کہ ان علوم کا تعلق دین سے نہیں۔ علم کے ذریعہ ہی حسن عمل کا ظہور ہوتا ہے۔ دنیا میں حسن عمل کا اثبات ہر میدان میں انتظامی اور تنظیمی صلاحیتوں سے ہوتا ہے اور ان صلاحیتوں کا ظہور اثبات ذات کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ فرار سے اور خلوت گزینی سے اور ذمہ داریوں سے دست کشی اور گریز سے۔ جس کائنات کے بنانے میں لاکھوں برس صرف ہوئے ہوں ابتداء سے انتہا تک جس کی تخلیق کے ہر مرحلہ میں خالق کائنات کا دست تصرف کار فرما رہا ہو کیا وہ اسی لئے ہے کہ اسے کافروں، مشرکوں اور خدا بے زار لوگوں کے تصرف میں دے دیا جائے کہ اس عظیم الشان تخلیق سے جس طرح چاہیں کھیلیں اور جس طرح چاہیں اسے برباد کریں اور حق کا علم بلند کرنے والوں پر جتنا ظلم چاہیں روا رکھیں اور اپنی اسلحہ سازی اور ٹکنالوجی میں برتری کے ذریعہ مسلمانوں کے جس ملک پر چاہیں قبضہ کر لیں۔

مسلمانوں کا کام صرف مسجدوں میں نماز پڑھنا اور رمضان کے مہینہ میں روزے رکھنا رہ جائے۔ اور عالم دین کا کام منبر پر بیٹھ کر عبادات کی تلقین کرنا ہو اور عبادت کا مفہوم بھی اس کی ناقص نظر میں اپنی تمام وسعتوں کو کھو چکا ہو۔ انتظام اور حکومت میں اور سائنس کی ترقیوں میں نہ اس کا کوئی حصہ ہو اور نہ عمل دخل۔ جب حج کرنا ہو تو کسی شرم کے بغیر امریکہ کے بنائے ہوئے ہوائی جہازوں پر بیٹھ کر جدہ پہنچ جائیں اور جاپان کی بنی ہوئی گاڑیوں میں بیٹھ کر جدہ سے مکہ آجائیں اور ہمیں ذرا بھی احساس نہ ہو کہ ہم اپنی عبادتوں میں بھی کس قدر دوسروں کے محتاج اور دست نگر ہو چکے ہیں۔ وائے ناکامی کہ اب متاع کارواں باقی نہیں اور کارواں کے دلوں میں احساس زیاں تک باقی نہیں۔ حالانکہ حدیث ”الدنيا خلقت لكم“ سے ثابت ہے کہ اللہ کے اطاعت گزار فرماں بردار بندوں کا حق اس دنیا پر نافرمان اور باغی بندوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے دنیا کے دروبست کی صلاحیت بھی اللہ کے فرماں بردار بندوں میں زیادہ ہونی چاہئے۔ انسان کو



آخرت کے لئے بنایا گیا ہے لیکن دنیا کو مزرع آخرت کہا گیا ہے۔ مزرع پر محنت کے بغیر آخرت کی فصل نہیں کاٹی جاسکتی ہے۔ مزرع سے مراد صرف عبادت گاہ نہیں ہے جہاں عبادت اور تسبیح و تلاوت میں مشغول رہا جائے بلکہ پوری زمین ہے جس کا انسان کو خلیفہ بنایا گیا ہے۔ حسن عمل کے ذریعہ اور خدا کی اطاعت کے ذریعہ خلد کو خدا کے بنائے ہوئے اس خاکدان ارضی پر اتار لیا جاسکتا ہے یعنی اسے امن و سکون کا گہوارہ بنایا جاسکتا ہے۔ اور یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اسلام امن و سلامتی کا دین ہے۔ لیکن اس خاکدان ارضی پر مسلمانوں کا استحقاق ختم ہو چکا ہے اس لئے کہ انتظامی صلاحیت کی اہلیت انہوں نے کھودی ہے، وہ اپنے ملکوں کا دفاع کرنے کے لائق بھی نہیں رہ گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ دنیا جس کی تخلیق اہل ایمان کے لئے ہوئی تھی اس کائنات پر دنیائے اغیار کے سائنس دانوں اور سیاست دانوں کا قبضہ ہے اور اقتدار ہی نہیں طاقت اور اس کے تمام ذرائع ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں ”یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر“ امریکہ اور یورپ پورے طور پر جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح اور جن کے لئے اسلحہ سازی کا حکم آسمان سے نازل ہوا تھا وہ بالکل خالی ہاتھ اور بے دست و پا ہیں۔ اور علماء کا یہ خیال حیرت انگیز ہے کہ جدید علوم کا تعلق دین سے نہیں۔ اقتدار، طاقت اور عزت نفس کی باز آفرینی ثقافت کی تشکیل جدید کے بغیر نہیں ہو سکتی ہے اگر افغانستان اور عراق کو کھودینے کے بعد بھی ہمارے مردہ دلوں میں زندگی کی کوئی حرکت نہیں پیدا ہوتی ہے تو ہمیں صور اسرافیل کا انتظار کرنا چاہئے جس کے بعد تمام مردے جی اٹھیں گے اور عدل کی میزان قائم کی جائے گی اور پھر ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ کس کا نقطہ نظر درست تھا اور کس نے جھوٹ اور انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دی تھیں۔ سورہ حدید کی ایک آیت میں کئی اہم چیزوں کی طرف اہل ایمان کو متوجہ کیا گیا ہے اور ان چیزوں کو ہم اپنے نظام تعلیم کی بنیاد بنا سکتے ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر فکر مدرسہ کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ اس آیت میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱)۔ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو نشانیاں لے کر اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ

کتاب۔ اس فقرہ میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ہم کتاب و سنت کو اپنے نظام تعلیم اولین بنیاد بنائیں۔ (۲)۔ اور میزان تاکہ لوگ قائم رہیں عدل پر۔ میزان سے مراد عادلانہ قوانین ہیں اور پوری شریعت کاملہ بھی مراد ہے۔ قوانین کے لئے قوت نافذہ بھی ضروری ہے اس لئے قوت نافذہ کے حصول کی کوشش مشروع ہے۔ (۳)۔ اور ہم نے نازل کیا لوہا اس میں بڑی طاقت ہے اور بے شمار فائدے ہیں انسانوں کے لئے۔ یہاں لوہا سائنس ٹکنالوجی اور انجینئرنگ کے لئے استعارہ ہے۔ لوہے کے ذریعہ ہی نہ صرف تلوار بلکہ تمام جدید اسلحہ تیار ہوتے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کائناتی علوم اور تشریحی علوم دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ یعنی کتاب و سنت اور فقہ کی طرح سائنس اور ٹکنالوجی کا علم بھی دین کا علم ہے کیوں کہ جس خدا نے انسانوں کے لئے پیغمبر بھیجے اور کتاب نازل کی اسی نے انسانوں کی فلاح کے لئے لوہا نازل کیا۔ پھر قرآن کی دوسری آیت میں سامان جنگ کی تیاری یعنی ٹکنالوجی کے حصول کا حکم ہے۔ جب یہ خدا کا حکم ہے تو اس سے تعلق رکھنے والے علوم حقیر قسم کے دنیوی علوم کیوں کر ہوئے۔ چونکہ مدارس کے طلبہ سائنس کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوتے اس لئے ثابت ہوا کہ مدارس کا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم غیر متوازن ہے اور اس میں توازن پیدا کرنے کی شدید ضرورت ہے اور توازن پیدا کرنے کے لئے فکر مدرسہ کی تشکیل جدید کی ضرورت ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ مدارس دینیہ میں سائنس اور ٹکنالوجی کے تمام مضامین پڑھائے جائیں۔ لیکن نقطہ نظر متوازن ہو تو نصاب تعلیم میں اور نظام میں تبدیلی بہر حال کرنی ہوگی۔ اتنا تو بہر حال ممکن ہے کہ طلبہ کو علوم جدیدہ سے بنیادی طور پر متعارف کروایا جائے۔ طلبہ اور اساتذہ کا نقطہ نظر درست کر دیا جائے اور زمانہ کا شعور پیدا کر دیا جائے اور فراغت کے بعد ان کو تبدیل شدہ ماحول میں بھی بغیر کسی احساس کمتری کے مؤثر انداز میں کام کرنے کے لائق بنایا جائے۔ اس کے لئے انگریزی زبان پر اچھی دسترس حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ انگریزی زبان کو نصاب کا جز بنایا جائے۔ انگریزی زبان کے ساتھ کسی مقامی زبان میں



بھی مہارت پیدا کی جائے۔ انگریزی زبان اور ملک کی مقامی زبان میں اسلامی موضوعات پر تقریر کرنے کی مشق کرائی جائے۔ ایسے مقررین پیدا کئے جائیں جو بہترین انگریزی میں اسلامی موضوعات پر یا اسلام کی روشنی میں حالات حاضرہ پر خطاب کر سکیں۔ کچھ طلبہ مقامی زبان میں تقریروں میں مہارت پیدا کریں۔ معلومات کی وسعت کے ساتھ تحریر و تقریر کی مشق بہت ضروری ہے اس کے بغیر دعوت و تبلیغ اور ابلاغ و ترسیل کا کام انجام نہیں دیا جاسکتا ہے۔

مدرسہ کے نظام اور اس کی روح کو سمجھنے کے لئے مولانا علی میاں کی تقریر میں ”چشمہ حیواں“ اور کشت زار“ کے الفاظ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلاشبہ جن علوم کو چشمہ حیواں کہا گیا ہے وہ مسلمانوں کا سب سے قیمتی سرمایہ اور متاع گرانمایہ ہیں۔ اسی کے ساتھ کشت زار کا استعارہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ فکر مدرسہ کی تشکیل کے لئے دونوں کا پورا پورا لحاظ بہت ضروری ہے۔ زندگی کے کشت زار کو سمجھنے کے لئے اور ان سے روشناس ہونے کے لئے کم از کم یہ ضروری ہے کہ عصری رجحانات اور جدید سائنس کے نظریات پر مدرسوں میں توسیعی خطبات کا انتظام کیا جائے۔ توسیعی خطبات کے لئے بلا امتیاز مذہب و ملت ماہرین علوم کا انتخاب کیا جائے۔ نصاب تعلیم سے ہٹ کر مطالعہ کے لئے ایسی کتابوں کی فہرست بنائی جائے جن سے طلبہ کا ذہنی افق وسیع ہو اور اس مطالعہ کو یقینی بنانے کے لئے ان کا امتحان بھی لیا جائے۔

اس مضمون میں کہیں لہجہ اگر سخت ہو گیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مضمون نگار کو کسی مسلک یا مدرسہ کے خلاف کوئی کید یا ضد یا حسد ہے۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کی بربادی کا غم ہے جو قلم کو کبھی تیر و نشتر بنا دیتا ہے

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر  
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی



## معاصر دینی تعلیم اور عصر حاضر کے تقاضے

مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی ☆

اسلام نے تعلیم و تعلم، درس و تدریس اور علم و معرفت کے سلسلے میں جو احکامات دیے اور اس کی وجہ سے پڑھنے پڑھانے کا جو چلن اور رواج ہوا، اس نے دنیا کو جہالت کی تاریکیوں سے نکالا، قرآن کریم کے نزول کے ساتھ دور جہالت کا خاتمہ ہوا، مسلمان جہاں کہیں گئے علم کا چراغ روشن کیا، اور وہاں کی ضرورت کے اعتبار سے ایجادات و انکشافات میں ایسا حصہ لیا کہ بہت سارے علوم کے وہ بانی مبنی ہو گئے، یہ وہ دور تھا جب علم شاخ در شاخ نہیں ہوا تھا اور ایک فرد کے لیے ممکن تھا کہ وہ جامع معقول و منقول کی حیثیت سے سامنے آئے اور ملوک علوم و فنون میں اس کی گہرائی اور گیرائی سے بھرپور فائدہ اٹھا سکیں، اس زمانہ میں آج کی طرح علم دین و دنیا کی تقسیم نہیں تھی، اور ساری توجہ علم نافع کے حصول پر صرف کی جاتی تھی اور غیر نفع بخش علوم سے اللہ کی پناہ چاہی جاتی تھی، نفع بخش علوم کی حیثیت صدقہ جاری کی تھی اور مخرب اخلاق علوم کی طرف کوئی جانا پسند نہیں کرتا تھا۔

پھر زمانہ کی قدریں بدلنے لگیں، علوم میں تنوع پیدا ہوا، اور اس کا دائرہ بڑھتا چلا گیا، ایسے میں کسی ایک شخص کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ تمام علوم پر یکساں دسترس رکھے، اسی طرح اداروں کے لیے بھی سارے علوم اور ان کی شاخوں کو پڑھنا پڑھانا دشوار تر ہو گیا، اس صورت حال کی وجہ سے عملی طور پر مختلف علوم و فنون کے لیے الگ الگ ادارے وجود میں آنے لگے، تاکہ

☆ نائب ناظم امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ

ہر ادارہ اپنے موضوع پر پوری توجہ صرف کر سکے اور اس کے حاملین میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہو سکے، اس سوچ نے تخصصات کے اداروں کو وجود بخشا اور ہندوستان میں مدرسہ اور اسکول کا مفہوم الگ الگ ہو گیا، علماء اور دانشور کی اصطلاح وجود میں آئی اور دونوں الگ الگ علوم کے نمائندہ سمجھے جانے لگے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب دینی تعلیم کے لئے کثرت سے ادارے وجود میں آئے اور ان میں خالص مذہبی علوم کی تدریس ہونے لگی، یہاں کے فارغین نے دینی بنیادوں پر سماج میں کام شروع کیا، خدا بزار ماحول میں خدا شناسی کی ترغیب دی، انہوں نے ”اجرت“ کے بجائے ”اجر“ کی نیت سے کام کیا اور سماج و معاشرہ میں صالح قدروں کے فروغ کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی، مسلمانوں نے اس کی اہمیت کو کم اور غیروں نے زیادہ سمجھا وہ ان اداروں کو بدنام کرنے کی منظم جدوجہد میں لگ گئے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، ایک بڑا طبقہ دوسرے راستے سے مدارس کو بدنام کرنے پر تل گیا اور انہوں نے معاصر دینی تعلیم کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا نعرہ لگایا اور اس زور و شور سے لگایا کہ یہ عنوان بھی اہل علم و دانش کے لئے مرکز توجہ بن گیا، اس مضمون میں ہم اس حقیقت کا مختصر جائزہ لیں گے کہ آج کے دور میں جو دینی تعلیم دی جا رہی ہے، اسے عصر حاضر کے تقاضوں سے کس حد تک ہم آہنگ کر سکتے ہیں اور اس میں کتنی گنجائش ہے۔

معاصر دینی تعلیم کو ہم تین مراحل میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک بنیادی دینی تعلیم، دوسرے ثانوی اور تیسرے اعلیٰ دینی تعلیم، تینوں مراحل میں عصر حاضر کے تقاضے الگ الگ ہیں۔ سب سے پہلے ہم بنیادی دینی تعلیم کو لیتے ہیں، اس مرحلہ میں بچوں کو بنیادی دینی تعلیم عموماً مکاتب اسلامیہ کے ذریعہ فراہم کرائی جاتی ہے، یہ مکاتب مسجد کے ماتحت بھی چلتے ہیں اور کسی ادارے اور تنظیم کے جزوی یا کلی تعاون سے بھی، ان کے اوقات کہیں صبحی اور کہیں مسائی ہوتے ہیں، ان کے علاوہ

بنیادی دینی تعلیم کے درجات بھی تقریباً سبھی مدارس میں قائم ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ یہی مکاتب دور دراز کے دیہاتوں میں دینی شعور کی بقا اور قرآن و نماز سمجھنے سمجھانے میں کلیدی رول ادا کر رہے ہیں، ہمارا دانشور طبقہ ان کے طریقہ تدریس، مواد تدریس اور آلات تدریس کے حوالے سے سوالات اٹھاتا رہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان تعلیمی اداروں میں اسٹکچر کی کمی ہے، پرانا طریقہ تدریس رائج ہے، اور بچوں کو آج بھی جسمانی تعذیب کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان میں پڑھانے والے اساتذہ کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ بیش تر جگہوں پر قرآن کریم صحت کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کا رواج کم ہے، نورانی قاعدہ پر ہو رہی محنت اور مختلف اداروں کی طرف سے تدریب المعلمین کے کیمپ کے ذریعہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ان اداروں کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے معیار تدریس کو بڑھایا جائے، طریقہ تعلیم کو پرکشش بنایا جائے، لیکن ہمہ گیر تعلیمی مہم کے پروگراموں کی طرح گاجا کر نہیں، بلکہ درس و تدریس کی سنجیدگی کو بحال رکھتے ہوئے، ایسے اقدام کیے جائیں، جس سے طلبہ کھیل سے زیادہ تعلیم پر توجہ دینے لگیں، اس کے لئے وسائل فراہم کئے جائیں اور اساتذہ ایسے رکھے جائیں جن کی اخلاقیات سے طلبہ کسب فیض کر سکیں، طلبہ کے عادات و اطوار کو صحیح رخ اور صحیح سمت دینے کے لیے یہ بہت اہم زمانہ ہے، اس عمر میں تعلیم کے ساتھ تربیت کی خاص ضرورت ہے، قرآن کریم میں بار بار تلاوت کتاب کے ساتھ ترکیہ کا ذکر کر کے یہی پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے، اس لئے اس مرحلہ میں بچہ کو قرآن کریم صحت کے ساتھ پڑھایا جائے، کلمہ، نماز اور دین کی بنیادی تعلیم پر پوری توجہ مرکوز کی جائے اور اس کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے، کذب بیانی، چغل خوری، لعن طعن، گالی گلوچ، ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے کا مزاج اسی عمر میں بنتا ہے، تھوڑی سی توجہ سے طلبہ کے اندر اخلاق کریمانہ کا مزاج پیدا کیا جاسکتا ہے، اس مرحلہ میں ضرورت کے مطابق ٹیچنگ ایڈ وغیرہ کا بھی استعمال کرنا چاہئے۔



لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے، صلاحیت کے ساتھ صلاحیت پر بھی نظر رکھی جائے اور انہیں بقدر کفایت و ضرورت وظیفہ یا تنخواہ دیا جائے، تاکہ وہ ذہنی سکون کے ساتھ اپنی اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں، عموماً دیکھا یہ جارہا ہے کہ دیہاتوں میں امام و مؤذن اس شخص کو بنا دیا جاتا ہے، جو کسب معاش کے دوسرے ذریعوں پر قادر نہیں ہوتا، مؤذن نہ تو اذان صحیح سے دے پاتا ہے اور نہ امام، نماز سے متعلق مسائل سے کلی طور پر واقف ہوتا ہے، انہیں حضرات کے ذمہ تعلیم و تعلم کا کام بھی سپرد کر دیا جاتا ہے، اس لئے بچوں میں قرآن کریم صحت کے ساتھ پڑھنے کا مزاج نہیں بنتا اور ان کے اخلاق و عادات بھی اساتذہ کی بے عملی سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

بعض کانونٹ اور پرائیوٹ تعلیمی اداروں میں دینیات کے نام پر ایک گھنٹی ہوتی ہے، اس ایک گھنٹی میں خلوص کے ساتھ کام کیا جائے تو بہت کچھ ممکن ہے، لیکن عموماً یہ گھنٹیاں نام کی ہوتی ہیں، ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ گارجین جو بنیادی دینی تعلیم کے سلسلے میں زیادہ حساس ہیں، اس حوالہ سے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاسکے اور ان کے بچے بھی ادارہ کو مل سکیں، اس تاجرانہ ذہنیت کے باوجود اگر اساتذہ اس گھنٹی میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں تو ان اداروں میں بھی قرآن کریم اور کلمہ نیز ضروری ادعیہ ماثورہ یاد کرائے جاسکتے ہیں اور تربیت کے لئے بھی فضا ساز کار بنائی جاسکتی ہے۔

دوسرا مرحلہ ثانویہ کا ہے، اسکول کانونٹ وغیرہ میں اس مرحلہ میں دینیات کا تصور نہیں ہے، اس مرحلہ میں معاصر دینی تعلیم کا سارا نظام مدارس اسلامیہ میں سمٹ جاتا ہے، نظامیہ مدارس میں یہ مرحلہ عربی اول سے شروع ہوتا ہے اور عربی پنجم، ششم تک چلتا ہے، اس مرحلہ میں ہمارے یہاں عربی قواعد کی تدریس، پر خاصی توجہ صرف کی جاتی ہے نحو و صرف کی بنیادی کتابیں اور شروحات تک زیر تدریس آتی ہیں لہذا غور و فکر کی بھی کچھ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اس مرحلہ میں

طریقہ تدریس پر خاص توجہ کی ضرورت ہے، ہو یہ رہا ہے کہ طلبہ میں کتاب فہمی سے زیادہ رٹنے رٹانے پر توجہ دی جاتی ہے، کہنا چاہئے کہ تدریس کا انداز، فن کی تدریس کا نہیں، کتاب کی تدریس کا ہوتا ہے، یہی حال دینیات سے متعلق دوسری کتابوں کا ہوتا ہے، کتابوں میں جو مثالیں دیدی گئیں اور جو جزئیات ذکر کر دی گئیں، وہی طلبہ کو یاد ہوتی ہیں، اس طرز پر دوسری مثالوں اور دوسری جزئیات کے تلاش کی صلاحیت طلبہ میں پیدا نہیں ہوتی یا بہت کم پیدا ہوتی ہے، اس مرحلہ میں ضرورت ہے کہ فن کی تدریس کا مزاج بنایا جائے اور طلبہ میں ایسی صلاحیتیں پیدا کر دی جائیں کہ ان میں دقت نظر بھی ہو اور وسعت نظر بھی۔

اس مرحلہ میں عصری تقاضے کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہیں عصری علوم کی تعلیم دی جائے، عصری علوم کے بعض مبادیات کا پڑھانا مفید معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمیں یہاں یہ تفریق ضرور ملحوظ رکھنی چاہئے کہ ہمارا مقصد عصری علوم کی تدریس نہیں، علوم دینیہ کی تدریس ہے، یہ مدارس اسی کام کے لئے ہیں، ان کا تعلیمی مزاج، منہج اور مقصد متعین ہے، عصری علوم کو اس مرحلہ میں وسائل کے طور پر تو داخل کیا جاسکتا ہے، مقاصد کے طور پر نہیں، مثلاً پہلے ہم کانڈے کے قلم سے لکھتے تھے، پھر روشنائی والا قلم آیا، پھر مارکیٹ میں لیڈ پین استعمال ہونے لگا اور اب ان کے ساتھ کمپیوٹر بھی لکھنے کا ایک ذریعہ بن گیا ہے، یقیناً ہمیں اس کو سیکھنا چاہئے، بچوں کو سکھانا چاہئے، فقہ کے جن ابواب و مباحث کو سمجھنے کے لئے آج کی جدید اصطلاحوں کے سمجھنے کی ضرورت ہے اور جن کے بغیر عصر حاضر کے مسائل کی تفہیم، تشریح و تطبیق ممکن نہیں ہے، ان کو ضرور پڑھا دینا چاہئے؛ لیکن بقدر ضرورت ہی، اس سے آگے نہیں، اس سے آگے بڑھنے پر بات مقصد تک پہنچ جائے گی۔

مدارس کی کثرت اور بہتات کے چرچے کے باوجود راجند سنگھ سچر کمیٹی کی رپورٹ یہ بتلاتی ہے کہ مسلم سماج کے پڑھنے والے بچوں میں صرف چار فی صدی مدارس کا رخ کرتے ہیں، ان چار فی صد بچوں کو دینی علوم میں تخصص اور اسپیشلائزیشن کے لئے مختص کرنا چاہئے؛ تاکہ سہلج

کی دینی اور مذہبی ضرورتیں ان فارغین کے ذریعہ پوری ہو سکیں، ان طلبہ کو بھی دوسرے علوم پڑھانے میں لگا دیئے گئے تو یہ طلبہ نہ دینیات کے رہیں گے اور نہ عصری علوم کے، جس کا تجربہ مدرسہ عالیہ، بہار اسٹیٹ مدرسہ اکرمانیشن بورڈ اور عربک پشین بورڈ الہ آباد کے فارغین کے ذریعہ ہمارے سامنے آیا ہے اور آتا رہتا ہے، ہمارے تجربات نے عصری علوم کے ساتھ مدارس کی تعلیم کے غیر مفید اور غیر موثر ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، یقیناً تجربات بار بار کیے جاسکتے ہیں، لیکن جب ہم میڈیکل کالج سے انجینئر اور انجینئرنگ کالج سے ڈاکٹر پیدا کرنے کی کسی تجویز کو پاگل پن اور ذہنی دیوالیہ پن سے تعبیر کرتے ہیں تو مدارس سے ہی یہ کیوں چاہا جا رہا ہے کہ وہ عصری تقاضوں کے نام پر اپنے تعلیمی اداروں کے مزاج اور مواد کا گلہ گھونٹ دیں، اور مدارس سے نکلنے والے لوگ دوسرے علوم میں بھی کامل ہو کر نکلیں۔

اس موقع پر تاریخ کے حوالے سے مسلم سائنس دانوں اور دوسرے علوم کے لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے، عصری اور دینی تعلیم کی تفریق سے ملت کے دو نیم ہونے کی بات کہی جاتی ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت کا جائزہ لے کر یہ بات کہی جاتی ہے کہ علم کی دوئی کو مٹانا چاہئے، یہ سب بجا ہے؛ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم جس زمانے کی بات کرتے ہیں، اس زمانہ میں علم کی اتنی شاخیں نہیں پھوٹی تھیں، اب تو ایک موضوع سے پچاسوں ایسی شاخیں نکل آتی ہیں، جن میں اسپیشلائزیشن (Specialisation) کیا جاتا ہے، اور کسی ایک شخص کے لئے ایک ہی موضوع کی مختلف شاخوں میں مہارت پیدا کرنا، ناممکن سا ہو رہا ہے۔

مدارس کے نظام تعلیم و تربیت کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے زوردار دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ اس طرح ان کا معاشی نظام مضبوط ہوگا اور سماج میں ان کا مقام و مرتبہ فزوں تر ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں محض بہلاوے کی ہیں، جن لوگوں نے مذہبی علوم میں دستگاہ پیدا کی ان کی معاش بھی مضبوط ہے اور بغیر عصری علوم کے پڑھے ہوئے ان کا مقام و مرتبہ

جو سماج میں ہے اسے کھلی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے، جو لوگ کمزور رہتے ہیں، ان کی معاش کہیں سے پڑھنے کے باوجود کمزور ہی رہتی ہے، بلکہ اگر سروے کرایا جائے تو عصری علوم کے حاملین میں بے روزگاروں کا تناسب مدارس کے فارغین سے کئی گنا زیادہ نظر آئے گا۔

اس لئے اس مرحلہ میں معاصر دینی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ عصر حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہو، تو زبان کی حد تک ہندی انگریزی اور کمپیوٹر کی تدریس کو داخل کر لینا چاہئے، جو پہلے ہی سے بہت سارے اداروں میں داخل ہیں، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء اور دیگر اداروں میں اس کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے، اس سے زیادہ کسی چیز کا داخل کرنا عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح کے لئے تو ٹھیک ہے، اس سے زیادہ کرنے سے معاصر دینی تعلیم کا رخ اور قبلہ ہی بدل جائے گا، ظاہر ہے جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

تیسرا مرحلہ اعلیٰ تعلیم کا ہے، اس مرحلہ میں کہنا چاہئے کہ دینی علوم کی اعلیٰ ترین کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں طریقہ تدریس میں تو عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے، فقہ، تفسیر حدیث اور عقائد کے درس میں آج کے معاملات آج کے حالات، دین پر کھڑے کئے جانے والے نئے سوالات اور اعتراضات پر سیر حاصل بحث کی جانی چاہئے تاکہ طلبہ آج کے لب و لہجہ میں ان اعتراضات کا دفاع اور سوالات کے جوابات پر قادر ہو جائیں، اس مرحلہ میں علم کلام کی جو قدیم کلامی بحثیں ہیں اور جن فرق ضالہ منحرفہ کا ذکر بار بار آتا ہے وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، آج ہمیں جن لوگوں کا سامنا ہے اور جس قسم کے سوالات دین و مذہب پر اٹھائے جا رہے ہیں، لادینیت کے فروغ اور خدا بیزار سماج کے لیے جو جدوجہد سرکاری، غیر سرکاری سطح پر کی جا رہی ہے، اس سلسلے میں ہمیں طلبہ کی رہنمائی کرنی چاہئے، اور ان کتابوں کا انتخاب کرنا چاہئے جو اس سلسلے میں مدد و معاون ہوں اور طلبہ کو اس کام کے لئے تیار کر سکیں۔

اس مرحلہ کی تعلیم یونیورسٹیوں میں بھی ہوتی ہے اور بعض میں مستقل شعبے دینیات اور



اسلامک اسٹڈیز کے کھلے ہوئے ہیں، ان میں بھی انہیں امور کو ملحوظ رکھنا چاہئے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، خلاصہ ان ساری بحثوں کا یہ ہے کہ معاصر دینی تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہئے لیکن ایسی ہم آہنگی نہیں جو مدارس اسلامیہ کے کردار اور مزاج کو بدل کر رکھ دے۔



## دینی مدارس کے فارغین میں مطلوبہ صلاحیتوں اور استعداد کی کمی کے اسباب

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی ☆

اس موضوع پر گفتگو میں سب سے پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ دینی مدارس کے فارغین سے کس قسم کی صلاحیتیں مطلوب ہوتی ہیں اور ان سے کس نوع اور سطح کی استعداد کی توقع کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دینی مدارس کے فارغین میں وہ صلاحیتیں نہیں پائی جاتی ہیں جو دینی نصاب کی تکمیل کے بعد اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ان سے متوقع ہے؟ ہم پہلے دوسرے سوال کو لیتے ہیں، کہ آج کا عنوان اس تسلیم و اعتراف کا غماز ہے کہ اب نئے فضلاء مدارس ان صلاحیتوں اور استعداد سے عاری ہو کر نکل رہے ہیں جن سے انھیں آراستہ ہونا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات علی الاطلاق بہ مشکل ہی تسلیم کی جاسکتی ہے کہ تمام فضلاء مدارس دینیہ میں مطلوبہ صلاحیتوں کا فقدان ہے، کیونکہ صلاحیتوں کا فرق اور استعداد میں تفاوت کسی بھی تعلیمی مظہر کی حقیقت رہی ہے۔ یہ بات ہر دور میں اور ہر نصاب کے اندر دیکھی جاسکتی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اعلیٰ صلاحیتوں کے حاملین کی تعداد اکثر و بیشتر کم ہوا کرتی ہے۔ اکثریت متوسط صلاحیت والوں کی رہا کرتی ہے۔ اور قدرے قلیل اس سے کمتر استعداد والوں کی رہتی

☆ اسٹنٹ پروفیسر اسلامیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ہے۔ اس عمومی صورت حال سے کوئی زمانہ شاید ہی خالی رہا ہے، اور دور حاضر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

اگر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ موجودہ دور کے دینی مدارس سے فارغ ہونے والے فضلاء کی صلاحیتوں اور استعداد کا کیا معیار ہے؟ وہ علوم دینیہ پر کتنی دسترس رکھتے ہیں؟ شرعی مضامین کے مآخذ کا مطالعہ کس حد تک ہے؟ قدیم مصادر سے استفادہ کی صلاحیت کتنی پیدا ہوئی ہے؟ عربی دانی اور عربی خوانی میں وہ کس سطح پر ہیں؟ علوم حکمت و فلسفہ سے وہ کہاں تک آشنا ہیں؟ اور عصری مضامین سے ان کی کتنی واقفیت ہے؟ کیونکہ یہ وہ مضامین ہیں جو کم و بیش ہمارے تمام دینی مدارس میں پڑھے پڑھائے جاتے ہیں۔ اور یہاں سے فارغ ہونے والے فضلاء کی صلاحیتوں اور استعداد کا جائزہ انہی مضامین کے تعلق سے لیا جانا مناسب ہے۔

اس حوالے سے اگر ہم دینی مدارس کے فارغین کی استعداد پر ایک گہری نظر ڈالیں تو اس بات سے انکار مشکل ہوگا کہ فارغین کی اکثریت میں مطلوبہ استعداد کی کمی پائی جاتی ہے۔ علوم دینیہ یعنی تفسیر و حدیث اور فقہ اسلامی جو ان کی تعلیم کا مرکزی محور ہیں، اور آٹھ سے دس سال تک کی وسیع تعلیم کا بڑا حصہ ان ہی مضامین کی تدریس و تفہیم میں خرچ کیا جاتا ہے۔ ان علوم پر دسترس حاصل کر لینے والے فارغین کی تعداد ایک اندازہ کے مطابق شاید دس فیصد سے زائد نہ ہو۔ بڑی اکثریت ان مضامین میں بھی افسوسناک حد تک کمزور صلاحیت کی حامل نکل رہی ہے۔ اور اس افسوسناک صورت حال کا اندازہ اس وقت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، جب وہ عربی زبان کی نصابی یا غیر نصابی کتابوں کی صحیح عبارت خوانی سے بھی قاصر ہوتے ہیں۔ عبارت فہمی تو اس سے آگے کا مرحلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مدرسہ کی سند فراغت دراصل علوم دینیہ کے کمرہ میں داخل ہونے کی کنجی ہے۔ یعنی ایک فارغ التحصیل گویا اب اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے طور پر شرعی مآخذ کا مطالعہ کر کے علم و تحقیق کے ناپیدا کنار سمندر سے لعل و گہر نکال سکے۔ لیکن جب فارغین کی اکثریت

اپنے شرعی مضامین کی نصابی سطح پر کمزور ہو تو ان سے یہ کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ شرعی علوم کے اولین اور اہم مصادر و مراجع کا مطالعہ کر سکیں گے۔ عصری مضامین سے واقفیت تو ان کے لئے ناقابل ذکر ہی امر ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم ان فارغین پر نظر ڈالیں جو آج کے دور انحطاط میں بھی قابل رشک صلاحیتوں اور اچھی استعداد سے آراستہ ہو کر نکل رہے ہیں، جن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی کہی جاسکتی ہے۔ تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ایک فاضل مدرسہ سے جو صلاحیت مطلوب ہے اس میں وہ کس معیار پر ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کی توقع کی جانی چاہئے کہ وہ شرعی علوم کی نصابی کتابوں پر اچھی نظر رکھتے ہوں گے، متداول شرعی مسائل کا انھیں علم ہوگا، ان کی عربی دانی بھی اس قدر ہوگی کہ وہ شرعی مآخذ و مصادر کا بطور خود مطالعہ کر لیں، اور جس حد تک انھیں عصری مضامین سے واقفیت کا موقع میسر ہو سکا ہوگا، انھوں نے ان میں بھی محنت کی ہوگی۔ ہماری بجا توقع ہے کہ فضلاء مدارس کی کم تعداد ہی سہی، لیکن ممتاز سمجھے جانے والے طلباء اپنی فراغت کے وقت ان مذکورہ صلاحیتوں سے آراستہ ہو جاتے ہوں گے۔

اب ہم ان دونوں قسموں کے فضلاء کی صلاحیتوں اور ان کے پس پشت کار فرما عوائل و اسباب پر ایک تنقیدی اور تجزیاتی نظر اس تمنائے ناچختہ کے ساتھ ڈالتے ہیں کہ یہ گفتگو کسی ذہن کو کرید اور کسی قدم کو ہمیز کر سکے۔

جہاں تک فارغین کی اکثریت کا معاملہ ہے، جو بہت زیادہ پختہ صلاحیتوں سے آراستہ نہیں ہو پا رہے ہیں، ایسے فضلاء کی ایک بڑی کھیپ ہر سال بڑے دینی مدارس سے فارغ ہو رہی ہے، انھوں نے یہاں اپنی عمر عزیز کا بڑا ہی قیمتی عرصہ گزارا ہوتا ہے، ایسا عرصہ جو نہ صرف ان کی سیرت و کردار کی پختگی کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، بلکہ ان کے مستقبل کی رخ بندی اور کار حیات کی تعیین و تشکیل میں بھی مؤثر عامل بنتا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ فارغین آٹھ دس



سالہ تعلیم کے بعد دین کے مبادی سے واقف ہو چکے ہوتے ہیں، حلال و حرام کے ضروری مسائل سے ان کے گوش آشنا ہو گئے ہوتے ہیں، دینی و مذہبی اصطلاحات اور قرآن و حدیث سے تعلق رکھنے والی ضروری باتوں، نیز سیرت نبویؐ اور عہد صحابہؓ کی تاریخ سے وہ کسی قدر شناسائی حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ یہ معلومات یقیناً بیش قیمت اثاثہ ہیں، یہ مطلوب زندگی اور سرمایہ حیات ہیں، یہ بلاشبہ وہ روشنی ہے جس کے بغیر زندگی تاریک اور منزل روپوش رہتی ہے۔ اس لئے ہم اس سرمایہ کو دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں، اور اس سے آراستگی کو اپنی ایسی متاع سمجھتے ہیں جس سے دستبرداری زندگی کی معنوی موت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک سوال ہمارے ذہنوں میں بار بار ابھرتا ہے، وہ یہ کہ کیا اس سرمایہ سے آراستگی کے لئے کم و بیش دس برس کا طویل عرصہ درکار ہے؟ اگر اس طولانی دورانیہ کے بعد فارغ التحصیل طالب علم علوم شرعیہ کے میدان میں داد تحقیق نہیں دے سکتا، عربی دانی اور عبارت فہمی کی ایسی قابلیت اس کے اندر نہیں پیدا ہوتی کہ وہ اسلامی کتب خانہ کے لالہ زار چمن کی سیر کر سکے اور خوش رنگ و خوش ذائقہ علمی پھلوں سے شاد کام ہو سکے، اور نہ ہی وہ علم و فضل کے اس مقام بلند پر فائز ہو سکتا ہے جو انسانیت کی راہ حیات کے لئے منارہ نور قرار پاسکے، تو ایسے سینکڑوں فارغین کے لئے یہ طویل عرصہ اپنے جواز کے لئے ہم سے ضرور جواب طلب کرتا رہے گا، اور اپنے مقصد کی شناخت کا ایک بڑا سوال پیدا کرتا رہے گا۔

صورت حال اس وقت مزید محتاج توجہ ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بیس تا پچیس برس کی ابھرتی عمر کے ان فارغین کے لئے اُس وقت نہ تو مزید تعلیم کے لئے کوئی متعین راہ سامنے ہوتی ہے، نہ وہ معاش کے فریضہ کی سمت میں کسی واضح نقشہ سے واقف ہوتے ہیں۔ ان کی اصل شناخت تو دینی تعلیم کے فارغ التحصیل کی ہوتی ہے، اور اس شناخت کے تقاضوں کی ادائیگی ان کی استعداد سے بالابنی ہوتی ہے۔ پس نہ تو دینی مدارس میں تدریس کے دروازے ان کے استقبال کے لئے کھلے ہوتے ہیں، نہ مذہبی و ملی اداروں میں ان کے لئے موزوں خدمت موجود ہوتی ہے،

اور نہ دیگر مذہبی ضروریات کے محدود مواقع اتنی بڑی تعداد کے لئے سال بہ سال کفایت کر پاتے ہیں۔ نتیجہ سامنے ہوتا ہے کہ وہ کسی منصوبہ بندی اور مزاج و مناسبت سے صرف نظر کرتے ہوئے اور حالات کی تند و تیز موجوں کے حوالہ ہو کر کارگہ حیات کی جدوجہد میں افتاں و خیزاں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس صورت حال کی بنیادی وجہ راقم کی نظر میں ہمارا موجودہ تعلیمی نظام ہے، جو پانچ سات برسوں کی غیر منظم ابتدائی تعلیم کے بعد جب اصل دینی تعلیم یا عربی تعلیم کے درجہ اول میں طالب علم کو داخل کرتا ہے تو آٹھ دس برسوں تک مصروف رکھ کر ”عالم“ کے سندھی درجہ تک پہنچنے کے بعد ہی تعلیم کی تکمیل کا پہلا موقع فراہم کرتا ہے۔ یعنی اس سے پہلے کوئی طالب علم اپنی تعلیم نامکمل تو چھوڑ سکتا ہے، لیکن کسی سند کے ساتھ مختصر تعلیمی مرحلہ مکمل کرنا چاہے تو ایسا کوئی نظم اس کے سامنے نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ صرف آٹھ دس برسوں کی عالمیت یا فضیلت ہی پہلا مرحلہ ہوتا ہے، پس ایسے وہ تمام طلبہ جو اپنے سرپرستوں، والدین یا کسی خیر خواہ کی تحریک کے تحت دینی تعلیم کا رخ کرتے ہیں، ان سب کے لئے؛ اس بات سے قطع نظر کہ ان کا تعلیمی رجحان کیا ہے، وہ اس تعلیم میں کس قدر دلچسپی دکھا پارہے ہیں؛ اور ان کی تعلیمی کارکردگی کیسی رہ رہی ہے؛ تعلیم کی پہلی منزل ہی آٹھ دس برسوں پر محیط عالمیت یا فضیلت مقرر ہو جاتی ہے۔

اب اگر یہ طلبہ عمر کی دودھائی مکمل کرتے ہوئے ”عالم“ کی باوقار دستار فضیلت سر پر رکھ کر فارغ التحصیل ہوتے ہیں، لیکن اس کے تعلیمی تقاضوں کی تکمیل کے لئے وہ ذہنی طور پر آمادہ اور مطلوبہ قابلیت سے آراستہ نہیں ہیں، تو اس کی وجہ نہ تو وہ خود ہیں، نہ ان کے اساتذہ اور نہ نصاب درس۔ کیونکہ اسی نصاب و استاذ کے زیر عمل اچھی صلاحیتوں والے فضلاء بھی فراغت حاصل کر رہے ہیں۔ بلکہ نظام تعلیم ہے، کیونکہ یہ فارغین دس سالہ نظام کی تکمیل کے بعد جس سرمایہ سے آراستہ ہو کر نکل رہے ہیں وہ سرمایہ محض دو تین سالہ تعلیم میں فراہم ہو سکتا ہے۔ اگر اس نظام تعلیم

نے انھیں ضروری شرعی علوم اور سیرت نبوی و تاریخ اسلامی پر مشتمل تین سہ ماہیہ تعلیم کے بعد اس طور پر ایک مرحلہ مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا ہوتا؛ کہ اس کے بعد وہ اپنے ذوق کے مطابق مزید تعلیم کی کوئی راہ منتخب کرتے یا اپنے معاش کی کسی تیاری سے وابستہ ہو جاتے؛ تو اس صورت حال سے جڑے کئی مسائل جنم ہی نہ لیتے، نہ تو خود یہ فضلاء اس احساس کے بوجھ میں دبے ہوتے کہ وہ عالم دین ہیں لیکن مطلوبہ علمی قابلیتوں سے عاری ہیں، اور نہ یہ سوال اٹھتا کہ وہ اب کیا کریں؟ کیونکہ اس ابتدائی مرحلہ کے بعد وہ لازماً کسی تعلیم یا تیاری کی جانب متوجہ ہو جاتے۔ بلکہ یہ فارغین مزید دوہرے فائدے سے مستفید ہوتے، ایک طرف وہ اپنی عمر کے ان اہم برسوں کو اپنے ذوق و رجحان کے مطابق مستقبل کی رخ بندی میں صرف کرتے، اور دوسری جانب ابتدائی دینی تعلیم کا یہ مرحلہ ان کی زندگی کو ہمیشہ دین و اخلاق کے نور سے منور رکھتا، اور ایک باعمل مسلمان بن کر وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں مصروف عمل ہوتے۔

یہ گفتگو ان فارغین مدارس کی اکثریت کے تعلق سے تھی جو متوسط درجہ کی یا اس سے بھی کمتر صلاحیت لے کر فارغ ہو رہی ہے۔ سب سے افسوسناک صورت حال اسی گروہ کی ہے، جن کی نہ تو مدارس کے علمی و تحقیقی حلقہ میں پذیرائی ہے اور نہ وہ عصری علوم کی راہ کے اچھے رہرو سمجھے جاتے ہیں اور نہ معاشی جدوجہد کی کسی راہ سے وہ آشنا ہوتے ہیں۔

جہاں تک ان فضلاء مدارس کا تعلق ہے جو اچھی صلاحیت کے حامل کہے جاتے ہیں، تو وہ روایتی طرز تعلیم اور معیار تعلیم کے مطابق اپنی قابل قدر محنت اور قابلیت کی شناخت بنا لیتے ہیں، اسی گروہ سے دینی مدارس کو قابل اساتذہ فراہم ہوتے ہیں۔ اور تحقیق و تحریر کے میدانوں میں بھی ان کی جولانیوں سے اچھی توقعات وابستہ رہتی ہیں۔ ان کی صلاحیتوں اور استعداد کا اندازہ اگر ان کے رائج نصاب درس اور موجود تعلیمی ماحول سے لگایا جائے تو ان کی استعداد و قابلیت اطمینان بخش قرار دی جائے گی۔

لیکن ان کی بابت بھی ایک گہیہر سوال ہنوز برقرار رہتا ہے، اور یہی ہماری گفتگو کے بالکل آغاز میں اٹھائے گئے پہلے سوال کی تفصیل بھی ہے کہ دینی مدارس کے فارغین سے کس قسم کی صلاحیتیں مطلوب ہیں؟ اور کس استعداد کی ان سے توقع کی جانی چاہئے؟ ان فارغین کی بابت سوال یہ ہے کہ کیا زمانے کے تقاضوں اور ان کے متوقع رول کی نسبت سے بھی ان کی قابلیت اطمینان بخش کہی جاسکے گی۔ یہاں اثبات میں جواب مشکل ہے۔ موضوع کے اس پہلو پر گفتگو سے پہلے یہاں کچھ سوالات رکھے جاتے ہیں، جن سے بات زیادہ واضح ہو سکے گی۔ کیا یہ فاضلین عصر حاضر کی مشکلات و مسائل کا اندازہ رکھتے ہیں؟ کیا انھیں اس بات کا علم رہتا ہے کہ اسلامی شریعت اور نظام زندگی پر کیا اعتراضات وارد کئے جا رہے ہیں؟ کیا مذہبی تقاریب کے علاوہ مواقع پر وہ اہل علم و دانش سے خطاب کرنے اور ان کے اشکالات دور کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں؟ بلکہ چند سوالات براہ راست ان کے مضمون و نصاب کی بابت پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً کیا یہ فاضلین اپنے موضوعات یعنی تفسیر و حدیث اور فقہ اسلامی کے میدانوں کی جدید پیش رفت اور نئے رجحانات سے واقف ہوتے ہیں؟ کیا علوم حکمت و فلسفہ کی ان کی تعلیم عصر حاضر کے متعلقہ مسائل سے انھیں آشنا کرتی ہے؟ اور کیا وہ اپنے بنیادی مضامین کی تعلیم کے ساتھ ان کا تاریخی، تقابلی اور معروضی مطالعہ بھی رکھتے ہیں؟ جواب یہاں بھی نفی کی جانب مائل ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا تعلیم کی کوئی انتہاء ہے؟ اگر نہیں تو ہمارے یہ ذہن طبقہ فضلاء میں سے محدود تعداد ہی کے لئے سہی؛ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے دینی پیغام اور دعوتی کردار کے ساتھ عصری علوم میں سے کسی بھی مضمون میں امتیاز پیدا کر کے اس موضوع پر شریعت اسلامی کی بالادستی ثابت کریں۔ مثلاً پولیٹیکل سائنس، سوشیالوجی، اکونومی یا قانون کی تعلیم حاصل کر کے دنیا کو ان کی زبان میں بتاسکیں کہ اسلام کا نظام حکمرانی کیسا شفاف اور عادلانہ ہے۔ اسلام کا پیش کردہ سماجی نظام کس طرح فطری خوبیوں سے آراستہ اور انسانی رشتوں کو امن و راحت سے



آراستہ کرتا ہے۔ اسلامی معاشیات کیونکر دنیا میں معاشی عدل پیدا کر کے انسانیت کو ان بے شمار معاشی مسائل سے نجات دلاتا ہے جن کے خطرناک نتائج نے انسانی زندگی کو جہنم زار بنا رکھا ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون کس طور پر حقیقی عدل و انصاف فراہم کرتا ہے۔ یہ بطور مثال چند مضامین ذکر کئے گئے، ورنہ ماحولیاتی مطالعہ، سماجی عمل اور طب و سائنس وغیرہ کے متعدد مضامین ہیں جہاں ہمارے فضلاء مدارس اگر اپنے دینی پیغام و کردار سے وابستہ رہ کر کچھ کر دکھانے کے جذبہ سے ممتاز مقام حاصل کرتے ہیں تو وہ نہ صرف ایسی خدمت دین کر سکیں گے جن کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے، بلکہ دین و دنیا کی مصنوعی دوئی کو ختم کر کے نئی مثال قائم کر سکیں گے۔

واضح رہے کہ یہ سوالات ان ہی فضلاء کی بابت ہیں جو نہ صرف ذہین و ذکی اور ممتاز ہیں بلکہ جنہوں نے دینی مدارس کے مروجہ نصاب کو رائج نظام کے تحت اچھی طرح پڑھا ہوتا ہے۔ پھر اگر یہ فاضلین اپنے سامنے ایسے بنیادی سوالات رکھتے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان فضلاء نے محنت سے جی چرایا ہے، یا مقررہ نصاب کو ٹھیک سے نہیں پڑھا ہے۔ پھر اگر انھیں زمانہ میں ایک مؤثر رول ادا کرنے میں رکاوٹیں درپیش ہیں، تو اس کی وجہ چند سنجیدہ اور غور کے قابل امور ہیں:

اول تو یہ کہ ہمارے یہ ذہین فضلاء اپنی حتی الوسع محنت کر کے بھی اسی نصاب کے دائرہ میں بڑی حد تک محدود رہیں گے جو ان کے لئے مقرر شدہ ہے، یہ بات کیونکر ممکن ہوگی کہ فقہ اسلامی کی تعلیم میں تو ہم ان مثالوں کی مدد سے تفہیم کا کام لیں جو آج دنیا سے ہی ناپید ہیں، اور یہ توقع کریں کہ ہمارے فضلاء جدید مسائل پر رائے دے سکیں گے۔ جب زندگی کا سفر جاری ہے، اور مسائل نئے پیدا ہوتے جا رہے ہیں تو ہمارے نصاب میں بھی اس کی شمولیت یا نمائندگی ہونی چاہئے۔

دوسرے یہ کہ علم و تحقیق کا سفر رواں دواں ہے۔ ہمارے فضلاء کو بھی اسی رفتار کے ہمدوش بن کر سفر جاری رکھنا ہوگا۔ ورنہ یا تو ہم ان راہوں پر دوبارہ چل رہے ہوں گے جن سے علم و تحقیق

کا کارواں گذر چکا ہے۔ یا ہم ایک انجام پا چکی علمی محنت کا بے ضرورت اعادہ کر رہے ہوں گے۔ جب کہ بہترے نئے کام اور نئی محنتیں ہماری پیش روی کی منتظر ہوں گی۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ہمارے نصاب تعلیم کا دائرہ اتنی کشادگی رکھتا ہو کہ وہ اپنے دامن میں جدید پیش رفت اور نئی تحقیقات و خدمات کو سمو لے۔ تاکہ فقہ اسلامی کا فاضل جدید فقہی مباحث اور تحقیقات سے، علم حدیث کا فاضل فن حدیث کے میدان کی بیش قیمت تحقیقات و خدمات سے اور علم تفسیر کا فاضل میدان تفسیر کی پیش رفت اور ضروریات جدیدہ سے کما حقہ واقف ہو۔

تیسرے یہ کہ کسی بھی نصاب کی تدریس میں ایک مؤثر کردار معلمین اور اساتذہ کا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اساتذہ اپنے موضوع کے میدان میں کس حد تک قدیم و جدید معلومات سے آراستہ ہیں؟ طلبہ کی استعداد کے دائرہ اور وسعت سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں اساتذہ اور معلمین کو ان کے متعلقہ موضوعات پر واقف (Update) رکھنے کا کوئی نظم نہیں ہے۔ حالانکہ تدریسی عمل کے لئے یہ انتہائی ضروری اقدام ہے۔ ضرورت ہوگی کہ (Refresher Course) کے طرز پر اساتذہ و معلمین کو جدید ترین معلومات سے آراستہ رکھنے کے لئے نظم بنایا جائے۔

چوتھے یہ کہ ہمارے طلبہ ایسے مواقع سے محروم رہتے ہیں جہاں وہ دیگر تعلیمی اداروں اور نظام کا مطالعہ کر سکیں اور دیگر اداروں کے طلبہ کے ساتھ تبادلہ خیال کر سکیں، ایسے اسٹڈی ٹورس (Study Tours) ان کے لئے منظم کئے جائیں جہاں وہ ملک کے دیگر مدارس کے طلبہ کے ساتھ تبادلہ خیالات اور مباحثوں میں شریک ہوں اور اداروں کا مطالعہ کر سکیں۔ اس سے نہ صرف ان کے ذہنی افق میں وسعت پیدا ہوگی، بلکہ وہ معاصر مسائل کو سمجھنے اور جواب دینے کی سمت عملی قدم اٹھا سکیں گے۔

فارغین مدارس کی استعداد کے حوالے سے ان کے کردار سے متعلق دو اور باتیں قابل

توجہ ہیں:

پہلی یہ کہ مدارس کی تعلیم کا اصل پیغام کردار سازی ہے، اپنی بھی اور دوسروں کی بھی۔ تعلیم کا سلسلہ خواہ مدرسہ سے فراغت کے ساتھ ختم ہو جائے، یا مزید تعلیم جاری رکھی جائے، یا عمل کے کسی بھی میدان میں مصروفیت اختیار کی جائے۔ یہ پیغام ان کی زندگی کا لازمی عنصر ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر ان کی علمی استعداد کچھ بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔ اس حوالے سے صورت حال بہت اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس جانب بہت جرأت مندانہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ موجودہ زمانے میں اس پر کھل کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس رویہ نے نقصان کو بڑھا دیا ہے کہ اپنے حلقوں میں اس سے چشم پوشی ہو، جب کہ غیروں کی نگاہیں اعتماد کو مجروح کر رہی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ دینی تعلیم کی ایک اہم اور نمایاں شناخت یہ رہی ہے کہ یہاں اساتذہ صرف زبانی معلم نہیں ہوتے، بلکہ وہ پیکر تعلیم ہوتے ہیں۔ وہ نئی نسل کی کردار سازی میں زبان سے زیادہ عمل سے کام لیتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دینی تعلیم کی یہ منفرد ”شناخت“ متنوع قسم کے مسائل کے گرد و غبار میں دھندلانے لگ گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ معاصر دینی تعلیم کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔



تیسوا باب  
مدارس کا نظام تربیت





## دینی مدارس میں تربیت کا نظام۔ ایک جائزہ

مولانا اشہد رفیق ندوی ☆

مدارس دین کی تعلیم کے لئے قائم ہوئے ہیں اور دینی تعلیم کا منتہائے مقصود افراد اور معاشرہ کی تربیت و تزکیہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ پیغمبروں کی بعثت کا یہی اصل مقصد رہا ہے کہ وہ اپنی قوم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے تھے اور اس کی روشنی میں ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے تھے۔ قرآن مجید انبیاء کرام کے حوالہ سے اس فریضہ منصبی کا بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر کرتا ہے (۱)، احادیث اور سیرت کی کتابیں بھی اس طرح کے مواد سے لبریز ہیں (۲)، دینی مدارس کے مقاصد، نصب العین اور اعلانات و دعاوی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بھی اس انبیائی مشن کے وارث اور اس کی خدمت میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دینی تعلیم جس طرح شخصیت پر تطبیق کا تقاضا کرتی ہے، انبیاء، ائمہ، محدثین، صلحاء اور اکابرین ماضی میں تعلیم کے ساتھ تربیت و تزکیہ پر جیسی توجہ دیتے رہے ہیں، کیا ایسا کوئی موثر تربیتی نظام ہمارے مدارس میں بھی موجود ہے، جو اکابر کے خطوط پر معاشرہ کے لئے لائق اور مفید افراد تیار کر رہا ہو۔ پیش نظر مقالہ میں اسی بات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ تربیتی نظام کے تجزیہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تربیت و تزکیہ کا مفہوم واضح کر دیا جائے تاکہ اسی کو معیار بنا کر مروجہ نظام کو پرکھا جاسکے۔

☆ (استاذ سینئر سکندری اسکول علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

## تزکیہ کا مفہوم

عربی زبان میں تزکیہ کا مطلب کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، اس کو نشوونما دینا اور اس کو پروان چڑھانا ہے۔ اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں، اول کسی چیز کو آلائشوں اور کمزوریوں سے پاک کیا جائے، دوم: اس کی صلاحیتوں کو ممکنہ حد تک پروان چڑھایا جائے، تزکیہ کا عمل مختلف چیزوں پر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ زمین کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اسے جھاڑ جھنکار سے صاف کیا جائے، اسے کھاد پانی دے کر اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کسی صالح بیج کو نشوونما دے سکے اور اس سے پھل پھول حاصل ہو سکیں۔ اگر یہ کوشش انسانی نفوس کے لئے ہو تو انہیں باطل نظریات سے پاک کرنا، قابل اعتراض رویوں سے بچانا، باپ دادا کی اندھی تقلید سے روکنا، توہمات اور سماجی برائیوں سے پاک کرنا شامل ہے (۳)۔

تزکیہ نفس قرآن مجید کی ایک جامع اصلاح ہے جو اپنے اندر ہمہ اقسام کے اسلامی تعلیمی مقاصد کو سموئے ہوئے ہے۔ اس کے ذریعہ فرد اور معاشرہ دونوں کا تزکیہ ہوتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہے، یعنی یہ جسم، روح اور عقل تینوں کو پاک کرنے اور نشوونما دینے کا کام انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ تزکیہ نفس اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اعلیٰ کردار پر منتج ہوتا ہے۔ ہر انسان کو سلیقہ زندگی سکھاتا ہے (۴)۔

تزکیہ کا عمل شخصیت کے ارتقاء کے ساتھ معاشرہ کی تعمیر و ترقی میں بھی بھرپور کردار ادا کرتا ہے، معاشرتی اقدار کا تحفظ اور صالح خطوط پر ارتقاء افراد کے کردار پر منحصر ہوتا ہے۔ تزکیہ نفس کا نظام افراد کے اندر تقویٰ، خلوص، دیانت داری، بھائی چارہ، رحم دلی، عفو و درگزر اور عزم و بہادری جیسے انفرادی اوصاف اسی لئے پیدا کرنا چاہتا ہے کہ فرد معاشرہ کی بہترین اکائی بنے اور اس کی تعمیر و ترقی میں بھرپور کردار ادا کرے۔ اس کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ خالصۃً معاشرہ کی تطہیر کے لئے ہر مسلمان پر عائد کیا گیا ہے، تاکہ معاشرہ میں معروفات

فروغ پائیں، منکرات کا ازالہ ہو اور سماج بحیثیت مجموعی بہترین اخلاقی اصولوں کے ساتھ دنیاوی ترقی اور اخروی کامیابی اور نجات کی جانب گامزن ہو۔

تزکیہ اپنے مفاہیم میں وسعت کے ساتھ اپنا ایک موثر و مبسوط نظام رکھتا ہے، اس کے لئے تزکیہ کے علاوہ تربیت، تصوف اور احسان و سلوک جیسی دوسری اصطلاحات بھی رائج ہیں اور تاریخ کے ہر دور میں وقت اور افراد کے مزاج کے ساتھ اس کے طریقے بدلتے رہے ہیں اور اس میں مدوجز بھی دیکھا گیا ہے۔

اوپر تربیت و تزکیہ کا جو مختصر اور سادہ مفہوم بیان ہوا ہے، وہ دراصل اس کا کم سے کم حصہ ہے جو اس نظام تربیت میں پایا جانا چاہئے جو اس مقصد کے لئے وضع کیا جائے، اس کم سے کم حصہ کے بغیر اس مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔

### مدارس کے تعارفی لٹریچر میں تربیتی نظام

اسی تعارف کی روشنی میں مدارس میں مروج نظام تربیت کی تلاش و جستجو کی کوشش کی گئی ہے اور سب سے پہلے بڑے مدارس کی مطبوعہ تاریخ اور تعارفی لٹریچر میں اس نظام کی اہمیت، مقاصد، اہداف اور طریقہ کار کے سلسلے میں مطبوعہ مواد تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔

تاریخ دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی و تربیتی نقطہ نظر سے اس کا مسلک ان الفاظ میں درج ہے۔ پھر یہی باتیں دوسرے تعارفی لٹریچر میں بھی جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔

”دارالعلوم دیوبند کا مسلک اہل سنت والجماعت، حنفی مذہب اور اس کے مقدس بانیوں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قدس سرہ کے مشرب کے موافق ہوگا۔ دارالعلوم کے مسلک کی حفاظت تمام ارکان و متعلقین دارالعلوم کا فرض ہوگا۔ کسی ملازم، طالب علم کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ کسی ایسی انجمن یا ادارے یا جلسے میں شرکت کرے جس کی شرکت دارالعلوم کے مسلک یا مفاد کے لئے ضرر رساں ہو (۵)، یہ مسلک اعتدال سات اصولی



بنیادوں پر قائم ہے۔ علم شریعت، پیروی طریقت، اتباع سنت، فقہی حنفیت، کلامی ماتریدیت، دفاع ضلالت اور ذوق قاسمیت ورشیدیت اس مسلک اعتدال کے عناصر ترکیبی ہیں“ (۶)۔  
مذکورہ سطور سے دارالعلوم دیوبند کا تربیتی موقف اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مگر ان اصول کو حاصل کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس کا کوئی تفصیلی خاکہ تحریری شکل میں موجود نہیں۔

تاریخ ندوۃ العلماء اور اس کے دیگر تعارفی لٹریچر میں تربیتی نظام کا تفصیلی تذکرہ نہیں ملتا۔ البتہ ندوہ نے مسلک و مشرب کی حصار بندی کے بجائے ”قدیم صالح اور جدید نافع“ کے حصول کو شعار بنایا ہے، اکابرین ندوہ میں کئی بڑے اہل اللہ گزرے ہیں۔ اس کے فارغین نے تزکیہ، تصوف اور احسان و سلوک پر وافر مقدار میں مواد فراہم کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مناسب ہوگا کہ وہاں کا تربیتی نظام اسی نقطہ نظر کا مظہر ہوگا۔

مظاہر العلوم سہارنپور کی تاریخ (۷) بھی تربیتی نظام کے تذکرے سے خالی ہے۔ اس کا تعارفی لٹریچر بہت کم حاصل ہو سکا۔ مگر جو کچھ دستیاب ہے وہ بھی تربیتی نظام کے تذکرے سے خالی ہے۔ البتہ اکابرین مظاہر العلوم نے بہت بڑی عالمی تبلیغی تحریک برپا کی ہے جو اپنا بھرپور تربیتی نظام رکھتی ہے بلکہ اس کا زیادہ زور تربیت پر ہی ہے، بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ نظام اپنے منبع و مرکز پر پوری طرح سایہ فگن ہوگا۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ایک صدی قدیم مدرسہ ہے، مگر اس کی تاریخ ابھی مرتب نہیں ہو سکی ہے، اس کے دیگر تعارفی لٹریچر میں بھی تربیتی نظام کا کوئی مربوط خاکہ یا مفصل گائیڈ لائن موجود نہیں ہے، البتہ اس کے دستور العمل میں تربیتی نقطہ نظر ان الفاظ میں واضح کر دیا گیا ہے۔ ”یہ مدرسہ اہل سنت والجماعت کے مختلف مذاہب کا سنگم ہوگا، یہاں حنفی اور اہل حدیث دونوں ملیں، ندوی، دیوبندی، اصلاحی سب تعلیم دیں۔ جزیات کے اختلاف کے باوجود سلف

کے طریقے پر آپس میں شیر و شکر ہو کر رہیں اور مسلمانوں کے آپسی اختلافات کو مٹا دیں“ (۸)۔  
یہ مدرسہ استاذ امام حمید الدین فراہی کے افکار کا ترجمان ہے، جو قرآن و سنت کے شیدائے تھے۔  
مسلک و مشرب کے حصار سے آزاد، سادہ اور ٹھیٹھ مسلمان کہلانا پسند کرتے تھے۔ قرآن و سنت  
سے مستنبط ہر اصول کو حرز جان بنائے رکھتے تھے۔ مدرسہ کا تعلیمی و تربیتی نظام ان کے علمی و عملی  
زندگی کا ترجمان ہے۔

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اپنی عمر کے نصف صدی مکمل کرنے کو ہے۔ مبسوط مطبوعہ تربیتی  
نظام سے اس کا دفتر بھی خالی ہے۔ یہ مدرسہ الاصلاح اور تحریک اسلامی کے افکار کا حامل ہے۔  
تحریک اسلامی نے اس موضوع پر بہت معیاری اور وسیع لٹریچر تیار کیا ہے، یہاں کے مروج تربیتی  
نظام میں اس لٹریچر کا انعکاس پایا جاتا ہے۔

### موجود و مقبول تحریری سرمایہ

مدارس کے تعارفی لٹریچر میں تربیتی نظام کا کوئی مبسوط خاکہ یا گائیڈ لائن دستیاب نہیں  
ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنا بڑا نظام صرف سینہ بہ سینہ معلومات پر چل رہا ہے۔ البتہ نظم و تربیت  
کے حوالہ سے جو مواد اکثر مدارس کے تعارفی لٹریچر میں درج ہے وہ خطابت و صحافت کی مشق،  
تحقیق و مطالعہ کی ترغیب، کھیل کود اور ورزش کے مواقع، اساتذہ و مصلحین کے وعظ و پند، نیز  
خارجی جماعتوں و تحریکوں میں شمولیت اور عملی تربیت وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ احکام شریعت کی  
پابندی، اخلاقی حدود کی پاس داری، وضع قطع کا لحاظ اور منکرات سے اجتناب کے لئے کچھ  
اصول و ضوابط بھی مقرر ہیں جن کی خلاف ورزی موجب سزا ہوتی ہے۔ یہ مختلف ذرائع تربیت  
بھی لٹریچر میں تعارف و ترغیب کے لئے مذکور ہیں۔ ورنہ ان میں کسی کا کوئی بھی تفصیلی خاکہ درج  
نہیں ہے (۹)۔

## مربی رنگراں راتالیق

مدارس میں تربیت کا بڑا ذریعہ مربی رنگراں راتالیق کی ذات گرامی ہوتی ہے، اس کی صلاحیت، وژن، دینی و اخلاقی کیفیت، ذوق و مزاج اور محنت و لگن پر تربیتی نظام کا انحصار ہوتا ہے۔ چوں کہ اس کے سامنے کوئی واضح نظام یا نقشہ کار نہیں ہوتا، اس لئے اسے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہوئی روایات کا اپنے ذوق و مزاج اور وجدان سے تربیت کا پورا نظام چلانا ہوتا ہے اس لئے وہ جیسے چاہتا ہے اس نظام کو چلانا ہے۔ اور اس میں ان طلبہ کو سیکھنے کے زیادہ مواقع ملتے ہیں جو مربی محترم سے قریب رہتے ہیں اور ان کی ذاتی خدمت میں وقت گزارتے ہیں۔

مدارس کے تربیتی نظام کا یہی ماحصل ہے، اس نظام سے آراستہ ہو کر جو طلبہ اور نوجوان فارغ ہوتے ہیں وہ بعد کی زندگی میں تین طرح کے راستے اختیار کرتے ہیں۔

۱- اپنے خاندانی کاروبار اور مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں، مثلاً تجارت، یا کھیتی باڑی وغیرہ۔ جہاں مدرسہ کی تعلیم و تربیت کا فیض ان کی ذات اور خاندان تک محدود رہ جاتا ہے۔ دوسروں کو فیض یاب کرنے کا موقع زیادہ نہیں ہوتا۔

۲- اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے یونیورسٹیوں کا رخ کرتے ہیں، یہاں ماحول کی کثافت مدرسہ کی پاکیزہ تعلیم و تربیت پر بہت جلد غالب آ جاتی ہے، مدرسہ کی برسہا برس کی تربیت کے اثرات چند ہفتوں یا مہینوں میں کافور ہو جاتے ہیں۔ یونیورسٹیوں کا رخ کرنے والے فارغین مدرسہ کی ایک بڑی اکثریت میں مدرسہ کی تربیت کا شائبہ تک باقی نہیں رہ جاتا۔

۳- مدارس و مکاتب میں تدریس یا مساجد کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں۔ قرآن و سنت کے امین اور انبیاء کے وارث ہونے کی وجہ سے یہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں جی جان لگا دیتے ہیں، مگر معاشرہ انہیں عزت و توقیر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ ان کی خدمت کے عوض جو حقیر معاوضہ پیش کیا جاتا ہے اسے بھی عزت نفس مجروح کئے بغیر ادا نہیں کیا جاتا۔ دیوبند کے شیخ

الحديث حضرت مولانا محمد یعقوب نانائویؒ نے ”کھوٹے سکے“ تیار کرنے کا دعویٰ جس پس منظر میں بھی کیا ہو، معاشرہ انہیں واقعی ”کھوٹا سکہ“ ہی تصور کرتا ہے۔

صورت حال کی یہ حقیقی تصویر ہے، اس پورے نظام کا مقصد اور نتیجہ کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو کامیابی کا اوسط بہت مختصر نظر آتا ہے، خاص طور سے اگر تربیت و تزکیہ کا بنیادی مقصد معاشرہ کے لئے لائق افراد تیار کرنا پیش نظر رکھا جائے اور فارغین مدارس کا معاشرہ کی تعمیر و ترقی میں کردار تلاش کیا جائے تو بہت مایوس کن صورت حال سامنے آتی ہے، امت کا کوئی طبقہ اس صورت حال سے مطمئن نہیں، اقبال نے مدرسہ و خانقاہ سے نمناک اٹھنے کی بات کہی تو حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے اسے ”کاغذی پھول“ سے تعبیر کیا ہے (۱۰)۔

### مبسوط نظام تربیت کی ضرورت

صورت حال حقیقۂ مایوس کن ہے۔ جو فوری توجہ کی مستحق ہے۔ نظام مدارس پر غور و فکر اور تنقید و تصحیح کا سلسلہ ایک صدی سے جاری ہے مگر اس کی پوری توجہ نصاب تعلیم پر ہے۔ نظام تربیت خال خال ہی زیر بحث آتا ہے۔ نظام تربیت کو موضوع گفتگو بنا کر کمزوریوں کا ادراک و اعتراف کرنے اور ایک ایسا مبسوط اور موثر نظام تربیت مرتب کرنے کی ضرورت ہے جس سے زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے والے اسلام کی سچی تصویر ابھر کر سامنے آئے اور اسلام محض عبادتی مذہب بن کر نہ رہ جائے۔

نیا تربیتی نظام کیسے مرتب ہو، اس کے بنیادی خدو خال کیا ہوں، اس کے لئے ذرا مڑ کر ماضی میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ نفس کا تزکیہ اور شخصیت کے ارتقا پر اسلاف نے بہت وقیع لٹریچر تیار کیا ہے۔ معاصر عہد کی مقبول روایت بن گئی ہے کہ منصوبہ چھوٹا ہو یا بڑا پہلے اس کی گانڈ لائن تیار ہوتی ہے، معاصر نظام تعلیم کا جائزہ لیا جائے تو وہاں ہر کام کی مفصل گانڈ لائن تحریری طور پر موجود ملے گی۔ مثلاً تدریس کے لئے اگر ایک کتاب نصاب میں مقرر ہے تو اس کتاب کو



پڑھانے کا مقصد کیا ہے، کیسے پڑھائی جائے، کیسے امتحان لیا جائے، ٹیچر گانڈ میں الگ سے لکھا ہوا ملے گا۔ اسی طرح اگر کھیل کود کے لئے کوئی گھنٹی مخصوص کی گئی تو کھیل کیسے ہوگا۔ اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا، کھیل کا طریقہ و ضابطہ کیا ہوگا۔ کامیابی و ناکامی کے اصول کیا ہوں گے۔ سب کچھ تحریری طور پر موجود ہوگا (۱۲)۔

مدرسہ کا تعلیمی و تربیتی نظام ابھی قدیم طرز پر چل رہا ہے، اس سطح پر منصوبہ بندی اور لٹریچر کی تیاری کا رواج نہیں ہے، مگر اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کم از کم اہم امور مثلاً نظام تعلیم اور نظام تربیت کا مفصل خاکہ اسلاف کی تحریروں کی روشنی میں ضرور مرتب کیا جانا چاہئے۔ تاکہ معلم یا مربی کے لئے صرف اس سانچے میں ڈھالنے کا کام باقی رہے، سب کچھ مربی کی صواب دید پر چھوڑ دیا جائے تو افراط و تفریط کا امکان ہمیشہ باقی رہے گا۔ متوقع نتائج برآمد ہونے کا امکان کم ہی رہے گا۔

## مقاصد

نظام تربیت کی ترتیب کا آغاز مقاصد کی تعیین و توضیح سے ہوگا۔ نظام تزکیہ کے وہی مقاصد ہوں گے جو کسی مدرسہ کے قیام کے مقاصد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:

☆ قرآن مجید کی ہمہ جہت تعلیم اور ان تعلیمات کا شخصیت پر انطباق تاکہ طلبہ ”کان خلقہ القرآن“ کے اسوہ نبوی کا نمونہ بن سکیں۔

☆ سنت و سیرت نبوی کی ہمہ جہت، تعلیم اور اسوہ رسول ﷺ کی روشنی میں شخصیت کی تشکیل کی سعی و جہد جو عبادات، اخلاقیات، معاملات اور زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے۔

☆ قرآن و سنت کے بیان کردہ توحید، رسالت اور آخرت جیسے بنیادی عقائد کی واضح تعلیم اور اس کی روشنی میں ایسی تربیت کہ شرک و بدعات جیسی خرافات راہ نہ پاسکیں۔

☆ اسلام ایک مکمل نظام حیات کا نام ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرتا ہے۔ اس

کی دینی بصیرت بہم پہنچانا۔

- ☆ تطہیر افکار، تعمیر معاشرہ اور معاشرہ میں شریعت الہی کے نفوذ کے لئے کوشاں رہنا۔
- ☆ فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی کے لئے سپاہی تیار کرنا۔
- ☆ دنیا میں رائج افکار و نظریات سے باخبر رہنا اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا مقابلہ کرنا۔
- ☆ ایسا ماحول برپا کرنا کہ طلبہ گروہی، جماعتی اور مسلکی اختلافات سے بالاتر ہو کر وسعت قلب و نظر کے ساتھ معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔
- ☆ صحت و تندرستی کے نقطہ نظر سے صاف ستھرا ماحول اور کھیل و کود کے مواقع بہم پہنچانا۔

## عملی خاکہ

مدارس کے تعارفی لٹریچر کا جائزہ لیا جائے تو کم و بیش ایسے ہی مقاصد لکھے ہوئے ملیں گے۔ ان مقاصد کو حاصل کیسے کیا جائے۔ اس کے لئے بھی تفصیلی خاکہ کی ضرورت ہوتی ہے یعنی اگر قرآن مجید کی ہمہ جہت تعلیم کا دعویٰ ہے تو اس کا باقاعدہ نظام بھی ہونا چاہئے، اسی طرح تعلیمات نبوی ﷺ میں مومن کا جو آفاقی تصور ملتا ہے اور اس سے جس مجاہدانہ کردار کی رہنمائی ملتی ہے، ایسا مجاہد تیار کرنے کی جدوجہد ہونی چاہئے نہ کہ صرف عبادات کے رسوم و آداب بتا کر اسے مومن کامل تصور کر لیا جائے، افکار کی تطہیر اور معاشرہ کی تعمیر کے لئے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مختلف افکار و نظریات کے لئے بڑے پیمانے پر لٹریچر فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ بعض مدارس میں دوسرے مکاتب فکر کے متعلق لٹریچر کو پڑھنے پر پابندی عائد ہے۔ اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے مثبت تبدیلی کی ضرورت ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بہت اہم ہے۔ اس کے لئے خاص طور سے بڑی پتہ ماری کی ضرورت ہے۔ مگر بعض جماعتیں چند معروفات کے فروغ کے لئے کوشاں رہتی ہیں اور نہی عن المنکر کا فریضہ بر بنائے

مصنحت آئندہ کے لئے اٹھا رکھا ہے۔ طلبہ کی تربیت اگر انہی کی مرہون منت ہوگی تو وہ منکرات کے ازالہ کے لئے کیسے جرأت کر سکیں گے، صحت مند، پرامن اور صلح جو ماحول کے برپا کئے جانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے مگر اپنے مسلک، اپنی جماعت اور اپنے فکر کی بالادستی ثابت کرنے کے لئے تمام جتن کر ڈالے جاتے ہیں۔ یہ رویہ بھی بنیادی مقصد سے متصادم ہے، واقعی وسعتِ قلب و فکر پیدا کرنے کے لئے رویہ میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ الغرض موثر نظام تربیت بنانے کے لئے مقاصد سے ہم آہنگ تفصیلی عملی خاکہ کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ تفصیلی نقشہ کار موجود نہ ہونے کی وجہ سے منظمہ، مربی اور طلبہ اپنے تصوراتی خاکہ پر عمل آوری کے لئے آزاد ہوتے ہیں۔ کسی سطح پر محاسبہ کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی اور گاڑی نامعلوم منزل کی طرف دوڑتی رہتی ہے۔

## مربی کی تربیت

عملی خاکہ تیار ہونے کے بعد سب سے پہلے نگراں و مربی حضرات کو اس کی اچھی طرح تفہیم کرائی جائے بلکہ ان کی تربیت کا باقاعدہ نظام بنایا جائے۔ ذاتی زندگی کے کسی معاملہ میں نا تجربہ کار افراد پر بھروسہ نہیں کیا جاتا، نوآموز ڈرائیور کے ساتھ سفر کرنا پسند نہیں کیا جاتا، نا تجربہ کار درزی کا سلا ہوا کپڑا پسند نہیں آتا، نا پختہ باورچی کو تقریبات سے دور رکھا جاتا ہے۔ مگر ایک نسل کی تربیت کے لئے نا تجربہ کار مربی یا اتالیق کے حوالہ کر دیا جائے، اس کے پاس نہ کوئی عملی خاکہ نہ باقاعدہ تربیت کا نظام، پھر یہ توقع کرنا کہ وہ لائق و فائق افراد ڈھال کر نکالے گا۔ یہ نیم کے درخت سے آم کی توقع کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے تربیتی نظام کے ساتھ اتالیق اور مربی کی تربیت کا بھی نظام بنایا جانا چاہئے۔ عیسائی مشنری ادارے یا آرائس ایس جتنے اسکول، بورڈنگ یا تربیتی ادارے چلاتے ہیں، مضمون کے ماہرین کے ساتھ ہر جگہ ذہن سازی اور تربیت کے لئے اپنا ٹرینڈ کیڈر ضرور ساتھ لگاتے ہیں۔ عدلیہ، انتظامیہ اور بیوروکریٹس (Bureaucrats) میں اس ذہنیت کی بھرمار اسی وجہ سے ہے۔ ہمیں بھی عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

فاعتبروا یا اولی الأبصار۔

## مروجہ نظام میں اصلاح

عملی خاکہ مرتب ہو جائے گا تو مروجہ نظام کی کمزوریاں اپنے آپ گرفت میں آجائیں گی تاہم چند باتیں فوری طور پر توجہ طلب ہیں۔

## مشق و خطابت

تقریباً تمام مدارس میں طلبہ کو خطابت کی مشق کرائی جاتی ہے۔ تاکہ وہ میدان عمل میں جا کر دعوت کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج جیسے اداروں میں مثبت فکر، موضوعات میں تنوع، زمانہ سے ہم آہنگی، سنجیدہ و معیاری اسلوب کی مشق کرائی جاتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں رد بریلویت، رد مودودیت اور رد اہل حدیثیت پر طلبہ کو کمر بستہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوعات زور بیانی اور جارحیت کے متقاضی ہیں۔ جارحیت اور شائستگی ساتھ نہیں چل سکتے۔ اسی طرح بریلوی مکتبہ فکر کے مدارس میں رد دیوبندیت پر زور صرف ہوتا ہے اور ان کا اسلوب مزید جارحانہ ہوتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اسلوب رسول اکرم ﷺ کے اسلوب خطابت سے میل کھاتا ہے۔ خاتم الانبیاء ﷺ پورے وقار کے ساتھ، سکینت اور پوری توجہ کے ساتھ، سامعین کی نفسیات اور ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر بات سمجھاتے اور جملے بار بار دہراتے کہ وہ باتیں دل میں اتر جائیں مگر آپ کا نام لینے والا اور آپ کی محبت کا دم بھرنے والا مقرر آگ کے شرارے اڑائے، ایسا فرد کسی معقول انسان کو کیسے متاثر کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں تمام مکاتب فکر کے علماء کو سوچنا چاہئے اور طلبہ کی اس طرح تربیت کرنی چاہئے کہ عوام کی داد و تحسین کی فکر مندی کے بجائے اپنی تقریر کے بارے میں آخرت کی جواب دہی کا احساس بیدار ہو۔



## نظم طعام

مدارس میں طلبہ کے لئے کھانا فراہم کرنے کے تین طریقے رائج ہیں۔ کچھ مدارس اجتماعی طور پر ایک ساتھ کھانا کھلانے کا نظم کرتے ہیں۔ کچھ مدارس ملازمین کے ذریعہ طلبہ کے کمرے میں کھانا باعزت طریقے سے بھجوا دیتے ہیں اور کچھ مدارس میں تقسیم کے وقت طلبہ اپنا برتن لے کر قطار میں لگتے ہیں اور کھانا لا کر کمرہ میں کھاتے ہیں۔ تیسرا طریقہ خاص طور سے قابل اصلاح ہے۔ بڑے عاقل و بالغ طلبہ جو کل فارغ ہو کر معاشرہ میں قائدانہ کردار ادا کرنے کے لئے کمر کس رہے ہیں، وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کاسہ بدست قطار اندر قطار کھڑے ہوں، اس سے ان کی عزت نفس ضرور مجروح ہوتی ہوگی، تقسیم طعام کا یہ نظم جب بنایا گیا تھا ہو سکتا ہے کوئی مجبوری یا کوئی تربیتی پہلو پیش نظر رہا ہو۔ مگر آج کے زمانے میں اس کا نقصان فائدہ سے زیادہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اس لئے اس طریقہ کی اصلاح کی فوری ضرورت ہے۔

## اختتامیہ

تربیت کے حوالہ سے یہ معروضات اس توقع کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں کہ مدارس کے مسائل و مشکلات پر غور و فکر کے وقت شاید کچھ کام آئیں۔ خوب سے خوب تر کی جستجو مدرسہ کی ہی تربیت کا نتیجہ ہے، مدراس کا ایک خوشہ چیں ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ مدارس کے تئیں احسان مندی کا احساس رہتا ہے اور خواہش، کوشش اور دعا رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ شرور و فتن سے ان کی حفاظت فرمائے۔ ان کی افادیت کو عام کرے اور انہیں دن دوئی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

مہ وانجم کے خالق کچھ نئے تارے فروزاں کر

کہ پھر آفاق میں بے رونقی معلوم ہوتی ہے



## حوالہ جات

- ۱- قرآن مجید، آل عمران ۱۶۴، سورۃ الجمعہ ۲
- ۲- ریاض الصالحین، باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر، حیات رسول امی، خالد مسعود، قرآن و سنت اکیڈمی، نئی دہلی، ص ۵۷۵
- ۳- تزکیہ نفس، مولانا امین احسن اصلاحی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۱۹۹۱ء، ص ۳۳-۳۴
- ۴- تعلیم کی اسلامی بنیادیں: ڈاکٹر بدرالاسلام دہانت ڈاٹ پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۳۲
- ۵- تاریخ دارالعلوم دیوبند: سید محبوب رضوی، جلد اول، ادارہ اہتمام دارالعلوم دیوبند، ۱۹۹۲ء، ص ۴۲۴
- ۶- حوالہ مذکور، ص ۴۳۱
- ۷- تاریخ مظاہر: مولانا محمد زکریا، کتب خانہ اشاعت العلوم، سہارنپور، ۱۹۷۲ء
- ۸- ذکر فرامی: ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، دائرہ حمیدہ، مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڑھ ۲۰۰۱ء، ص ۳۸۰
- ۹- تفصیلات کے لئے مدارس کے تعارفی لٹریچر سے رجوع کیا جائے۔
- ۱۰- علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے۔  
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک  
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ
- ۱۱- پاجاسراغ زندگی: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۸۹ء، ص ۹۵
- ۱۲- تفصیلات کے لئے NCERT کا تدریسی لٹریچر یا قراٹر انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے نصابی اور تدریسی لٹریچر سے رجوع کیا جائے۔ اقراء کی ویب سائٹ ہے:

www.iqrafoundation.com, www.iqra.org.



## دینی مدارس اور تربیت اساتذہ

مولانا محمد طاہر مدنی ☆

### ۱۔ اسلام اور علم

اسلام اور علم میں کچھ ایسا ہی رشتہ ہے جیسا انسانی جسم اور اس میں بسنے والی روح کا، اسلام اگر جسم ہے تو علم اس کی روح، اور بغیر روح کے جسم کا تصور ناممکن ہے۔ دنیا میں بہت سے مذاہب پائے جاتے ہیں مگر اسلام میں علم، طلب علم اور تعلیم کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ غیر معمولی اور لاثانی ہے اور فکر انگیز بھی۔ پہلی وحی الہی میں نبی امی کو جو خدائی حکم ملتا ہے وہ یہ ہے۔ اقرأ باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم (علق: ۱-۵)۔

(یعنی پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا انسان کو جسے ہوئے خون کے لوتھڑے سے، پڑھیے آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہیں جانتا تھا)

ان آیات مبارکہ میں نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے اور پھر پڑھنے کی اہمیت بتادی جاتی ہے۔ یعنی قلم کا ذکر کر دیا جاتا ہے قلم ہی وہ واسطہ ہے جو انسانی تہذیب و تمدن کا ضامن ہے اور محافظ بھی، اسی کے ذریعہ انسان وہ علم سیکھتا ہے جو اسے معلوم نہیں، انسانی علم محض جبل نہیں

☆ جامعۃ الفلاح، بلریانگ، اعظم گڑھ

ہوتا کسی بھی ہوتا ہے اور اس میں روزمرہ اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہم اپنے آباء و اجداد کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے ذاتی علم کا اس میں اضافہ بھی کرتے رہتے ہیں اور بالآخر اس کو آئندہ نسلوں تک منتقل بھی کر دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات قرآنی میں آنحضرت ﷺ کو پڑھنے کا حکم دینا ہمیں سوچنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے بعد کے ۲۳ برسوں میں جو کلام الہی نازل ہوا اس میں متعدد آیات ایسی ملتی ہیں جن میں علم کی تعریف اور اس کی اہمیت سمجھائی گئی ہے۔

امام غزالی نے ”احیاء علوم الدین“ کی جلد اول کے پہلے باب ”علم کے فضائل“ میں ہی اس ضمن میں قرآنی حکم کی ۲۲ آیات مبارکہ اور ۱۵۵ احادیث نقل کی ہیں ان میں سے چند پیش خدمت ہیں۔

شهد الله انه لا اله الا هو والملئكة واولو العلم، قائماً بالقسط (آل عمران: ۱۸)۔

”اور گواہی دی اللہ نے اس کی کہ بجز اس کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں، اور فرشتوں نے اور اہل علم نے بھی اور معبود بھی وہ اس شان کے ہیں کہ اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں۔“ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے گواہی کی ابتداء اولاً اپنی ذات سے فرمائی پھر فرشتوں کا ذکر فرمایا اور بعد ازاں اہل علم کا۔ علم کے عز و شرف کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے۔ ”انما يخشى الله من عباده العلماء“ خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہوتے ہیں۔

”قال الذي عنده علم من الكتاب انا آتيك به“ (النمل: ۴۰) جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا کہ میں اس تخت کو تیرے سامنے لاسکتا ہوں۔ مطلب یہ کہ تخت کو چشم زدن میں لانے کی قدرت علم کی بنا پر تھی۔ ”وتلك الامثال نضربها للناس، وما يعقلها الا العالمون“ (عنکبوت: ۴۳)۔

ہم اس قرآن کی مثالوں کو لوگوں کو سمجھانے کے لئے پیش کرتے ہیں۔ ان مثالوں کو



بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔ اب چند احادیث مبارکہ پیش خدمت ہیں:

☆ اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے اسکو (دین کا) علم اور سمجھ دیتا ہے (بخاری، مسلم)۔

☆ علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں (ابوداؤد، ترمذی)۔

☆ زمین و آسمان کی تمام چیزیں علماء کے لئے دعاء مغفرت کرتی ہیں (ابوداؤد، ترمذی)۔

☆ قیامت کے دن تین آدمیوں کی شہادت قبول ہوگی، انبیاء کی، علماء کی، اور پھر

شہیدوں کی (ابن ماجہ)۔

☆ عالم کی فضیلت، عابد پر ایسی ہی ہے جیسے چودہویں کے چاند کی تمام ستاروں پر (ترمذی)۔

یہاں ایک بات ضمناً عرض ہے۔ مذکورہ احادیث میں عالم سے مراد دین کا صحیح علم رکھنے

والے ہیں صرف سند یافتہ حضرات نہیں، علاوہ ازیں ”گود سے گور تک علم حاصل کرنے، طلب علم کو

مسلمانوں کے لئے فرض کیے جانے، جیسے متعدد اقوال مبارکہ کو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہو گیا

ہے۔ یہ اس زندگی کی بات تھی۔ اب اس زندگی کے بارے میں مسلم کی روایت دیکھیں:

”جب ابن آدم مر جاتا ہے تو اس کے عمل کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں سے

منقطع نہیں ہوتا، ایک علم سے جس کا فائدہ اوروں کو ہو، ایک صدقہ جاریہ سے، اور ایک صالح

اولاد سے جو اسکے لیے دعاء مغفرت کرے۔“ اسلام کے نزدیک علم، تہذیب، اخلاق اور ذہن و فکر

کی تربیت کا ایک وسیلہ ہے۔ اس سے انسان میں صلاح و کمال اور پختگی پیدا ہوتی ہے اور وہ تدبیر

اور تفکر کا عادی ہوتا ہے سائنس اکتساب علم اور غور و فکر کا ایک عمل ہے اور اس ضمن میں جو سائنسی

تجربے اور عملی اقدامات کئے جاتے ہیں ان کو ٹکنالوجی کہتے ہیں قرآن مجید نے خود اسکی ترغیب

دلائی ہے۔ اس نے کائنات کا دقت نظر سے مطالعہ کرنے، اس کے نظام اور اسکی مخلوقات پر غور

کرنے، فکر و نظر اور تدبیر سے کام لینے کی بار بار دعوت دی ہے۔ اور اشیاء کے حقائق کو معلوم کرنے

اور انفس و آفاق کا مشاہدہ کرنے کی پیہم تلقین کی ہے ارض و سما اور بحر و بر کے انسان کے لئے مسخر

کیے جانے کے نتیجہ میں حیات و کائنات اور وسائل کی تحقیق و جستجو کا مطالبہ کیا ہے فرمان الہی ہے:

”وَسَخَّر لَّكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ“ (جاثیہ: ۱۳)۔

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ بیشک اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

”قُلْ اَنْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ (یونس: ۱۰۱)۔ ان سے کہو زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ اور خود انسان کے اپنے وجود کے اندر جو نشانیاں پوشیدہ ہیں انکی تلاش و جستجو کی اس طرح دعوت دی گئی ہے ”زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے اور خود تمہارے اپنے وجود میں۔ کیا تم کو سو جھتا نہیں“

و فِي الْاَرْضِ آيٰتٌ لِّلْمُوقِنِ وَ فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تَبْصُرُوْنَ (زاریات: ۲۱)۔  
اور اس ضمن میں نبی آخر ﷺ کی یہ دعا بھی پیش نظر رکھیں:

اللهم ارنی حقائق الاشیاء کما هی (خداوند مجھے اشیاء کی اصل نوعیت کا علم عطا فرما)۔

یہ تو صداقت اور حقیقت ہے کہ ایک مسلمان کے لئے علم کا سرچشمہ قرآن حکیم اور اس کی فکری و عملی تشریح، احادیث رسول اللہ ہے قرآن کی ۶۶۶۶ آیات مقدسہ میں صرف عقائد و وظائف کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ ایک محقق کے بقول ان میں سے سینکڑوں سے زائد کا تعلق، اس ہر لمحہ وسیع تر ہوتی جاتی کائنات اور اس کے داخلی اور خارجی مظاہر سے ہے جن پر غور و فکر کے لئے متحرک کیا گیا ہے امام غزالی کی تحقیق کے مطابق، صرف نظم کائنات سے متعلق، مختلف اسلوب میں ۷۶۳ جگہوں پر غور و فکر کے لیے ابھارا گیا ہے۔ ”لعلکم تعقلون، لعلکم تفکرون، لعلکم تذکرون“  
فرما کر آخر کس بات پر متوجہ کیا گیا ہے کیا یہ سب دلائل ربوبیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے نہیں

ہیں جو مظاہر عالم پر غور و فکر کے باعث ظہور میں آتے ہیں؟ ترمذی کی ایک حدیث شریف ہے:

”قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔“ یعنی ہم غور و فکر کرتے رہیں اور اسرار عالم دریافت کرتے رہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے وہ تمام علوم حاصل کیے جو ان سے پہلے موجود تھے، مگر انہوں نے کسی علم و فن، کسی تہذیب و تمدن اور مذہب کو اپنے اوپر مسلط نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی دینی خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے تحصیل علم کو اولیت دی خواہ وہ کسی ملک کا ہو۔ کیونکہ:

(الحکمة ضالة المؤمن) حکمت و دانائی مومن کی گم شدہ متاع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری صدی ہجری سے لیکر بعد کی کئی صدیوں تک مسلمانوں کی تعلیمی درس گاہیں، تجربہ گاہیں اور علمی مراکز تعلیم، سائنس و تحقیق و انکشافات کا گہوارہ بنی رہیں، جہاں سے بے شمار مفکرین، دانشوران اور ماہرین علوم، سائنس دان تک پیدا ہوئے جنہوں نے طبیعیات، ریاضی، جیومیٹری، الجبر، طب، ہیئت، ارضیات وغیرہ میں تحقیقی معلومات کا انبار لگا دیا، آج کی سائنس، انہیں ہمارے سائنس دانوں اور مفکرین کی رہن منت ہے۔

آج ان ذروں کو بھی باز اپنی تابانی پر ہے

تیرے در کا نقش سجدہ جن کی پیشانی پر ہے

حقیقت یہ ہے کہ ہم قرآن کے ایک حصہ کو ضروری اور بعض احکام کو ”غیر ضروری“ نہیں قرار دے سکتے۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو ہماری روش یہود و نصاریٰ کی طرح ہو جائے گی جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ اَفْتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (بقرہ: ۸۵)۔

کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو۔

۲۔ دینی مدارس: ابتدا اور ارتقاء

اسلام میں مدارس کی ابتداء خود حضور اکرم ﷺ کے دست مبارک سے ہوئی۔ ہجرت

کے بعد جب مسجد نبوی تعمیر ہوئی تو اس کا ایک حصہ، تعلیم گاہ کے طور پر مخصوص کر دیا گیا۔ اس کو ہم صفہ کا نام دیتے ہیں۔ اس میں کچھ تو دن کے طالب علم اور کچھ دن و رات دونوں کے طالب علم شامل تھے۔ اس درس گاہ کے ابتدائی مرحلے میں، متعدد شعبے تھے جو متعدد لوگوں کے سپرد تھے، اس ضمن میں ابن ماجہ کی ایک حدیث کا مفہوم پیش کرنا مناسب ہوگا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ اپنے حجرے سے نکل کر مسجد کے اندر آئے اور دیکھا کہ وہاں دو گروہ ہیں ایک گروہ تسبیح پڑھنے اور ذکر و اذکار میں مشغول تھا۔ دوسرا گروہ علم حاصل کر رہا تھا آپ نے فرمایا کہ اگرچہ دونوں گروہ اچھا کام کر رہے ہیں، لیکن وہ گروہ بہتر ہے جو تعلیم کا کام کر رہا ہے اور ”انما بعثت معلماً“ (یعنی میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) فرما کر اس گروہ میں بیٹھ گئے۔

درس گاہ صفہ میں ایک طرف ایسی چیزیں ملتی ہیں جن میں ایک طرف علم کی اہمیت بتانے کے ساتھ اس کے حصول کی ترغیب بھی دی جاتی ہے تو دوسری طرف ایسے انتظامات بھی نظر آتے ہیں جن کے باعث علم کا حصول آسان ہو جائے۔ مثال کے طور پر غزوہ بدر کے قیدیوں سے فدیہ کے بجائے یہ شرط کہ وہ دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں۔

آپ مختلف علوم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ اور چاہتے تھے کہ مسلمان ان علوم کو سیکھیں۔ قرآن حکیم پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں بے شمار علوم کا ذکر ہے کلام اللہ میں صرف دینی عقائد، اخلاقیات اور عبادات کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ قرآن سارے بنی آدم کی تاریخ ہے اور اس میں ان علوم کا بھی ذکر ہے جنہیں ہم سائنس کہتے ہیں۔ مثلاً: نباتات، حیوانات، علم حجر، علم بحر، علم ہیئت یہاں تک کہ علم جنس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ بقول سید امیر علی:

”قرآن خود علم و سائنس پر شاہد ہے“ اور حاجی خلیفہ کی ”کشف الظنون“ سے ایک حدیث بھی دیکھیں ”صانع حقیقی کے کاموں پر ایک گھنٹہ کا فکر و تامل، ستر برسوں کی عبادت سے بہتر ہے۔“ آپ علم طب و جراحات کی بھی سرپرستی فرماتے تھے۔ اور دیگر ضروری علوم۔ مثلاً عسکریات..... وغیرہ کے سلسلے میں بھی لوگوں کو تربیت دیتے تھے، ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ



حضور ﷺ نے اپنے خاص کاتب وحی، حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ عبرانی زبان بھی سیکھ لیں۔ چنانچہ آپ کو چار زبانیں آتی تھیں۔ عربی، عبرانی، قبطی اور فارسی۔ بیہقی کی ایک حدیث ہے: ”علم حاصل کرو چاہے وہ چین میں ہی کیوں نہ ہو“ محدثین تکنیکی اعتبار سے اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ مگر بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ ”عقلی اور تاریخی اعتبار سے اعتراض کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی بشرطیکہ ہمارا مطالعہ ذرا وسیع ہو اور اپنی علمی میراث سے زیادہ واقفیت ہو۔ خیال ہے کہ چین کے ریشمی کپڑوں کی صنعت اور چین سے عرب تک کی چھ ماہ کی مسافت اس کی وجہ ہوگی۔“

درس گاہ صفہ کی ایک خصوصیت اور تھی۔ یہاں حکام و عوام، کالے و گورے، عرب، غیر عرب، آزاد و غلام، بغیر کسی امتیاز کے حصول علم میں مصروف رہا کرتے تھے۔ آپ کی حیات مقدسہ میں ہی، مدینہ منورہ کی مساجد میں نو مدرسے قائم ہو چکے تھے اور آپ صحابہ کرامؓ کو یہ آیت کریمہ سناتے تھے:

قل هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون (زمر: ۹) ”پوچھئے! کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں“۔ دراصل حضور کی تشریف آوری کے بعد، شورائی حکومت الہیہ کا مستقر مدینہ، مرجع خلافت بن گیا تھا۔ نہ صرف عرب کے مختلف حصوں سے بلکہ دور دراز ملکوں سے بھی طالبان حق، جوق در جوق آنے لگے تھے۔ ان میں بیشتر لوگ تحصیل علم اور پیغمبر اسلام کی باتیں سننے کے لئے عازم مدینہ ہوئے۔ پیغمبر اسلام کا ایک محبوب موضوع علم کی قدر و منزلت تھا ایک فرمان رسول ہے ”علم حاصل کرو کیونکہ جو شخص راہ حق میں علم حاصل کرتا ہے وہ ایک تقویٰ کا کام انجام دیتا ہے۔“

سید امیر علی ”روح اسلام“ میں بجا طور پر لکھتے ہیں:

”رسول عربی کو علم اور سائنس سے جو محبت تھی وہ آپ کو دوسرے تمام معلمین دین سے امتیاز بخشی ہے اور جدید دنیا کے فکر سے آپ کو ایک نہایت قریبی رشتہ موانست میں منسلک کرتی ہے۔“ خلفاء راشدین کے دور میں بھی اس اسوۂ نبویؐ پر عمل ہوتا رہا فتوحات کے ساتھ

ساتھ لوگوں کی تعلیم کا بھی خاطر خواہ نظم ہوتا رہا تبلیغ دین اور حصول علم کا کام جاری رہا۔ امویوں کا زمانہ، مسلمانوں کے لئے آموزش اور آزمائش کا زمانہ تھا جس میں وہ اپنے کو اس عظیم کام کے لئے جو انہیں تفویض ہوا تھا، خود کو تیار کر رہے تھے عباسیوں کے عہد میں وہ ساری دنیا کے علم و فضل کے خزانہ دار بن گئے دنیا میں جہاں بھی کچھ ملا اٹھالائے اور مشتاقان علم کے سامنے رکھ دیا۔ ہر طرف مدرسے اور دارالعلوم بن گئے ہر شہر میں کتب خانے قائم ہو گئے، علم اور سائنس کے جو ماہرین ان مدارس میں پیدا ہوئے اور جنہوں نے کسی نہ کسی انداز سے انسانی ترقی کی راہ پر اپنے نقش پا چھوڑے ان کی فہرست اگر تیار کی جائے تو کئی جلدیں درکار ہوں گی اس کا ایک اجمالی تذکرہ ”روح اسلام“ کے باب نو میں مل جائے گا۔

یہ بات واضح ہو کہ یہ سب کچھ ان درس گاہوں میں ہوا جو صرف دارالعلوم اور مدرسہ کے نام سے معروف تھیں اور جن میں آج کی طرح ”دینی“ کا سابقہ نہیں لگتا تھا۔

### ۳۔ موجودہ صورتحال

سچائی یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کے لئے قرآن و سنت کی تعلیم اور اسلامی عناصر کے اجزائے ترکیبی کا فہم و شعور اسی قدر اہمیت رکھتا ہے جتنا عام زندگی کے لئے ہوا، پانی اور غذا۔ ہمارے دینی مدارس کے تعلیمی نظام نے مختلف ادوار میں مختلف انداز سے خدمات انجام دی ہیں، اگر ہماری تاریخ میں کچھ قابل فخر اور درخشاں کامیابیاں ہیں اور یقیناً ہیں تو اس میں ہمارے تعلیمی نظام کا بہت زیادہ ہاتھ ہے اگر ہمارے دامن میں نا کامیابیوں کے کچھ حصے اور کچھ ہزیمتیں ہیں تو ان کی ذمہ داری بھی نظام تعلیم ہی کی ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ دینی مدارس نے، ماضی بعید ہی نہیں، بلکہ ماضی قریب میں بھی، اپنی ہمہ جہتی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں۔ اپنے ملک ہندوستان ہی میں دیکھیں، ایک زمانہ تھا کہ ہمارے یہاں دینی اور غیر دینی کی تفریق نہیں تھی تقریباً ہزار سال

تک اسلامی دنیا اس تفریق سے نا آشنا رہی۔ جس نظام تعلیم کی پیداوار حضرت مجدد الف ثانی تھے اسی نظام کی پیداوار اسی دور کے تمام دوسرے اہل علم، ارباب سیاست و حکومت اور دیگر اہل علم و دانش بھی تھے حضرت مجدد الف ثانی اور سلطنت مغلیہ کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خاں، ہم درس تھے اور ایک ہی استاد کے سامنے زانوئے تلمذتہ کر کے تیار ہوئے تھے تاج اور دیگر عمارتیں تعمیر کرنے والا معمار احمد معمار نے جن درس گاہوں میں تعلیم پائی تھی انہیں میں شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم نے بھی علم حاصل کیا تھا۔

لیکن بعد ازاں ایک بڑا سانحہ ہوا، ہوا یہ کہ مسلم دنیا پر مغربی استعمار مسلط ہو گیا۔ ہندوستان میں بھی یہی ہوا، ہمارا تعلیمی نظام دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ دنیاوی اعتبار سے قیادت کی تیاری اور حصول علم کا سارا نظم ایک خاص سیاسی نظام کے سپرد کر دیا گیا اور مادی بے سرو سامانی اور نہایت نامساعد حالات میں دین کی حفاظت، اسلامی روایات کی پاسداری، قوم کی دینی تعلیم و تربیت اور دینی قیادت کی تیاری کا کام ایک دوسرے نظام نے سنبھال لیا۔

آج کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلم معاشرہ دین سے محبت کے جذبات رکھنے کے ساتھ اپنے رویوں سے، سیکولر رجحانات سے بھی کم و بیش اسی درجہ میں وابستہ ہے۔ لمحہ فکریہ یہ ہے کہ عوام ہی نہیں خود علماء کرام بھی، اس میں برابر کے شریک ہیں جو قائدانہ صفات سے عاری ہوتے ہیں معاشرہ نے بھی ان کے لئے، مسجد کی چہار دیواری، نکاح، جنازہ اور ختم شریف کا کردار مخصوص کر دیا ہے ایک اہم سوال یہ ہے کہ اس صورتحال کا ذمہ دار کون ہے؟ ہماری رائے میں صرف استعمار کو ذمہ دار قرار دینا اور اپنی ناکامیوں کی وجہ قرار دینا، آدھا سچ ہو گا اور آدھا ادھورا سچ، خود اپنے لئے تباہ کن ہوتا ہے۔

آج صورتحال یہ ہے کہ مختلف قوتیں، دینی مدارس سے متعلق ہر چیز کو الزامی مہم کے بل بوتے پر ختم کرنے یا کم از کم اسکی ہیئت تبدیل کرنے کی درپے نظر آ رہی ہیں۔ لیکن دینی مدارس کے حقیقی دشمن صرف یہی قوتیں ہیں یا بسا اوقات خود ان مدارس کے نظام کار، اور ان کے افراد،

اپنے خلاف وعدہ معاف گواہ کا کردار ادا کر رہے ہیں؟ ایک معروف دانشور سلیم منصور خالد کا یہ جملہ بھی یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا اپنے مقالہ ”دینی مدارس میں تعلیم“ میں لکھتے ہیں۔

”مسلم دنیا میں دینی و دنیوی تعلیم کی دو متوازی لہروں کو ملانے اور مختلف علمی روایات کو باہم مربوط بنانے کی کوئی سنجیدہ کوشش دکھائی نہیں دیتی۔ ملی تعلیمی ثنویت، مسلم معاشرہ میں ذہنی انتشار، روحانی اضطراب اور مادی ترقی کے بے رخنہ پن کی بنیاد ہے جس نے اسلام اور ملت اسلامیہ کے ساتھ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے گہرے تعلق اور تہذیبی احساس کو کمزور بنا دیا ہے۔“

حالانکہ تعلیم کی وحدت کے ساتھ نظام تعلیم کی یکسانیت، یکجہتی، ملت اسلامیہ کی یکجہتی، یک رنگی و یکسانیت کے لئے شرط لازم ہے۔ دراصل یہ دوئی بھی سیکولرزم کے فروغ میں معاون ہو رہی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ اسلامی تعلیمی نظام کے معنی اگر ایک طرف انفرادی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہے تو ساتھ ہی اپنے تہذیبی ورثہ کی حفاظت اور اس کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی منتقلی اور ترقی ہے۔ اسکے علاوہ، معاشرہ اور تہذیب کے لئے قوم و ملک کے لئے ایسی قیادت کی تیاری بھی ہے جو عصری علوم و فنون سے آراستہ ہو اور جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے قوم و ملک کے لئے ترقی مسلسل کی راہیں نکال سکے۔

### ۴۔ تربیت اساتذہ

عربی زبان کی ایک کہاوت ہے: الحق مر یعنی سچائی تلخ ہوتی ہے، مگر سچائی کا سامنا نہ کرنا تلخ تر نتائج کا حامل ہو جاتا ہے۔ دینی مدارس کے سلسلے میں سچائی یہ ہے کہ یہاں سرے سے اسکا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اس ضمن میں ایک ماہر تعلیم کا یہ تبصرہ پیش خدمت ہے: ”ہمارے یہاں درس نظامی میں اساتذہ کی تربیت کا کوئی نصاب موجود نہیں حالانکہ دنیا کے تمام نظام ہائے تعلیم میں اسکی اہمیت اور ضرورت مسلم ہے۔ مدارس میں عملاً یہ ہوتا ہے کہ اچھی استعداد اور ذوق رکھنے والا فاضل کسی نہ کسی مدرسہ میں تدریس کی جگہ حاصل کر لیتا ہے۔ اسکے بعد علماء کی ذہن



سازی اور فکری ترجیحات کے تعین میں وہ کسی اصول، ضابطہ، قانون اور متعین اہداف کا پابند نہیں ہوتا بلکہ یہ معاملہ اس کے ذاتی ذوق اور رجحان پر منحصر ہوتا ہے جس کا اثر لازماً طلبہ پر بھی پڑتا ہے۔“ ظاہر ہے ”سینہ بہ سینہ“ علم منتقل کرنے کا یہ طریقہ ممکن ہے کسی زمانہ میں کارآمد رہا ہو لیکن آج کے سائنس اور تکنیک کے دور میں یہ اذکار رفتہ ہو گیا ہے۔

تربیت اساتذہ دراصل ایک طرح کی فنی مہارت ہے اور فنی مہارتوں کی ہر دور میں اہمیت بدلتی رہتی ہے۔ عہد رسالت مآبؐ میں ایک اسلحہ تھا منجیق۔ ضرورت محسوس ہوئی تو آپؐ نے چند صحابہ کرامؓ کو یمن بھیجا کہ منجیق بنانا سیکھ کر آئیں۔ آپؐ نے طائف کے معرکہ میں اس کا استعمال بھی کیا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اور ابن تیمیہؒ نے ”السیاسة الشرعية“ میں لکھا ہے کہ ایسی تمام مہارتوں اور تخصصات کا حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ ہے جن کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان غیروں کے محتاج بن کر رہیں یعنی اپنے تمام دینی و دنیوی معاملات میں خود کفیل بنانا مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ ہے۔ جہاں تک تربیت اساتذہ کا بطور خاص تعلق ہے، چند باتیں پیش خدمت ہیں۔

☆ کسی بھی عمل مسلسل میں استاد کی حیثیت کلیدی ہوتی ہے ایسی کہ اس کے اثرات نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں استاد کی اہمیت غیر معمولی نہ ہوتی تو یہ ارشاد گرامی نہ ہوتا ”میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں“ اس ضمن میں حکومت ہند کے قومی تعلیمی کمیشن کا یہ جملہ نقل کرنے کے لائق ہے ”کوئی بھی نظام تعلیم اتنا ہی اچھا ہوتا ہے جتنا کہ اس کا استاد“۔

☆ اب معلمی ایک فن اور ایک پیشہ بن چکا ہے اور آج کے سائنسی اور تکنیکی دور میں کوئی بھی پیشہ، بغیر پیشہ ورانہ تربیت کے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

☆ انگریزوں نے اس ملک میں اسکولوں کا جال بچھایا تو اساتذہ کی تربیت کا بھی نظم

کیا آزادی کے بعد بھی سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں تربیت یافتہ اساتذہ کی ہی تقرریوں پر زور دیا گیا۔ بروقت اس ملک میں آرائیں ایس کا، بچوں کے اسکولوں کا اپنا ایک متوازی نظام ہے اور اساتذہ کی تعلیم کا ان کا اپنا ایک انتظام بھی ہے

☆ ۲۰ کروڑ کی مسلم آبادی والے اس ملک میں مکاتب و مدارس کی تعداد لاکھوں اور ہزاروں میں ہوگی مگر شاید ہی کسی میں کوئی تربیت یافتہ استاد مل سکے نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق اس وقت مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دلتوں سے بھی بدتر ہے۔  
تو پھر کیا کیا جائے، ماتم و آہ وزاری سے تو کچھ ہونے کا نہیں،

بقول عرفی:

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال  
صد سال می ہی بہ تمنا گریستن

دراصل ہمیں ضرورت ہے حقیقت پسندی اور مخصوص عزم و ارادے کی، تاکہ ہم تربیت کے اپنے ادارے قائم کریں، اپنے تربیت یافتہ کے مراکز قائم کرنے کی چند ایک وجہیں درجہ ذیل ہیں:

۱۔ مکاتب و مدارس کا سماجی، معاشی اور معاشرتی پس منظر، دیگر تعلیم گاہوں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔

۲۔ طلبہ و طالبات مسلم گھرانوں سے آتے ہیں جنکی اپنی مخصوص تہذیبی و ثقافتی روایات ہیں۔

۳۔ ان تعلیم گاہوں میں درس دینے والے معلمین / معلمات کا تعلق بھی عموماً اسی پس منظر سے ہوتا ہے

۴۔ ایک تربیت یافتہ استاد، بہتر طریقہ سے بچوں کو تعلیم اور تربیت دے سکتا ہے اور کم

محنت اور وقت میں بہتر عملی نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ معیار تعلیم بلند ہو سکتا ہے۔ تعلیم میں بچوں کا دل لگ سکتا ہے اور ”چھوڑ کر جانے والوں“ کی تعداد پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

۵۔ مکاتب اور مدارس کے اساتذہ کے لئے موجودہ بی۔ ایڈ کا نصاب بے فیض ہوگا۔ کیوں کہ اس نصاب کا مزاج سیکولر ہے جبکہ ہماری درسگاہوں کی بنیاد ”الدین“ ہے۔  
پیوند کاری کی افادیت ہمیشہ مشکوک ہوتی ہے۔

۶۔ بی ایڈ کا نصاب صرف فنی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے اور بدرجہ اتم کرتا ہے مگر دین اور اسکے متعلقات سے سروکار نہیں رکھتا۔ ہماری درسگاہوں کو ضرورت ہے ایسے اساتذہ کی جو فنی اعتبار سے بھی اعلیٰ ہوں اور فکری اعتبار سے بھی دینی اقدار کے حامل۔

۷۔ ہم کو ضرورت ہے ایک ایسے تعلیم اساتذہ کے مرکز کی جس میں فکری و فنی ہر دو ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہو۔ اسلئے، ہمارا خواب، ہمارا وژن یہ ہونا چاہیئے کہ مکاتب اور مدارس کے اساتذہ کی فکری و فنی تربیت کیلئے ایک ایسے ادارہ کی بنیاد رکھی جائے جس میں تعلیم و تربیت کے سبھی اہم پہلوؤں کو اس انداز سے منضبط کیا جائے کہ اساس قرآن اور سنت ہو۔ یہ کام دشوار ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اور کرنے کے لائق بھی ہے۔

## (۵) مرکز تعلیم اساتذہ، اسلامی تناظر میں

تقریباً 49 برس قبل، ملک کی دینی درسگاہوں میں ”قدیم و جدید“ کا قضیہ زوروں پر تھا۔ ضلع اعظم گڑھ، بالخصوص قصبہ بلریا گنج کے چند ذی شعور و مخلص لوگوں نے ”ایک خواب“ دیکھا۔ قدیم و جدید کی خوشگوار آمیزش کا۔ ایک چھوٹے سے ادارہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اور آج بفضلہ تعالیٰ ”جامعہ الفلاح“ سے ایک عالم آشنا ہے۔ اساسی اراکین میں سے چند اب بھی تعلیم کے ذریعہ دین کی خدمت میں مشغول ہیں مکاتب اور مدارس کی تعلیم و تربیت کو معیاری بنانے میں ان کو ”تربیت اساتذہ“ کی ضرورت اور اہمیت کا شدید احساس ہے ان لوگوں نے پھر ایک خواب

دیکھا ہے اور اسکی عملی تعبیر کے لیے کوشاں ہیں منصوبہ تو کئی سال قبل بن گیا تھا دو سال قبل اسکو ایک کتابچہ کی شکل میں شائع بھی کیا گیا عنوان تھا ”مرکز تعلیم اساتذہ۔ اسلامی تناظر میں“۔

الحمد للہ ملت کے بہت سے دانشوروں نے نہ صرف مثبت رد عمل کا اظہار کیا بلکہ مفید مشورے بھی دیئے اور اصرار کیا کہ اس منصوبہ کو جلد از جلد عمل میں بھی لایا جائے چنانچہ گزشتہ ۶،۵ مئی کی منعقدہ جامعہ کی مجلس شوریٰ میں اس کی منظوری مل گئی اور ۷ مئی ۲۰۱۰ء کو باقاعدہ ”مرکز تعلیم اساتذہ“ کا قیام عمل میں آگیا، انشاء اللہ العزیز اس پروگرام سے، جس کی اساس قرآن و سنت ہے، ملک کے دینی مدارس کی یہ ضرورت ایک منفرد انداز میں پوری ہوگی۔

آج اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کی پیش رفت سے آپ بھی ذی علم حضرات کو واقف کرادیا جائے۔

☆ ایک مثبت اور حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ہمیں، عارضی طور پر عمارت کی سہولت حاصل ہوگئی ہے۔

☆ ہمیں اسباق کی تدریسی مشق کے لیے، ابتدائی و ثانوی درجات کے طلبہ و طالبات بھی میسر ہیں۔

☆ اس جامعہ کے بہت سے معلمین و معلمات نے اس پروگرام میں شامل ہو کر باضابطہ تربیت یافتہ ہونے کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے۔

☆ حاصل شدہ عمارت کے ایک کمرے میں ایک دارالتحقیق قائم کر دیا گیا ہے کمرہ ضروری فرنیچر سے آراستہ ہو گیا ہے اور مطلوبہ کتابیں و رسائل آنا شروع ہو گئے ہیں فی الحال اس کے لیے ایک لاکھ روپے کی رقم مختص کر دی گئی ہے۔

☆ اس اختراعی منصوبہ کو پیش کرنے والے شخص ڈاکٹر ابرار اعظمی کو اس کانگریس مقرر کر دیا گیا ہے، ایک مجلس تعلیمی نے کام کرنا شروع کر دیا ہے، مخصوص طرز کے اس پروگرام کے نصاب



تعلیم کی تیاری کا کام بفضلہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔

☆ اللہ کا کرم ہے کہ ہمیں چند ایسے دانشوروں کا تعاون بھی حاصل ہو گیا ہے جو ماہرین فن ہونے کے ساتھ دینی شعور بھی رکھتے ہیں، لیکن ہمارے سامنے ایک بڑا مسئلہ بھی ہے، معقول معاوضہ کے باوجود ہمیں کام کرنے والے افراد نہیں مل رہے ہیں۔

ہم نے اللہ کا نام لیکر اس کے نصرت کے سہارے آغاز کار کر دیا ہے لیکن ہندوستان کی حد تک یہ منصوبہ بالکل نیا ہے اور منفرد بھی، یقین ہے اس محفل کے ذی علم اور دور اندیش شرکاء کرام پر اسکی افادیت واضح ہوگی۔ ہمیں اس سلسلے میں آپ کے قیمتی مشوروں، بیش قیمت آراء اور مخلصانہ تعاون کی پوری امید ہے، آپ کے استفسارات کا ہم خیر مقدم کریں گے اللہ عزوجل آپ کو جزاء خیر سے نوازے۔

کتابیں جن سے استفادہ کیا گیا

- ۱۔ الغزالی (امام ابو حامد محمد) احیاء العلوم الدین (ترجمہ ندیم الواجدی) ۲۰۰۱ء، دار الکتاب، دیوبند
- ۲۔ امیر علی (سید) روح اسلام۔ ۱۹۸۶۔ اسلامک بک سنٹر، نئی دہلی
- ۳۔ حمید اللہ (ڈاکٹر محمد) خطبات بہاول پور۔ ۱۹۹۷ء، اسلامک بک فاؤنڈیشن۔ دہلی
- ۴۔ سلیم منصور خالد۔ دینی مدارس میں تعلیم۔ ۲۰۰۲۔ عالمی ادارہ فکر اسلامی۔ اسلام آباد،
- ۵۔ شہاب الدین ندوی۔ اسلام میں علم کا مقام و مرتبہ۔ ۱۹۸۹ء، فرقانیہ اکیڈمی۔ بنگلور۔
- ۶۔ ایضاً۔ قرآن کا نظریہ علم۔ ۲۰۰۲۔ فرقانیہ اکیڈمی۔ بنگلور
- ۷۔ ضیاء الدین اصلاحی۔ مسلمانوں کی تعلیم۔ ۲۰۰۶۔ شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڑھ

☆☆☆

## دینی مدارس اور تربیت اساتذہ و معلمین

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مظفر پوری ☆

اس اہم موضوع کے لئے چند منصوص آیات و روایات:

(الف) الحمد لله رب العالمین (ب) رب ارحمہما کما ربیانی صغیرا  
(ج) ألم نربک فینا ولیداً (د) کونوا ربانیین بما کتم تعلمون الکتاب  
وبما کتم تدرسون (ه) هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلوا علیہم آیاتہ  
ویزکیہم ویعلمہم الکتاب (و) فیما رحمة من اللہ لنت لهم ولو کنت فظاً  
غلیظ القلب لانفضوا من حولک (ز) الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس۔

روایات

☆ حسن نیت و انابت الی اللہ: إنما الأعمال بالنیات

☆ خدا ترسی و تقویٰ: ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً (القرآن)۔

☆ علم و تحمل: کونوا ربانیین قال ابن عباس کونوا حلماً فقہاء علماء،

الربانی هو الذی یربى الناس بصغار العلم قبل کبارہ (کتاب العلم، بخاری)۔

☆ احساس ذمہ داری اور طلبہ کی ہمہ جہت نگرانی: الدین النصیحة، لا ایمان لمن

لا امانة له ولا دین لمن لا عهد له (مشکوٰۃ)۔

☆ قاضی شریعت دارالقضاء امارت شرعیہ، بہار دواڑیہ و جہار کھنڈ۔

- ☆ یسرو تیسیر: عن انسؓ عن النبی ﷺ قال یسروا ولا تعسروا (کتاب العلم بخاری)۔
- ☆ نفسیات کی رعایت: کان عبد اللہ بن مسعود یذكر الناس فی کل خمیس فقال له رجل: یا ابا عبد الرحمن لو ددت انک ذکرتنا کل یوم قال اما یمنعنی من ذلک انی اکره ان املکم وانی اتخولکم بالموعظة کما کان النبی ﷺ یتخولنا بها مخافة السامة علینا (بخاری کتاب العلم)۔
- ☆ افہام و تفہیم پر خصوصی توجہ: عن انسؓ عن النبی ﷺ کان إذا سلم سلم ثلاثاً وإذا تکلم بکلمة اعادها ثلاثاً (بخاری کتاب العلم)۔
- ☆ اہم مباحث کو قید تحریر میں لانا یعنی نوٹس تیار کرنا: سمعت ابا ہریرۃؓ یقول ما من اصحاب رسول اللہ اُحداً اکثر حدیث عنہ منی إلا ما کان من عبد اللہ بن عمروؓ فانه کان یکتب ولا اکتب (بخاری، کتاب العلم)۔
- ☆ طلبہ کی ذہنی و فکری سطح کی رعایت اور غامض مباحث و نکات کے تذکرہ سے اجتناب: قال علی: حدثوا الناس بما یعرفون أحبون ان یکذب اللہ ورسولہ (بخاری کتاب العلم) وکلم الناس علی قدر عقولہم (مسلم کتاب الایمان) عن عبد اللہ بن مسعودؓ قال: ما انت بمحدث قوماً حدیثاً لا تبلغہ عقولہم الا کان لبعضہم فتنة (مقدمہ مسلم)۔
- ☆ اجتماعی اختبار و شفائی امتحان: حدیث النخلہ
- ☆ ذویعہ علم قلم ہے، خواہ عہد جدید کا قلم: علم بالقلم
- ☆ کمپیوٹر سے کما حقہ استفادہ
- ☆ تشیط ذہن کے لئے جائز حدود میں کھیل کود کا موقع فراہم کرنا۔ ان نصوص کی روشنی میں تربیت کے تعلق سے اپنے کچھ تجربات اور بعض مشورے غیر مرتب لکھ دیئے ہیں اللہ تعالیٰ پورے ملک میں علوم دینیہ اور اسلامیہ کی جامعات اور کلیات نیز اہم تحقیقاتی مراکز میں مختلف موضوعات پر تدریسی تربیت کی راہیں پیدا فرمادیں (آمین)۔

## دینی مدارس اور تربیت اساتذہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ پورے عالم اسلام میں دین اسلام کی حفاظت و اشاعت کا اہم فریضہ معاہدہ علمیہ، مکاتب قرآنیہ اور مدارس دینیہ بڑے اہتمام و التزام کے ساتھ انجام دے رہے ہیں، اور مسلمانوں کی فکری علمی اور اخلاقی نیز امور دینیہ کے سرحدوں کی حفاظت ان ہی دینی مدارس کے ذریعے ہو رہی ہے، ان دینی مدارس نے اس ملک میں تقریباً پونے دو سو سالہ تاریخ میں جس جہد مسلسل اور عمل پیہم کے ذریعے ثمر آور کاوشیں کی ہیں، یقیناً وہ تاریخ ہند کے روشن ابواب ہیں، ان دینی مدارس نے بھی بادشاہوں اور حکومتوں کے سایہ سے دور رہ کر خوشی و مسرت، پریشانی و تنگ دامانی کی حالت میں بھی قناعت پسندی کے ساتھ دین و ایمان کی ہمیشہ سے مخلصانہ صیانت و حفاظت کی ہیں، شہری سہولیات سے دور اور صبر آزما حالات میں بھی دین کے ان قلعوں سے مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی حفاظت ہوتی رہی ہے، ان کی دعوتی محنتیں، مختلف موضوعات اسلامی پر ان کے تصنیفی کارنامے اور علوم شریعت اسلامی پر کئے جانے والے دشمنان اسلام کے بیجا اعتراضات کا مسکت جواب اور اعلاء کلمہ حق جیسے امور کو انہوں نے اپنا فرض منصبی بنایا، ولیظہرہ علی الدین کلمہ جو بعثت نبوی کا مقصد ہے اس کا رنبوت میں مصروف ہے۔

دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں انہیں مقاصد کے پیش نظر ایسی کتابیں شامل کی گئیں، جس کی روشنی میں شریعت پر چلنا آسان ہو اور جن کی تعلیم سے طلباء میں اشاعت اسلام اور حفاظت اسلام کا حوصلہ اور جذبہ صادق پیدا ہو سکے، چنانچہ اس حقیقت سے کوئی بھی صاحب عقل شخص انکار نہیں کر سکتا کہ دینی مدارس نے ملک کو بااخلاق باکردار امن پسند، غم گسار، حق پرست،



ایماندار، اور اخلاق کریمانہ اور صفات مومنانہ سے مزین ایسے لاکھوں شہری پیدا کرتے رہے ہیں کہ ملک کے دوسرے تعلیمی ادارے اور جامعات کسی بھی درجے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ابتداء میں دینی مدارس کے طریقہ تعلیم میں خصوصی تربیت کا طریقہ رائج تھا جس میں کوئی صاحب علم شخصیت اپنے تلامذہ کو مختلف علوم و فنون کی وہ تمام اہم کتب کا درس دیتے جو اسے قرآن و سنت کے فہم میں معاون ہوتیں، اس طرح ایسا طالب علم کسی ایک استاذ سے کسب فیض کر کے اگر ضرورت محسوس کرتا پھر کسی دوسرے فن کے ماہر کے پاس زانوئے تلمذتہ کرتا، مگر وقت کی تبدیلی کے ساتھ یہ طریقہ بھی بدلتا گیا۔ اور طلبہ کی کثرت کے پیش نظر بڑے بڑے مراکز قائم ہوئے، اور کلاس سسٹم کے نظام کو اہل مدارس نے اپنایا اس نظام تعلیم کے نتیجے میں دینی مدارس کا نصاب تعلیم آٹھ دس سال پر مشتمل تیار کیا گیا، پھر مختلف فنون کے ماہرین اپنے فن سے متعلق کتابوں کا درس دینے لگے، آج کل مدارس میں یہی طریقہ تعلیم رائج ہے، ان دونوں نظام تعلیم میں ایک بنیادی فرق ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ پہلے اساتذہ کرام کی تعداد کم ہوتی تھی، جو صاحب علم اپنے فن میں تجربہ کی صلاحیت سے مالا مال ہوتے وہی درس و تدریس کے مشغلہ کو اپناتے اور طلبہ بھی ان ہی سے شرف تلمذ حاصل کرتے، ظاہر ہے ایسے صاحب علم حضرات جنہوں نے درس و تدریس کی دنیا میں اچھا خاصا وقت گزارا ہو، اس راہ کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہوں، طلبہ کے نفسیات سے واقفیت، کتابوں کا طریقہ تدریس اور افہام و تفہیم کا ان کے اندر بہترین ملکہ ہوا ایسے تجربہ کار حضرات سے استفادہ یقیناً انتہائی نفع بخش اور فائدہ مند رہا ہے اور آج بھی ہے۔

مگر آج کے حالات یکسر بدل گئے ہیں، دینی مدارس سے ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں طلبہ سند فضیلت حاصل کر کے مختلف عملی میدان کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کے مشغلہ کو اپناتے ہیں، اس سے انہیں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ یقیناً ان کے اندر عربی زبان کی سوجھ بوجھ پیدا ہو جاتی ہے۔ عربی عبارتوں کا وہ ترجمہ بھی کر سکتے ہیں، آیات قرآنی اور احادیث مبارکہ کی تشریح

بھی کر سکتے ہیں کتب فقہ سے مراجعت کے بعد وہ لوگوں کو دینی و شرعی مسائل سے آگاہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، اصول حدیث، اور اصول فقہ کے بنیادی مباحث بھی ان کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں مگر کیا درس و تدریس کے لئے ان کے اندر ان علمی صلاحیتوں کا پایا جانا کافی ہے، کیا یہ صلاحیتیں انہیں ان کی درس و تدریس والی زندگی کے لئے مکمل طور پر رہنمائی کر سکتی ہیں؟ اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو جواب نفی میں ملے گا کیونکہ ایسا شخص تو باصلاحیت مفسر، باکمال محدث، ممتاز فقیہ بن سکتا ہے، مگر ایک کامیاب مدرس بننے میں انہیں کچھ دیر لگے گی، درس و تدریس کے جوار کان ہیں جن میں خاص طور پر استاد کے اندر اس فن پر دسترس طلبہ کی نفسیات سے واقفیت، موضوع کو سہل اور عام فہم انداز میں طلبہ کے سامنے پیش کرنا اور اسے طلبہ کے ذہن میں بیٹھا دینا، مشکل موضوعات کو آسان سے آسان تر بنا کر پیش کرنا، تعلیمی ماحول اور درس گاہ کی رعایت، وسائل تعلیم سے استفادہ وغیرہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے ایک باکمال استاد کا متصف ہونا ضروری ہے، اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے فارغین اور فضلاء ان امور سے اکثر ناواقف ہوتے ہیں، ایک باکمال استاد کے لئے ماہرین فن کے مطابق کن صفات سے مزین ہونا ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں بعض ماہرین تعلیم نے اساتذہ کے مطلوبہ صفات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے بعض صفات کا تعلق خود استاد کی ذات سے ہے، اور بعض کا تعلق مشغلہ تدریس سے ہے، استاد کی ذات سے متعلق چند اہم صفات ہیں، جس کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ مشغلہ درس و تدریس سے اسے غیر معمولی محبت ہو، اور وہ اسے نہایت دلچسپی اور شوق و لگن سے ادا کرتا ہو۔

۲۔ اس کی شخصیت متوازن ہو، کب نرمی کا مظاہرہ کرتا ہے اور کب سختی سے طلبہ سے پیش آتا ہے ان مواقع سے خوب واقف ہو جیسا کہ آیت کا اشارہ ہے ”الكاظمين الغيظ والعافين عن الناس والله يحب المحسنين“ (آل عمران) اور حضور ﷺ سے اللہ کا

خصوصی انعام یہی ہے ”فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك“۔

۳۔ جسمانی لحاظ سے صحت مند ہو۔

۴۔ نفسانی لحاظ سے انفعالی صورت حال سے دو چار نہ ہو۔

۵۔ ظاہری نظافت کا اہتمام، خاص طور پر علم کتاب و سنت کے اساتذہ کرام کے لئے

اس کا اہتمام اور بھی ضروری ہے۔

۶۔ فصاحت بیانی، صاف گفتگو، واضح آواز، انداز بیان کی شگفتگی، لہجہ کی خوبصورتی کی

صفات سے متصف ہونا بھی ایک اہم صفت ہے۔

۷۔ ذہانت و تیقظ کے ساتھ تدریسی مشکلات کو اپنے مطالعہ سے بخوبی حل کرنے کی

استعداد ہو۔

۸۔ فن پر مکمل عبور ہو، اس لئے کہ اساتذہ کی غلطی طلبہ میں ان کے بارے میں عقیدت

کی کمی کو پیدا کرتی ہے۔ اور دھیرے دھیرے ایسے کلاس میں طلبہ کی حاضری کم ہونے لگتی ہے۔

۹۔ ”کلم الناس علی قدر عقولهم“ کی روشنی میں موضوع کے اہم اور اساسی

مواد کو نوٹ کرانا، غیر ضروری مباحث سے احتراز اور تمامی وہ اقوال جو شروحات میں ہوں سبھوں

کے بیان سے اجتناب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اہم اور ضروری مواد ذہن سے نکل جاتے ہیں اور صرف

ضمنی نکات اور اقوال یاد رہتے ہیں اور اس طرح موضوع تشنہ رہ جاتا ہے۔

۱۰۔ وسعت مطالعہ، خاص طور پر دور جدید کے حالات سے واقفیت۔

۱۱۔ اوقات درس کی پوری پابندی اور مدرسہ کے قوانین کا پورا احترام۔

عمل تدریس سے متعلق حضرات کے لئے کچھ ضروری امور کی رعایت

۱۔ طلبہ کے عزت نفس کا پاس و لحاظ، اس کے حقوق کی ادائیگی نیز اس کی ضروریات کی

رعایت کرنا۔

۲۔ درسگاہوں کو منظم کرنا اور اس کے لئے ضروری آلات و وسائل تعلیم سے اسے

مزین کرنا

۳۔ طلبہ کو آپس میں گفتگو کا موقع فراہم کرنا تاکہ وہ اپنی غلطیوں کی آپسی گفتگو سے

اصلاح کر سکیں درسگاہ میں طلبہ کو سوالات کرنے پر ابھارنا۔ معقول سوال کی تحسین کرتے ہوئے اس کا جواب اسی وقت یا دوسرے وقت دینا۔

۴۔ مدرسہ کی مختلف انجمنوں اور پروگراموں میں شرکت کے لئے طلبہ کو متوجہ کرنا اور

اس کے لئے مختلف عنوانات بتانا اور اس موضوع کے لئے رہنما مستند کتابوں کی نشاندہی کرنا۔

۵۔ نامناسب امور کے بارے میں طلبہ کو اچھے تعامل کا مظاہرہ کر کے سمجھانا۔

۶۔ صرف نظری تعلیم پر اکتفا نہ کرنا بلکہ اس کے ساتھ عصری تقاضا کے مطابق اسے عملی

انداز میں پیش کرنا۔

۷۔ طلبہ میں دوران درس نشاط اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے حکیمانہ پاکیزہ لطائف کرنا۔

۸۔ طلبہ کے کاموں اور ان کی صلاحیتوں کی قدر کر کے ان کے اندر ترقی اور آگے

بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرنا۔ اس کے لئے اچھے جوائز علمیہ اور تشجیعی انعامات دے کر حوصلہ افزائی

کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان صفات سے مزین ہونے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ استاد خود ان صفات

سے واقف ہوں۔ ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح پڑھنا ایک فن ہے،

اور بغیر سیکھے کوئی کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتا ہے اسی طرح پڑھانا بھی ایک فن ہے اس کی تربیت حاصل

کئے بغیر اس راہ میں قدم بڑھانا مشکل امر ہے، درس و تدریس کے تربیت یافتہ اساتذہ کا سب

سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اساتذہ کرام اپنی بات کو کم وقت اور سہل الفاظ میں طالب علموں تک

پہنچا سکتے ہیں، اور غیر تربیت یافتہ اساتذہ کرام کے مقابلہ میں بہت جلد ایسے اساتذہ طلبہ کے



لئے زیادہ فائدہ مند اور کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

انسانی معاشرہ میں تربیت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا انسان پیدائش سے لے کر وفات تک زندگی کے مختلف مرحلوں اور شعبہ جات میں تربیت کا محتاج ہوتا ہے، دنیاوی امور کے ساتھ ساتھ دینی امور میں بھی تربیت حاصل کئے بغیر انسان خدا اور رسول کو نہیں پہچان سکتا، نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی کی اہم حیثیت ربی اعظم کی ہے، قرآن کریم نے منصب نبوت کا ایک اہم فریضہ تربیت سازی کا بتایا ہے ”ویزکیہم (الجمعه)“ امام بخاری علیہ الرحمہ نے کتاب العلم کے باب نمبر ۱۲ کے ذیل میں ”کونوا ربانیین“ کے ذیل میں حضرت عبداللہ بن عباس کا قول نقل فرمایا ہے کہ ”کونوا حلما ً فقہاء ً علماء ً الربانی الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارہ“ آیت قرآنی ”کونوا ربانیین“ کی تفسیر کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ ربانیین سے مراد ایسے لوگ ہیں جو لوگوں کو ابتدائی تعلیم و تربیت دیتے ہیں ”الذی یعلم الناس صغار العلم قبل کبارہ“ تاریخ و سیر آپ ﷺ کی صحابہ کرام کی تربیت کے واقعات سے پُر ہیں آپ نے حضرت موسیٰ اشعریؒ کو اور حضرت معاذ بن جبلؒ کو جب قاضی اور عامل (زکوٰۃ کی وصولی کے لئے) روانہ فرمایا تو آپ نے پہلے ان صحابہ کرام کی تربیت فرمائی۔

آپ ﷺ کی تربیت ہی کا ایک پہلو وہ ہے جس میں آپ نے تعلیم کی اہمیت و ضرورت بیان کرتے ہوئے طالب علم کی فضیلت ارشاد فرمائی کہ جو شخص علم دین کے حصول کے لئے راستہ میں نکلے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمادیں گے (مسلم شریف) اسی طرح تربیت کی ضرورت پر حدیث شریف کے اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے جس میں آپ نے افعال نماز کی تربیت ایک شخص کو دی، آپ نے صحابہ کرام کو سوالات کرنے کی تربیت دی اور اس پر ابھارا، اور فرمایا کہ علمی پیاس کی سیرابی تو سوال کرنے سے ہوتی ہے، اسی طرح آپ نے صحابہ کرام کو اخذ و استنباط کی تربیت دی، جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ

کرام سے ایک ایسے درخت کے بارے میں دریافت فرمایا کہ جس کا پتہ نہیں گرتا، اور اس کی مثال ایک مومن کی طرح ہے، آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو علمی مناقشہ اور اصل مرجع کی طرف رجوع ہونے کی تربیت فرمائی، حضرت عائشہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہیں کسی شرعی مسئلہ کے بارے میں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی، یا کوئی اشکال ہوتا تو فوراً رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع ہوتیں۔

آپ ﷺ نے جہاں اجتماعی تربیت سازی فرمائی ہے، وہیں انفرادی طور پر آپؐ نے صحابہ کرامؓ کی تربیت کی ہے اس لئے ہمیں احادیث کی کتابوں میں بہت سے واقعات جمع کے صیغے سے ملتے ہیں مثلاً: ”کنا نسمع“ اور جب کے بہت سے واقعات واحد کے صیغہ سے ملتے ہیں جیسے: ”علمنی رسول اللہ ﷺ“ تعلیم و تربیت کے باب میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جب کسی اہم موضوع کے بارے میں بتانا ہو تو اس سے پہلے موضوع سے متعلق کچھ ایسے کلمات کہے جائیں جس سے مخاطب اور سامعین کے دل میں شوق و رغبت پیدا ہونے لگے جیسے رسول اللہ ﷺ نے غیبت کی شاعت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ”اتدرون ما الغیبة“۔

درس و تدریس میں اپنی بات کو طلبہ کے ذہن سے قریب کرنے کے لئے عصری آلات و وسائل تعلیم کا استعمال نہایت مفید ثابت ہوتا ہے اس کی مثال خود سنت نبویؐ میں ملتی ہے، بعض دفعہ آپؐ نے انگلی کے اشارے سے بہت سی باتوں کو سمجھایا ہے، مثلاً آپؐ نے یتیم کی کفالت کرنے والے شخص کے بارے میں دو انگلیوں کے اشاروں سے سمجھایا کہ جس طرح یہ دونوں انگلیاں آپس میں قریب ہیں اسی طرح یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں قریب ہوں گے (یتیم کے بارے میں ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا) ان سب کے ساتھ تربیت سے متعلق ایک اہم اصول یہ ہے کہ ہر وقت بچوں کے ذہن پر تعلیم کا بوجھ نہ دیا جائے، بلکہ انہیں آرام کھیل، کود اور ذہنی تفریح کا بھی کچھ موقع دینا چاہئے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری سستی و کاہلی کے خوف سے ہمیں وقفہ وقفہ سے نصیحت فرماتے تھے ”عن

ابن مسعودؓ قال کان النبی ﷺ يتحولنا بالموعظة فی الايام کراهية السامة علينا“ (کتاب العلم ص ۶۸)۔

یہ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں صحابہ کرامؓ کی تربیت کے چند نمونے ذکر کئے گئے ہیں ورنہ آپ ﷺ کا فرض منصبی ہی ایک ایسے گروہ کی تربیت تھی جو اسلامی علوم اور اسلامی اخلاق میں ایک مثالی قیادت کا کردار ادا کر سکیں، آج اگر ہم اس پہلو سے دینی مدارس کے اساتذہ پر غور کریں تو بہت حد تک مایوسی نظر آتی ہے، بہت سے اساتذہ طلبہ کی نفسیات اور ان کی ذہنی سطح کا لحاظ کئے بغیر دینی مدارس میں پڑھائی جانے والی کتابیں اور مختلف فنون خاص طور پر اس کی حاجت رکھتے ہیں کہ ان کی تدریس سے پہلے اس فن کے طریقہ تدریس اور عمومی اصول و قواعد تدریس سے ضروری واقفیت حاصل کی جائے اور طلبہ کو مانوس بنایا جائے۔

قرآن و حدیث کے صحیح فہم کے لئے ضروری ہے کہ پہلے عربی کے قواعد و اصول سے آدمی پوری طرح باخبر ہو، اس لئے دینی مدارس میں عربی گرامر (قواعد) نحو و صرف پر خاص طور پر توجہ دی جاتی ہے، مگر اس فن کے طریقہ تدریس میں حیرت انگیز طور پر وہی اختیار کیا جاتا ہے، جو عربی ادب کی تدریس میں برتا جاتا ہے، جب کہ کسی فن کے قواعد کی تدریس کا طریقہ بالکل جداگانہ ہوتا ہے، نحو و صرف کی تدریس میں عملی مشق، اور اس کی تفہیم کے لئے بلیک بورڈ کا استعمال نہایت ضروری امر ہے، اس فن کی تدریس میں مختلف قواعد کو زیادہ سے زیادہ مثالوں سے واضح کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جسے صرف زبان سے بیان کر دینے سے بات نہ ہی تو طلبہ کے سامنے واضح ہو پاتی ہے، اور نہ ہی ان کے ذہن تک پہنچ پاتی ہے، اس لئے اساتذہ بورڈ کا استعمال کریں تو یہ مثالیں طلبہ کی نگاہوں سے گزرتے ہوئے ان کے دماغ تک پہنچیں گی۔ جس سے طلبہ ان مثالوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کر سکتے ہیں، یہی حال اصول فقہ، اصول حدیث اور اصول تفسیر کی تدریس کا ہے کہ صرف ان قواعد کا ترجمہ پڑھا دینا کافی نہیں بلکہ مختلف مثالوں پر اس کی تطبیق

ضروری ہے۔

عام طور پر ہمارے مدارس میں کتب حدیث کو کتب فقہ سمجھ کر پڑھایا جاتا ہے، احادیث احکام کی تشریح میں فقہاء کے اختلاف ان کے دلائل وجہ ترجیح وغیرہ پر اتنی لمبی بحث کی جاتی ہے کہ اصل فن حدیث کی حیثیت ثانوی درجہ کی ہو جاتی ہے، حالانکہ اگر کتب حدیث کی تدریس میں علم حدیث سے متعلق مباحث کو بیان کیا جاتا ہے تو طلبہ میں علم حدیث کا ذوق بھی پیدا ہوگا اور وہ اس فن کے عمق سے بھی واقف ہوں گے، اسی طرح میراث کے فن کی تدریس میں کتاب میں مذکورہ مثالوں پر اکتفاء کرنا نا کافی ہوتا ہے، جب کہ بلیک بورڈ پر مختلف مثالوں سے ورثاء کے حصوں کی تفصیل نہ ذکر کر دی جائے۔

ظاہر ہے طریقہ تدریس کے اس نہج سے واقفیت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اساتذہ کو ان امور کی تربیت نہ دی جائے اس پس منظر میں تربیت اساتذہ کے سلسلہ میں چند اہم باتوں کا ذکر کر دینا مناسب ہے۔

۱۔ جو اساتذہ کرام چند سالوں سے درس و تدریس کے مشغلہ سے جڑے ہیں، ان کے لئے مختلف فنون کے ماہرین تدریس سے محاضرات اور خطابات اور لکچر کی خواہش کی جائے۔  
۲۔ نئے فضلاء کرام میں جو حضرات درس و تدریس کو اپنا میدان عمل بنانا چاہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ عملی میدان میں قدم رکھنے سے قبل درس و تدریس کی کم از کم یک سالہ یا اس سے بھی قلیل المدة کورس کریں۔

۳۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں دینی مدارس کے فضلاء کے لئے تربیت المعلمین کے کورس کے لئے ایک ادارہ کا قیام عمل میں لایا جائے، اس لئے ملک بھر کے ممتاز علماء کرام کی میننگ رکھی جائے، تاکہ تربیت سازی کے لئے ایک متفقہ اصول و قواعد تیار کئے جائیں اور پورے ملک میں اس تربیت کے نظام کو جاری کیا جائے، اس ادارہ میں خاص طور پر ہرن کے



لئے طریقہ تدریس کی عملی مشق اساتذہ کو دی جائے، ساتھ میں تدریس کے عمومی اصول و قواعد سے بھی اساتذہ کو واقف کرایا جائے۔

۴- تربیت سازی کے لئے مختلف فنون کے ماہرین علماء کرام سے خاص طور پر استفادہ کیا جائے۔

۵- جدید علوم کے ماہرین سے بھی اس سلسلہ میں مدد لیا جائے کیونکہ تدریس کے باب میں جو مسائل عصری اور دینی مدارس کے مشترکہ ہیں ان چیزوں کے بارے میں عصری درسگاہوں سے مربوط حضرات یقیناً مفید مشورے دے سکتے ہیں۔

۶- ہندوستان کے وہ بڑے مدارس جہاں تخصصات کے شعبے قائم ہیں وہاں ایک شعبہ تربیت اساتذہ کا بھی قائم کیا جائے۔

۷- اساتذہ کی تربیت سے مراد صرف انہیں مختلف فنون کے طریقہ تدریس سے واقف کرانا ہی نہیں ہے، بلکہ تربیت کا دائرہ کار بہت وسیع ہے، جس میں ان کی علمی تربیت، فکری تربیت، اخلاقی تربیت دعوتی و تحریری تربیت بھی شامل ہے، ظاہر ہے تربیت کے ان مختلف امور میں اسی فن کے ماہرین سے استفادہ کر کے بھی صحیح سمت میں تربیت سازی کا کام جاری رہ سکتا ہے۔



## طلبہ کی تقریری و تحریری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا طریقہ

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی

زبان و بیان، اور قرطاس و قلم کی اہمیت محتاج اظہار نہیں، رب کائنات نے خود پہلی وحی میں تخلیق انسانی کے بعد قلم کا تذکرہ کر کے انسانی زندگی میں اس کی حیثیت کی وضاحت کر دی ہے، اور اس کے نام سے اپنی پاک کتاب میں ایک مکمل سورہ نازل کر کے اور اس کی قسم کھا کر اس کی عظمت و رفعت کو لازوال کر دیا ہے، ن والقلم وما یسطرون اور اس کے آخری پیامبر کا ارشاد ہے:

ان اول ما خلق الله القلم (سنن ابی داؤد ۴۷۰۰: وصححه الالبانی، ط مکتبہ المعارف،  
الریاض سنن ترمذی ۳۳۱۹، ۲۱۵۵)۔

اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔

اس لئے زندگی کی دوڑ میں وہی قومیں آگے بڑھتی ہیں جنہیں قلم کی حیثیت اور اولیت کا اندازہ ہے اور اسی کے مطابق ان کا عمل ہے۔

”اور امام تفسیر مجاہد نے ابو عمرو سے نقل کیا ہے کہ اللہ رب العزت نے ساری کائنات میں چار چیزیں اپنے دست قدرت سے خود بنائی اور ان کے سوا باقی مخلوقات کے لئے حکم دیا گیا

☆ جامعۃ الفلاح بلریانج اعظم گڑھ

”کن“ یعنی ہو جا، وہ موجود ہو گئیں، یہ چار چیزیں یہ ہیں، قلم، عرش، جنت عدن، آدم علیہ السلام“  
(معارف القرآن ۸/۷۸۵)۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے سورہ رحمان میں تخلیق انسانی کے بعد خصوصی طور پر اس کی قوت بیان کا تذکرہ فرمایا ہے:

الرحمن، علم القرآن: خلق الانسان وعلمه البيان (سورة الرحمن ۱، ۲، ۳، ۴)۔  
رحمان ہی نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا اور دل کی بات کو ظاہر کرنا سکھلایا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہ بے شمار ہیں، ان میں سے خاص طور سے تعلیم بیان کو یہاں ذکر کرنے کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جن نعمتوں کا تعلق انسان کی نشوونما اور وجود و بقا سے ہے، جیسے کھانا، پینا، سردی اور گرمی سے بچنے کا سامان، رہنے بسنے انتظام وغیرہ، ان نعمتوں میں ہر جاندار شریک ہے، وہ نعمتیں جو انسان کے ساتھ خاص ہیں، ان میں سے پہلے تو ”تعلیم قرآن“ کو بیان کیا گیا، اور اس کے بعد ”تعلیم بیان“ کو، کیونکہ تعلیم قرآن سے فائدہ اٹھانا اور فائدہ پہونچانا بیان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور بیان میں زبانی بیان بھی داخل ہے اور تحریر و کتابت نیز سمجھنے اور سمجھانے کے جتنے طریقے ہیں وہ سب بیان کے مفہوم میں شامل ہیں (دیکھئے معارف القرآن ۸/۲۴۴)۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔

فمن جاهدہم بیدہ فہو مومن ومن جاهدہم بلسانہ فہو مومن (صحیح مسلم ۷۰۱ کتاب الایمان: باب کون الہی عن المنکر من الایمان)۔

جوان سے اپنے ہاتھ کے ذریعہ جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو زبان کے ذریعہ جہاد کرے وہ مومن ہے۔

سنل ای الجہاد افضل فقال كلمة حق عند سلطان جائر۔

اللہ کے رسول سے دریافت کیا گیا کہ بہتر جہاد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ظالم حکمران

کے سامنے حق بات کہنا (رواہ احمد والنسائی، وقال المنذری اسنادہ صحیح التیسیر للمناری ۱/۱۸۲)۔

حضرت انس سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

جاهدوا المشركين باموالكم وانفسكم والسنتكم (رواہ احمد و ابو داؤد

والنسائی والحاكم وصححه و اقره الذهبي التيسير ۱/۳۸۵)۔

مشرکوں سے مال، جان اور زبان کے ذریعہ جہاد کرو۔

حضرت حسان بن ثابتؓ اپنے اشعار کے ذریعہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مشرکوں کی

طرف سے کئے گئے بے ہودہ اعتراض کا جواب دیا کرتے تھے، نیز آگے بڑھ کر ان پر حملہ کیا کرتے

تھے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعار کے سلسلہ میں فرمایا یہ ان پر تیروں کی بوچھاڑ سے

زیادہ سخت ہیں، فانه اشد عليها من رشق النبل (صحیح مسلم ۱۵۰۸، طبیت الافکار الدولية)۔

اس کی اثر انگیزی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان من البيان لسحراً

بہت سے بیان جادو کی طرح ہوتے ہیں۔

زبان و قلم کے ذریعہ دلوں پہ حکومت کی جاتی ہے، اس کے ذریعہ تیغ و تنگ کے بغیر

قوموں اور ملکوں کی تاریخ بدل دی جاتی ہے، تاریخ کے دھارے کو موڑ دینے میں ان کا کردار

عسکری انقلابات سے زیادہ ہے، ان میں وہ طاقت ہے جو بڑی بڑی سلطنتوں اور فلک بوس

ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیتی ہے۔

فرق یہ ہے کہ تقریر سے پڑھا، لکھا، ان پڑھ ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس کے ساتھ

ہی بولنے والے کی حرکات و سکنات، چہرے کی کیفیت، لب و لہجہ اور طرزِ تنخاطب بھی مخاطب پر اثر



انداز ہوتا ہے۔ اور تحریر کی رسائی حاضر سے غائب تک ہے، صدیوں بلکہ رہتی دنیا تک اس کا فائدہ باقی رہ سکتا ہے، قلم، بظاہر خاموش رہتے ہوئے بھی بلاغت کے موتی بکھیرتا ہے اور فصاحت کے جادو جگاتا ہے۔

یہ دونوں چیزیں اللہ کی امانت اور انمول تحفہ ہیں، لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو اس امانت کی حقیقت کا احساس ہے، کتنے ہی لوگ ہیں جو زبان و قلم کے دھنی ہیں لیکن انھوں نے اس کی عظمت کو گہن لگایا ہے، اس کی حرمت کو پامال کیا ہے، روشن خیالی اور آزادی کے نام پر بے حیائی، بد چلنی اور برائی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔

غرضیکہ یہ ایک دودھاری تلوار کی طرح ہے جو صحیح ہاتھوں میں ہو تو ظلم و جور اور بے حیائی کا صفایا کرتی ہے اور غلط ہاتھوں میں ہو تو تباہی اور بربادی کے خیمے گاڑ دیتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اسلامی مزاج اور اسلامی علم رکھنے والے نوجوان اس امانت کو سنبھالیں، معاشرہ سے برائی کا خاتمہ ہو اور بھلائی کو پہنچنے اور پھیلنے کا موقع ملے۔

## تقریر و تحریر کے عناصر

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر تقریر و تحریر کی صلاحیت رکھی ہے، بس کوشش اور محنت کے ذریعہ اس صلاحیت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے، ہر چیز شروع میں مشکل معلوم ہوتی ہے اور سیکھ لینے کے بعد اس درجہ آسان معلوم ہوتی ہے کہ گویا اس کے لئے کسی محنت و مشقت کی ضرورت ہی نہیں ہے، ایک بچے کے لئے حرف شناسی کس درجہ مصیبت ہے؟ لیکن شعور کی عمر میں اس سے زیادہ آسان کوئی اور چیز نظر نہیں آتی ہے۔

## ۱۔ زبان دانی

تقریر اور تحریر دونوں کے لئے سب سے اہم چیز زبان دانی ہے، ایک خطیب اور قلم کار

کے لئے یہ اسی طرح سے ضروری ہے جیسے کہ زندگی کے لئے ہوا اور پانی، زبان پر مکمل دسترس اور اس کے قواعد و ضوابط سے آگاہی کے بغیر مطالعے اور مشاہدے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے دنیا میں جتنے بھی نبی اور رسول بھیجے ہیں وہ سب زبان دانی اور شیریں بیانی میں تمام لوگوں پر فائق تھے، سب سے اول اور ہر ایک سے بہتر خطیب انبیاء کرام تھے، اور ان پر جو کتاب نازل کی جاتی تھی وہ زبان و ادب کا شاہکار ہوتی تھی۔

آخری کتاب قرآن مجید، فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بے مثال ہے، اور جس ہستی پر اسے نازل کیا گیا وہ اپنے اخلاق و کردار کی طرح زبان و بیان کے بلند مرتبہ پر فائق تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلق خود کہا کرتے تھے کہ میں عربوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں۔

عربوں میں زبان سیکھنے کے لئے اس درجہ اہتمام تھا کہ وہ اس کے لئے اپنے شیرخوار بچے کو خود سے جدا کر لینا گوارا کر لیتے، اور انہیں پرورش کے لئے دیہات بھیج دیتے تاکہ وہاں کی خالص عربی زبان سیکھ سکیں، کہا جاتا ہے کہ خلفاء بنو امیہ میں سے ولید کو کسی وجہ سے دیہات میں پرورش کے لئے بھیجا نہ جاسکا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ صحیح عربی نہیں بول سکتا تھا۔

دعوت و تبلیغ اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے شیریں بیانی، دلکشی اور روانی وراثت نبوی ہے، اور انبیاء کے وارثوں کو کتاب الہی میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ معرکہ خیز و شرمیں، بہتر سے بہتر اسلوب کے ذریعہ دلوں کو جیتنے کی کوشش کریں۔

وجادلہم بالتی ہی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔  
اور بہتر طریقہ سے ان سے مباحثہ کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص سے تمہاری دشمنی ہوگی بہتر اسلوب کی وجہ سے وہ تمہارا دلی دوست ہو جائے گا۔

نیز اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وقولوا للناس حسناً (اور لوگوں سے اچھی بات کہو)۔

## ۲- مطالعہ اور مشاہدہ

ایک مقرر اور قلم کار کے لئے زبان دانی کے بعد دوسری اہم چیز مطالعہ اور مشاہدہ ہے کہ اس کے بغیر نہ تو وہ اپنے فن کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے، اور نہ دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

مطالعہ کے لئے کتاب و سنت کے ساتھ تاریخ بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ یہ تینوں چیزیں ایک مسلم مقرر اور خطیب کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں، ایک مقرر اور قلم کار کے لئے کتاب الہی اور سنت نبوی سے آگاہی کس درجہ ضروری ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے، اور تاریخ کے ذریعہ قوموں کے عروج و زوال سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، انسانی تجربوں کا علم ہوتا ہے، جس کے ذریعہ خیالات میں وسعت اور شعور میں پختگی آتی ہے، اور موجودہ حالات کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

## ۳- مشق و تمرین

تیسری اہم چیز مشق و تمرین ہے کہ اس کے بغیر زبان و بیان پر قدرت، مطالعہ اور مشاہدہ کی وسعت بے معنی ہے کہ مشق نہ ہونے کی وجہ سے جب کسی مجمع میں بولنے کی نوبت آتی ہے تو گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے، خوف و ہراس کی وجہ سے زبان بند ہو جاتی ہے، اس لئے مشاقی از حد ضروری ہے۔

مشق کے دوران صحیح تلفظ، لب و لہجہ میں اتار چڑھاؤ، نیز ایسے حرکات و سکنات پر خصوصی توجہ ضروری ہے کہ یہ چیزیں بھی سامعین پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

مضمون کی رعایت سے نرم و گرم ہونا اور موقع کے لحاظ سے مسرت یا غم آگیز اسلوب اختیار کرنا اور ہر حال میں سنجیدگی کا دامن تھامے رہنا بھی لازمی ہے۔

## ۴- اخلاص اور حسن اخلاقی

ان سب کے ساتھ ایک خطیب اور قلم کار کے لئے ان سب سے اہم اور ضروری چیز ہے، اس کا کردار اور اخلاص، کہ اس کے بغیر نہ تو زبان دانی سے کچھ حاصل ہے اور نہ کثرت مطالعہ اور مشاہدہ کا کوئی فائدہ ہے، اس لئے کہ

آدمی سنتا نہیں آدمی کی باتوں کو  
پیکر عمل ہو کر غیب کی صدا بن جا

## تجاویز اور مشورے

۱- ہر طالب علم کو خطیب اور قلم کار بنانے کی بجائے ایسے طلبہ کا انتخاب کیا جائے جنہیں

تحریر و تقریر سے مناسبت ہو

۲- ان کے معیار کے مطابق ادبی، تاریخی اور سیرت کی کتابوں کا نظم کیا جائے

۳- مشہور قلم کاروں کی کتابوں کا خلاصہ تیار کرایا جائے

۴- مشہور خطیبوں کی کتابوں، نیز ان کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ خطیبانہ

انداز کی مشق کرائی جائے۔

۵- رسائل و جرائد اور اخبارات کا مطالعہ کروایا جائے

۶- ان کے درمیان مقابلہ کرایا جائے اور تشجعی انعامات رکھے جائیں

۷- کسی خاص علاقہ، جگہ، یا ضلعی سطح کی انجمن بنانے کی حوصلہ شکنی کی جائے کہ اس کی

وجہ سے تعصب اور علاقائیت کو پہننے کا موقع ملتا ہے، بلکہ مخلوط انجمنوں کا قیام رو بہ عمل لایا جائے۔

۸- مدارس میں تحریر و تقریر سیکھنے کے لئے جو طریقہ رائج ہے اسے مثال اور کارگر بنایا جائے۔





## علم کی اہمیت و ضرورت

مولانا انیس الرحمن قاسمی ☆

”يرفع الله الذين آمنوا منكم والذين اوتوا العلم درجات والله بما تعملون خبير“ (سورہ المجادلہ: ۱۱)۔

(جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور جو لوگ اہل علم ہیں اللہ ان کے درجات بلند کرتا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے)۔

علم ایک بیش قیمت صفت ہے اور ایسی شے ہے جو مال و دولت، عزت و منصب سے بھی قیمتی ہے بلکہ مال و دولت اور عزت و منصب کے حصول کا ذریعہ بھی ہے اور دنیاوی و اخروی آرام و راحت کا سامان بھی، مگر مسلمانوں کے موجودہ ذہنی و فکری سوچ اور سماجی و معاشرتی رویہ پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عملی طور پر زمین و جائداد، مکان و دکان اور جاہ و منصب کی جو اہمیت ان کے نزدیک ہے اس سے کتر اہمیت علم کو حاصل ہے، ہمیں چاہئے کہ مسلمانوں کی اس سوچ کو بدلیں اور ان کے ذہن و دماغ میں یہ بات پیوست کریں کہ علم و اخلاق ہی اصل دولت ہے، باقی چیزیں علم ہی کی راہ سے آتی ہیں اور ان کی حیثیت ثانوی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ قرآن نازل کیا جس میں انسانی زندگی کے تمام مرحلوں اور گوشوں کی ہدایت ہے۔ یہ ہدایت ربانی انسان کے لئے ویسے ہی ضروری ہے جیسے زندگی کی بقاء کے لئے ہوا پانی یا کھانا پینا۔ سب سے پہلی بنیادی ضرورت انسان کی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کو

☆ ناظم امارت شرعیہ بہار

پہچانے، اس کے حکم کے مطابق اپنی زندگی گزارے تاکہ اس دنیا میں رہے تو صحیح راہ پر رہے۔ اور آخرت میں وہ منزل مقصود کو پائے اس کے لئے ضروری ہے کہ دین کے سمجھنے والے اور قرآن کو پڑھنے والے افراد موجود رہیں، جن کا اخلاق و کردار ٹھیک اسی طرح کا ہو جو قرآن چاہتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی زندگی اس ہدایت ربانی کے مطابق تھی اور آپ ﷺ نمونہ کامل اور اسوہ حسنہ کے حامل تھے، یہی حالت آپ ﷺ سے دین حاصل کرنے والے صحابہ کی تھی ان کی زندگی قرآن و حدیث کے مطابق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مؤمنانہ صفات و کردار سے متعلق قرآن کی جتنی آیات نازل ہوئی ہیں ان کا نمونہ صحابہ کرام کی صنف میں موجود ہے، صحابہ کرام نے جس طرح دین حاصل کیا اور رسول ﷺ سے تربیت پائی، اسی نمونے پر ہمارے دینی مدارس ہیں اور ان کو اسی مقصد سے قائم کیا گیا ہے تاکہ وہاں قرآن و حدیث کی تعلیم اسی طرح دی جائے جس طرح صحابہ کرام حاصل کرتے تھے۔

مدارس کے نصاب تعلیم یا طریقہ تعلیم میں جدیدی چیزوں کو اہمیت دی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل قرآنی ہدایت کے مطابق ہے۔ اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

”هو الذي بعث في الأميين رسولا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة“۔

اس آیت کریمہ میں تعلیم و تربیت کے مدارج کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پہلے قرآن کی تعلیم اس طرح ہونی چاہئے کہ مکتب میں طلبہ ناظرہ قرآن پڑھ لیں، یہ تعلیم امت کے ہر فرد کے لئے ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ اسی کے ساتھ اخلاقیات کی تعلیم ہونی چاہئے تاکہ لڑکایا لڑکی بلوغ کے مرحلہ سے پہلے گناہوں سے دور رہنے کا عادی بن جائے اور اس کے دل و دماغ میں گناہوں کی نفرت راسخ ہو جائے اگر ان دو پہلوؤں پر ہم غور کریں تو مدارس و مکاتب بنیادی طور پر اسی اصول پر جاری ہیں البتہ پوری امت کو جس درجہ کا قرآنی و اخلاقی علم اور تزکیہ نفس ہونا چاہئے وہ نہیں ہے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ جس قرآن کو سیکھنا فرض قرار دیا گیا ہے، اگر آپ اپنے گھروں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ چند فیصد افراد ہی قرآن صحیح پڑھتے ہیں، باقی اکثر ایسے ہیں جو قرآن پڑھنا یا تو جانتے ہی نہیں ہیں اور اگر جانتے بھی ہیں تو صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ اس لئے قرآن سیکھنے اور سیکھانے پر خاص توجہ دی جائے۔ محلوں اور گھروں میں اس کا اہتمام و انتظام ہو اور جو لڑکے، لڑکیاں اسکول و کالج میں پڑھتے ہیں، ان کے لئے گرمی کے موسم اور دیگر تعطیلات میں قرآن اور عربی زبان کی تعلیم کے خصوصی کلاس بنائیں تاکہ وہ قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے والے بن سکیں۔

مدارس بنیادی طور پر اخلاق و روحانیت پر توجہ دیتے ہیں ان کے علاوہ مدارس کے نصاب میں عصری علوم و فنون کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اس لئے تاکہ پڑھنے والوں کو زندگی کے دوسرے معاملات کی بھی واقفیت ہو سکے جیسے تاریخ، جغرافیہ، حساب یا لسانیات میں اردو، ہندی، انگریزی یا دیگر زبانیں پڑھائی جاتی ہیں اس سے دو طرح کی معلومات حاصل ہوتی ہیں ایک وہ معلومات ہیں جو انسانی زندگی کے لئے کام آنے والی ہیں جیسے سماجی علوم، جغرافیہ و تاریخ یا سائنس۔ دوسری لسانیات جو ہر صوبے اور خطے کے اعتبار سے نصاب میں رکھی گئی ہیں جن سے ہم ہندوستانیوں کو سابقہ پڑتا ہے اور روزمرہ کے کاموں میں استعمال کے علاوہ دعوت و تبلیغ میں مددگار ہوتی ہے جہاں تک مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کا معاملہ ہے تو وہ اس لئے کہ وہ قرآن و حدیث کی زبان ہے اور دینی کتابوں کا اصل سرمایہ اسی زبان میں ہے، یہی حال اردو کا ہے جو عام طور پر وسطی ہندوستان میں رہنے والوں کی زبان ہے اور یہ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کے اکثر شہروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اسی طرح ہندی جو ملک کی قومی زبان ہے۔ فارسی بھی کسی حد تک مدارس میں داخل ہے کیونکہ بہت سی دینی کتابیں فارسی زبان میں ہیں اور اردو سے اس کا گہرہ رشتہ ہے۔ اس طرح ہمارے مدارس میں زندگی کی اہمیت اور ضرورت کو

سامنے رکھ کر یہ نصاب بنایا گیا ہے تاکہ دین کے علوم بھی ہمیں حاصل ہوں اور دنیا کی ضروری معلومات بھی بہم پہنچ سکیں۔ اگر مدارس اور دیگر عصری اسکولوں کے مقصد کا موازنہ کریں تو دونوں میں کھلا ہوا فرق نظر آئے گا۔ مدارس کا مقصد ہدایت ربانی کا حصول اور اس کی ترویج و اشاعت ہے۔ جب کہ عصری درسگاہوں کا مقصد انسان کے مادی ضرورت کے لئے بنائے ہوئے علوم کی تحصیل ہے۔

ہدایت کے اسی بنیادی مقصد کی وجہ سے اسلام میں دین کی تعلیم کو حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے اور یہ فریضہ دو طرح کا ہے۔ بنیادی طور پر ہر مسلمان کو ہدایت ربانی کا اس قدر حصہ حاصل کرنا ضروری ہے جس سے وہ حق اور ناحق کو پہچان سکے حلال اور حرام کو سمجھ سکے، پاکی و ناپاکی اور عبادت کے بنیادی مسائل کو جان سکے یہ ہر شخص کے اوپر فرض عین ہے، تعلیم کا دوسرا حصہ فرض کفایہ ہے اور وہ یہ ہے کہ امت کے کچھ افراد دین کے علم میں ایسی مہارت حاصل کریں جس سے اس دین کی حفاظت بھی ہو سکے اور امت کی اصلاح اور عام انسانوں کی رشد و ہدایت کا کام بھی وہ کر سکیں۔ پہلے فریضہ کے بارے میں اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

”اقرا باسم ربک الذی خلق، خلق الإنسان من علق، اقرا وربک الأکرم، الذی علم بالقلم، علم الإنسان ما لم یعلم“ (سورہ العلق: ۱-۵)۔

(پڑھا اپنے رب کے نام سے جس نے بنایا، بنایا آدمی لہو کی پھٹکی سے، پڑھا اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے، سکھایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا)۔

اور دوسرے فریضہ کے بارے میں اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

”فلو لا نفر من کل فرقة طائفة لیفقہوا فی الدین“ (سورہ التوبہ)۔

(اور تم میں ایک جماعت ایسی ہو جو دین میں مہارت حاصل کرے)۔

مدارس کے اسی بنیادی مقصد و نظام کی وجہ سے آج دین محفوظ ہے اور مسلمانوں کے



اندروین باقی بھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ جل شانہ کا یہ حکم تھا کہ اپنے لئے زیادتی علم کی دعا کرتے رہیں:  
 ”قل رب زدنی علماً“ (سورہ طہ: ۱۱۴) (اے پروردگار میری علم و دانش میں اضافہ فرما)۔  
 چنانچہ رسول اکرم ﷺ اپنے لئے برابر اضافہ علم کی دعا کرتے تھے۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ صبح بیدار ہو کر یہ دعا مانگتے تھے:  
 ”خدا یا مجھے علم نافع، رزق حلال اور عمل مقبول عطا فرما۔“

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کی ایک مناجات یہ بھی تھی:  
 ”اے اللہ اس علم سے تیری پناہ جو نفع نہ پہنچائے، اس دعا سے تیری پناہ جو قبول نہ ہو،  
 اس دل سے تیری پناہ جو نرم نہ ہو، اس نفس سے تیری پناہ جو سیر نہ ہو، اے خدا ان چاروں سے  
 تیری پناہ۔“

رسول اللہ ﷺ کی سنت یہ بتاتی ہے کہ علم کہیں بھی ملے چاہے وہ مسلمان کے پاس ہو،  
 یا غیر مسلم کے پاس اسے حاصل کرنا ہمارے دین کا تقاضا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے  
 مشرک قیدیوں سے مسلمان بچوں کو لکھنا، پڑھنا سکھایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:  
 ”کلمۃ الحکمة ضالۃ المؤمن فحیث وجدھا فهو احق بہا“ (ترمذی  
 ابواب العلم) (داناتی کی بات مؤمن کی گمشدہ سامان ہے وہ جہاں اسے پائے اس کو حاصل کرنے  
 کا زیادہ حقدار ہے)۔

علم کی تحصیل میں جدوجہد، صبر و استقامت اور اس سے نہ تھکنا طالب علم کی شان ہونی  
 چاہئے اور اپنے علم کو مفید بنانا، خود فائدہ اٹھانا، اور دوسروں کو فائدہ پہنچانا عالم کی صفت ہونی  
 چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

تقویٰ کی ایک شان یہ بھی ہے کہ جو علم تمہارے پاس ہے، اس کے ذریعہ وہ علم حاصل

کرو جو تمہارے پاس نہیں ہے۔

اگر علم میں اضافہ کا خیال نہ ہو تو یہ علم کا نقص ہے۔ مزید علم کی خواہش نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے۔ اپنے علم کو مفید بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی علم سکھائے، اس لئے کہ علم کا حصول سب کے لئے ضروری ہے۔ چاہے مرد ہو یا عورت، حضور ﷺ نے ایسے لوگوں کو دعادی ہے جو خود علم سیکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سکھا لاتے ہیں:

اللہ اس شخص کو سرخرو کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی، یا درکھی اور دوسروں کو پہنچا دی (ابن ماجہ مقدمہ)۔

آپ ﷺ نے منیٰ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا:

دیکھو جو حاضر ہیں، غیر حاضر ہیں، یہ سب پہنچا دیں، کیا عجب جنہیں پہنچاؤ گے وہ زیادہ

سمجھنے والے ہوں (بخاری باب الخطبہ ایام منیٰ)۔

اس وقت یہ زیادہ ضروری ہے کہ جو لوگ علم رکھتے ہیں وہ ان لوگوں، مردوں، عورتوں اور لڑکے اور لڑکیوں کی بنیادی تعلیم کی فکر کریں، جو بے علمی کی وجہ سے نہ صرف جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں، بلکہ ارتداد کے کنارے کھڑے ہیں۔ لہذا اس وقت ایسے مکاتب کے قیام کی خصوصی ضرورت ہے جو ہر محلہ اور قصبہ میں ہوں اور جہاں مسلمانوں کو دین کے مبادیات سے واقف کرایا جائے، اور ان کے بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم دی جائے تاکہ وہ حلال و حرام سے واقف ہو سکیں اور کفر و ایمان اور توحید و شرک میں امتیاز کر سکیں۔ خاص طور پر اس کے لئے مساجد کو مرکز بنایا جائے تاکہ یہ مساجد صحیح معنوں میں ہماری دینی زندگی کا مرکز بن سکیں اور ائمہ و علماء ان مراکز سے امت کی رہنمائی اور ہدایت کا فریضہ انجام دے سکیں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو یہ امت اور پستی میں جائے گی۔

آج صورتحال یہ ہے کہ مسلمان علم کے معاملہ میں دوسری قوموں سے پیچھے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ امت ایمان باللہ اور علم بالکتاب سے تشکیل پائی اور پروان چڑھی ہے۔ حدیث شریف میں ایمان اور علم دونوں کو نور اور روشنی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ دونوں صفتیں انسان کے اندرون تمام اجزاء بدن کو روشن کرتی ہیں، اگر یہ دونوں موجود ہوں تو امت اپنی ترقی کی راہ آسانی سے پالے گی اور ذلت و پستی سے نکل کر حقیقی ترقی حاصل کرے گی اور منزل مقصود تک پہنچے گی۔ ایمان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ“ (سورہ آل عمران: ۱۳۹) (تم ہی سر بلند رہو گے اگر تم مومن ہو)۔

ایمان اور علم دونوں رکھنے والوں کو ترقی کی بشارت دیتے ہوئے اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

”يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ“ (سورہ المجادلہ: ۱۱)۔

(جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور جو لوگ اہل علم ہیں اللہ ان کے مرتبے بلند کرتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے)۔

اللہ رب العزت نے ایمان والوں کو دنیا اور آخرت کی ترقی کے یہ دوزریں اصول دیئے اور جب تک مسلمان ایمان اور علم کے علم بردار رہے، دنیا کی امامت کے حق دار رہے اور جب ان کا دامن ان دونوں سے خالی ہوا، ذلت و خواری سامنے آئی۔ علم کی اسی اہمیت کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ نے علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیا ہے:

”طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ“ (ابن ماجہ مقدمہ) (علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے)۔

اس لئے اگر کوئی اپنا فرض انجام نہ دے اور خود علم حاصل نہ کرے یا بچوں کو تعلیم سے محروم کرے تو یقیناً یہ ایسا گناہ ہے، جس پر آخرت میں مواخذہ ہوگا اور سزا دی جائے گی اور جو لوگ

فرض کو ادا کرتے ہیں وہ نہ صرف اس دنیا میں ترقی کرتے ہیں اور اللہ کی حفاظت میں رہتے ہیں بلکہ جنت میں جگہ پائیں گے اور جب تک اس دنیا میں رہیں گے تو دنیا کی تمام مخلوقات اور ہر شی ان کے لئے رحمت و مغفرت کی دعا کرتی رہے گی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے راہ طے کرتا ہے اللہ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں فرشتے اس علم کو طلب کرنے والے کے لئے پر بچاتے ہیں۔ عالم کے لئے آسمان وزمین کی ہر چیز مغفرت طلب کرتی ہے یہاں تک کہ پانی کی مچھلیاں بھی۔ عالم کی فضیلت عبادت گزار پر ایسی ہے جیسے چاند کی فضیلت دوسرے ستاروں پر۔ علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔ بے شک انبیاء درہم و دینار کی وراثت نہیں چھوڑتے بلکہ وہ علم کا وارث بناتے ہیں جس نے علم حاصل کیا اس نے پورا حصہ حاصل کر لیا (ترمذی ابواب العلم)۔

البتہ موجودہ دور میں علم کے عصری درس گاہوں میں اخلاقی و دینی بے راہ روی کی تعلیم کا جو رواج ہے وہ انتہائی مضر ہے اس لئے اس سے بچنا ضروری ہے۔ بہر حال مسلمانوں کو چاہئے کہ علم دین و دنیا دونوں کو حاصل کریں اور اپنے لڑکے و لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی وہ کوشش کریں تاکہ انہیں ہر طرح کی ترقی حاصل ہو اور وہ پستی سے نکل کر اونچائی کی طرف جائیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ علم ہی انسان کو مرتبہ دلاتا ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ علم والے اور بے علم والے برابر نہیں ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ علم ہدایت ربانی کا علم ہے، اس لئے سب سے پہلے اہمیت کے ساتھ بقدر ضرورت ربانی علم کو حاصل کرنا چاہئے اس کے بعد دوسرے علوم میں وقت لگانا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو ایمان اور علم سے مزین کرے اور توفیق دے کہ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کریں۔ آمین۔





## تدریس میں مشق اور ہوم ورک کی اہمیت

☆ مولانا وارث مظہری

عصر حاضر میں دینی مدارس کو زیادہ فعال اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے جن اصلاحی نکات پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ان میں طریقہ تدریس بھی شامل ہے۔ اس وقت زیادہ تر مدارس کے نصاب کو بحث کا عنوان بنایا جا رہا ہے۔ نظام مدارس کی اصلاح کے تعلق سے دیگر اہم پہلو ہماری بحث کا کم ہی موضوع بنتے ہیں۔ طریقہ تدریس بھی انہی میں سے ایک ہے اور اس کا ایک پہلو اساتذہ کے سامنے پڑھے جانے والے اسباق کی مشق و تمرین اور ہوم ورک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ درس نظامی کے نصاب میں کتابی تبدیلی سے زیادہ طریقہ تدریس میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ کم و بیش تین سو سال کے دور ایسے میں تدریس کا جو طریقہ درس نظامی کے مدارس میں مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ بنا چکا ہے، اس کو چیلنج کرنا، نصاب کو چیلنج کرنے کی طرح ہی بہت حد تک ممکن نہیں رہا ہے۔ ظاہر ہے اس وضاحت کا خاموشی کے علاوہ کوئی جواب نہیں ہو سکتا کہ ہمارے اکابر اور بزرگوں اور ان کے بزرگوں کا طریقہ تدریس اور طرز تعلیم یہی رہا ہے۔

دور جدید میں فن تعلیم کی جو ترقی ہوئی اور اس میدان میں جو تجربات کئے گئے، ان کی بنا پر ایک بدیہی اور مشاہداتی حقیقت کے طور پر اس بات کو تسلیم کر لیا گیا کہ درس و تدریس میں اصل اہمیت مشق و تطبیق کو حاصل ہے۔ زبان آموزی کی تو خیر سے بنیاد ہی یہی ہے، مختلف مضامین کی تفہیم اور طلبہ کے ذہنوں میں ان کی تریخ اس کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نحو و صرف کا سارا

☆ تنظیم ابنائے قدیم، دہلی

فلسفہ ازبر ہونے، بلاغت و معانی کے سارے دقائق و غوامض پر بصیرت مندانہ نگاہ ہونے کے باوجود طلبہ عربی تحریر و تکلم سے تقریباً نا بلد اور بلاغت و معانی کے اصولوں کی، متعلقہ کتابی مثالوں سے ہٹ کر تطبیق اور استعمال سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ضرورت تو اصلاً اس بات کی ہے کہ ایسی نئی کتابیں شامل درس کی جائیں جن میں متون کے ساتھ مشق و تمرین کا بھی التزام کیا گیا ہو، عربی زبان کے تعلق سے عرب ممالک کے علاوہ ہندوپاک سے بھی بکثرت ایسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن عام طور پر انہیں ارباب اہتمام و انتظام کے حضور میں باریابی حاصل نہیں ہو سکی۔ عربی میں النحو الواضح، اردو میں مفتاح اللغة العربیة (نور عالم خلیل امینی) اور القراءۃ الواضحة (مولانا وحید الزماں کیرانوی)، مشق و تمرین کو ہی بنیادی اہمیت دیتے ہوئے لکھی گئی ہے لیکن وہ ہندوستان کے ہزاروں مدارس میں سے کتنے مدارس میں شامل نصاب ہے؟ تمرین کے جس بہترین منہج پر النحو الواضح ملے گی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اسے ہر عربی مدرسے میں شامل نصاب کیا جائے۔

دوسری کتابوں کو رہنے دیجیے جو کتابیں شامل درس ہیں، اگر ان میں بھی مشق و تمرین کا اہتمام ہو تو منتہی درجات کی متعلقہ مضامین کی اہم کتابوں سے بے نیازی حاصل ہو سکتی ہے اور بچے والے وقت کو طلبہ دوسرے مفید مضامین کے مطالعے میں صرف کر سکتے ہیں۔

### طریقہ کار

اکثر اساتذہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مدارس میں مشق کا التزام نہیں ہے۔ ان کی نظر میں درس میں استاذ کی تقریر کے دوران یا اس کے بعد طلبہ سوالات کرتے ہیں اور استاذ ان کا ”کافی و شافی“ جواب دیتا اور نفس مسئلہ کی تفہیم پر وضاحتی تقریر کرتا ہے، وہ مشق و تمرین ہی کی تو شکل ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مشق کا لغوی مفہوم تو ہو سکتا ہے لیکن عملی اور اصطلاحی مفہوم نہیں۔ مزید برآں سوالات و جوابات کی سطح پر صرف چند طلبہ ہی اس عمل میں شریک ہو پاتے ہیں جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ روزانہ ہر ایک دن بعد یا ہفتہ وار کلاس کے ہر طالب علم کو مشغول کار کرنے کی

کوشش کی جائے۔ دوسرے وہ صرف تقریری سطح پر ہی نہ ہو، بلکہ تحریری سطح پر بھی ہو، بصورت دیگر وہ عمل مذاکرہ زیادہ ہوگا، مشق و تمرین کم، مشق ایک انفرادی عمل ہے، جس میں طالب علم اپنی پوری معلومات اور صلاحیت کو استعمال میں لانے کی کوشش کرتا ہے، جب کہ مذاکرہ ایک اجتماعی عمل ہے، جس میں زیادہ صلاحیت والے طلبہ کی حیثیت سنانے والے اور کم صلاحیت والے طلبہ کی حیثیت سننے والے کی ہوتی ہے۔

ہمارے ایک استاذ، جن کی عربی پر اچھی گرفت تھی، فرمایا کرتے تھے کہ میں نور الایضاح اور قدوری پڑھاتے ہوئے بھی عربی زبان و ادب سکھا سکتا ہوں۔ ان کے ذہن میں اس کا خاکہ یہ تھا کہ کتاب کو پڑھاتے ہوئے ضروری قواعد نحو و صرف کو نشان زد کیا جائے اور طلبہ کو ان کے اپنے مترادف جملوں میں اس کی مشق کرائی جائے۔ یہ جملے کتاب سے ہٹ کر ہمارے روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں، بعض ممالک کے سفر کے دوران میری بعض ایسے غیر مسلم اسکالرس سے ملاقات ہوئی جو ایک سال سے بھی کم مدت کا عربی زبان کا کورس مکمل کرنے کے بعد عربی سمجھنے بولنے پر اتنا قادر تھے جتنا کئی سالوں تک عربی کی تعلیم کے بعد بھی ہمارے طلبہ قادر نہیں ہو پاتے۔ یہ دراصل مشق کا ہی کرشمہ ہے۔ زبان کی تعلیم کے تعلق سے اب یہ کلیہ تسلیم کر لیا گیا ہے اور تجربات نے اس کی افادیت پوری طرح ثابت کر دی ہے کہ بچے کو براہ راست طریقہ تعلیم (Direct Teaching Method) کے ذریعے زبان پہلے اور اسکی قواعد بعد میں سکھائی جائے، قواعد آموزی کی بنیاد پر زبان سکھانے کا طریقہ طولانی اور پیچیدہ ہے، اس لیے جدید تعلیم گاہوں میں اس پر عمل نہیں ہوتا۔ وہاں اسے ازکار رفتہ تصور کر لیا گیا ہے۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ انہی عربی مدارس کے طلبہ جو کئی سالوں تک عربی نصاب پڑھنے کے بعد بھی عربی نہیں سیکھ پاتے، صرف ایک دو سال میں انگریزی کی اتنی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ حسب ضرورت اسے بول بھی سکیں اور سمجھ بھی سکیں، اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ عربی کے مقابلے میں انگریزی زبان کی تعلیم کا طریقہ رائج اور معروف طریقے کے مطابق، قواعد کی تحفیظ کے بجائے

قواعد کی تطبیق اور زیادہ سے زیادہ لکھنے، بولنے اور سمجھنے کی مشق پر مبنی اور نہایت خشک ہوتا ہے جس کی وجہ سے طلبہ کو درس سے دل چسپی بھی نہیں ہو پاتی۔

عربی زبان کی طرح مثال کے طور پر بلاغت اور اصول فقہ وغیرہ کی تعلیم میں مشق و تطبیق کو اولیت دی جانی چاہئے۔ مجردیانی تلی اور ڈھلی ڈھلائی مثالوں کے حوالے سے ان کی تعلیم طلبہ کے لیے پیچیدہ ہو جاتی ہے اور عموماً متعلقہ عبارات سے باہر آ کر وہ کچھ سمجھنے اور سمجھانے کے اہل نہیں ہو پاتے سلطان احمد اصلاحی نے بجا طور پر اس صورت حال کے تناظر میں لکھا ہے کہ

”کچھ کتابوں کے محدود صفحات کی گھسائی ذہن و دماغ کی ایسی تنگی اور محدودیت پر منتج ہوتی ہے کہ متن کے ساتھ اس کے حواشی کو بھی فاضل مدرسہ ویسا ہی الہامی اور ناقابل تبدیل باور کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی مسئلے کے ساتھ اس کی نصف صدی سے اوپر کی مثال کو بھی وہ اس کا لازمی حصہ خیال کرتا ہے اور مثال کی تبدیلی سے نفس مسئلہ کا اس کے ذہن سے غائب ہو جانا ورنہ کم سے کم اس کے سلسلے میں التباس کا شکار ہو جانا ہمارے روزمرہ کے مشاہدے کا ایک حصہ ہے“ (ہندوستان میں مدارس عربیہ کے مسائل ص: 104)۔

فقہ میں نظری جمود کی فی زمانہ بنیادی وجہ اصول فقہ میں بصیرت و مہارت کی کمی ہے اور میری نظر میں اس کمی کا تعلق مشق اور تطبیق کے بغیر ان مضامین کی مجرد قواعد کی تفہیم پر مبنی تعلیم سے ہے۔

ہمارے اکثر مدارس میں بلیک بورڈ کا استعمال نہیں کیا جاتا، حالاں کہ یونیورسٹیز میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبہ کے لیے بھی بلیک بورڈ کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے۔ دراصل مدارس کے نظام تعلیم اور منہج تدریس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہاں اصل فن اور موضوع کے بجائے کتاب کی تعلیم کو مرکز توجہ اور مقصود بنا لیا گیا ہے۔ اس لیے طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے درس و تدریس کا عمل انتہائی سپاٹ اور سطحی ہو کر رہ گیا ہے۔ ضرورت اسلام کے دور عروج کے املا کے طریقے کو رائج کرنے کی ہے جس میں اصل زور نفس مضمون کی تفہیم پر ہوتا ہے، نہ کہ دور زوال کے پیش پا افتادہ طریقے پر انحصار کرنے کی، جس میں ساری توانائی اور صلاحیت صرف متعلقہ



کتاب کے متون کی تعقیدات کو حل کرنے اور ان کو سمجھنے سمجھانے میں صرف ہوتی ہے۔ مشق و تمرین سے تغافل کیشی کی روایت جواب کافی پختہ ہو چکی ہے، ہمارے نظام تعلیم کی اسی بنیادی خامی و کمزوری کا شاخسانہ ہے۔ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد سمیت اصلاح نصاب کے موضوع پر لکھنے والوں کی اکثریت پچھلی ایک صدی میں بار بار اس کی طرف توجہ دلاتے رہے لیکن مروج اسلوب تدریس میں تبدیلی پر غور نہ کیا جاسکا۔

### ہوم ورک کی اہمیت اور اس کا عملی خاکہ

اسی طرح ہوم ورک کا مسئلہ ہے۔ مدارس میں پڑھنے پڑھانے والوں کا ذہن تعلیم کے اس بنیادی فلسفے کو عملی طور پر برتنے کے لیے آمادہ نہیں کہ تعلیم کا تعلق اسکول یا مدرسے سے زیادہ گھر سے ہوتا ہے۔ اسکولوں کے اساتذہ، طلبہ اور والدین اس بات کو ذہن نشیں کرانے میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں کہ صرف کلاس روم کی حاضری سرے سے کوئی معنی نہیں رکھتی، اس بنیاد پر کوئی طالب علم ایک قدم بھی تعلیم کی راہوں میں آگے نہیں بڑھ سکتا، لیکن مدارس کے اساتذہ اور انتظامیہ اس میں کامیاب نہیں ہیں۔ وجہ واضح ہے کہ مدارس کے نصاب اور طریقہ تعلیم میں ہوم ورک کو بہ مشکل ہی کچھ اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ طلبہ کی اکثریت کا ذہن درس گاہ سے اپنی قیام گاہ پر لوٹنے کے بعد اس فکر سے خالی ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ کچھ واجبات منزیلیہ (ہوم ورک) بھی ہیں جنہیں انجام دینا ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ واجبات منزیلیہ کو طلبہ کے لیے اختیاری (Optional) خانے میں رکھا گیا ہے، یعنی اگر وہ پڑھے ہوئے اسباق کا مطالعہ و مراجعت کرتے ہیں تو بہت بہتر ورنہ ظاہر ہے، کسی بھی طرح اس معاملے میں ان سے باز پرس نہیں کی جاسکتی۔

اصل کی دراصل یہیں سے پیدا ہوئی ہے، ہوم ورک کی اصل اہمیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ لازمی ہو اور اس کا لازمی ہونا اسی شکل میں متحقق ہو سکتا ہے کہ اس تعلق سے طلبہ سے باضابطہ باز پرس کی جائے۔ اس وقت چھوٹے اور بڑے تمام مدارس کی ایک بڑی کمزوری طلبہ کی

تعداد بڑھانے کی ہے۔ ایک درجے میں پچاس پچاس طلبہ ہوتے ہیں۔ ایسے میں یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ہر طالب علم کو روزانہ مختلف مضامین کی تدریس میں ہوم ورک دیا جائے اور اس کی انجام دہی کو ہر صورت میں یقینی بنانے کی کوشش کی جائے، جیسا کہ اسکولوں میں ہوتا ہے۔ طلبہ سے زیادہ سے زیادہ یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ عبارت پڑھ کر آئیں، پھر عبارت پڑھنے والے بھی چند مخصوص ہی طلبہ ہوتے ہیں۔ دوسرے طلبہ کو پورے سال استاذ کے سامنے عبارت پڑھنے کی نوبت نہیں آتی، دراصل اساتذہ بھی انہی طلبہ کو مرکز توجہ بناتے ہیں جو تیز فہم اور روانی کے ساتھ عبارت پڑھنے والا ہو، کمزوروں کو وہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے، اس طرح یہ گلوبلائزیشن کے شعبہ ہازوں کا سا شیوہ ہوا، یعنی قوی کو قوی تر اور کمزور کو مزید کمزور تر کرتے چلے جانا، اب آخر اس ”جرم ضعیفی کی سزا“ فشلِ مفاعیات کی شکل میں سامنے کیوں نہ آئے؟ اسکولوں میں ایک کلاس میں طلبہ کی تعداد عموماً 20, 30 سے زیادہ نہیں رکھی جاتی، اس کا فائدہ یہ ہے کہ ہر طالب علم کی نقل و حرکت اور اس کی کارکردگی کلاس روم میں استاذ کی نگاہ میں رہتی ہے۔ استاذ سے ہر طالب علم کا براہ راست رابطہ قائم رہتا ہے۔ استاذ کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ طالب علم کو اسباق سے متعلق مختلف کام دے کر انہیں اسکول کی طرح گھر پر بھی مصروف رکھ سکے۔

اسی نظریے کے تحت کہ بچے کی تعلیم کا جتنا تعلق اسکول سے ہوتا ہے، اتنا ہی تعلق گھر سے بھی، اسے چھٹیوں کے ایام کے دوران کرنے کے لیے ضروری کام دینے جاتے ہیں۔ اس طرح طویل و مختصر چھٹیوں کے درمیان بھی طالب علم کا ذہن اسکول اور اس سے متعلق درس و مطالعے کی سرگرمیوں سے وابستہ رہتا ہے۔ مدارس میں رمضان کی تقریباً دو ماہ کی طویل فرصت میں بھی ان کے پاس استاذ کی طرف سے مفوضہ کوئی کام نہیں ہوتا، نتیجتاً اس پورے عرصے میں طالب علم کا ذہن دروس و اسباق کی فکر اور ذمہ داریوں سے یکسر خالی رہتا ہے۔ اس مکمل انقطاعِ ذہنی کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اگلا تعلیمی دور شروع ہونے کے بعد اس کو دوبارہ اپنے ذہن کو درس و مطالعے پر مرکوز کرنے میں کئی ہفتے صرف ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ بات عام طور پر سننے میں آئی ہے کہ نیا

سال شروع ہونے کے بعد تعلیم یا اس کی باضابطہ سرگرمیوں کا آغاز تو عید الاضحیٰ کے بعد ہی ہوتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ رمضان کے بعد اور عید الاضحیٰ کی فرصت سے قبل ایک ڈیڑھ ماہ کا تعلیمی دورانیہ عموماً اساتذہ کے احوال و واقعات اور علمی اسفار و فتوحات کے بیان میں ہی گزر جاتا ہے۔

سال کے اس چوتھائی حصے کو بہتر طور پر اس وقت کام میں لایا جاسکتا ہے جب کہ ہوم ورک کے تصور (Concept) کو عمل میں لاتے ہوئے طلبہ کو اس عرصے میں مشغول رکھنے (Engage) کی کوشش کی جائے۔

اسی ضمن میں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہئے کہ مدارس کے تعلیمی نظام میں طلبہ کے والدین یا سرپرستوں کو طلبہ کی تعلیمی کارکردگی اور ان کے مجموعی طرز عمل، جس میں ان کی اخلاقی حالت، اساتذہ اور ہم درجہ طلبہ کے ساتھ ان کا برتاؤ، ان کی خارجی نصاب میں سرگرمیاں وغیرہ شامل ہیں، سے آگاہ رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی، طلبہ کے والدین اور سرپرستوں کو ان کی مجموعی تعلیمی و اخلاقی حالت کا اندازہ بہ مشکل ہی ہو پاتا ہے۔ طلبہ جس طرح چاہتے ہیں اپنی حسن کارکردگی سے متعلق اپنے والدین/سرپرستوں کو قائل کر دیتے ہیں۔

اس تجویز پر غور کیا جاسکتا ہے کہ سال کے اخیر میں فرصت کے ایام کے لیے باضابطہ ہوم ورک دیا جائے اور سال بھر کی کارکردگی پر مشتمل کارکردگی رپورٹ بھی اس سے منسلک کر کے ان کے سرپرستوں کے پاس ان کے ملاحظے کے لیے بھیجی جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ مدارس کی تعلیم مفت یا کم خرچ پ ہوتی ہے، اس لیے والدین کو اس بات کا حوصلہ نہیں ہو پاتا کہ وہ اساتذہ سے طالب علم کی کارکردگی پر اسکول میں پڑھنے والے طالب علم کے والدین کی طرح دو ٹوک انداز میں بحث و گفتگو کر سکیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مدارس میں جتنا کچھ وہ پڑھ کر حاصل کر لیتے ہیں وہ بسا غنیمت ہے۔ ان کی یہ قناعت پسندی، طلبہ کے حق میں کس قدر نقصان دہ ہے، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بعض والدین پر اساتذہ کے احترام و تعظیم کا بھی ضرورت سے زیادہ غلبہ ہوتا ہے۔ اس لیے بھی ان کی نگرانی اور شاگردی میں تعلیمی سطح پر پروان چڑھنے والے اپنے بچوں کی ناقص کارکردگی پر



سوالیہ نشان قائم کرنا انہیں غلط اور خلاف ادب محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ طے شدہ تعلیمی تصور کے مطابق، بچے کی تعلیم، بچہ، استاذ اور والدین تینوں کے مجموعی محور پر گھومتی اور آگے بڑھتی ہے، لیکن مدارس کی تعلیم میں والدین کا رول بالکل صفر ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ پہلو بلاشبہ قابل غور ہے۔

میرے خیال میں چوں کہ طلبہ کی اکثریت گھر اور علاقے سے دور مدارس میں اقامت کے ساتھ ہی تعلیم حاصل کرتی ہے، اس لیے والدین کو بچے کی تعلیم میں مشغول (Engage) کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ طریقہ عیدین کے مواقع پر سال میں ہونے والی فرصت کے لیے انہیں ہوم ورک دینے کا ہے۔ جیسا کہ اوپر وضاحت گزر چکی ہے، یہ ہوم ورک اس ہوم ورک کا بدل نہیں ہو سکتا جو روزانہ یا ہفتے میں چند دن طلبہ کو دیئے جائیں۔

بہر حال دینی مدارس کے نصاب کی تدریس میں مشق اور ہوم ورک کے اہتمام کی دیگر امور کے مقابلے میں زیادہ ضرورت و اہمیت ہے۔ یہ بنیادی طور پر طریقہ تدریس کی خامی ہے لیکن اس کا براہ راست تعلق نصاب اور اس میں شامل کتابوں سے ہے، یہ کتابیں مشق و تمرین کے پیٹرن پر نہیں لکھی گئی ہیں، یہ کتابیں اس دور کی یادگار ہیں جب اسلامی دنیا میں مسلم فکر کو زوال آ چکا تھا۔ مدارس کے مروجہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی ضرورت انیسویں اور بیسویں صدی کے پورے عرصے میں شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ خاص طور پر ملک کی آزادی کے بعد نئے سیاسی و سماجی ماحول میں پورے غور و فکر کے ساتھ نظام تعلیم کے جائزے کی ضرورت تھی تاکہ ہم پر یہ حقیقت آشکارا ہو سکے کہ ماضی میں ہم نے کون سا قدم بالا راہ یا بادل خواستہ اور کون سا قدم بادل ناخواستہ اور سیاسی حالات کے جبر کی بنیاد پر اٹھایا تھا۔

نصاب و نظام اور طریقہ درس کے حوالے سے مشق اور ہوم ورک کا موضوع غور و فکر کی ایک جہت ہے، ایسی بہت سی جہات ہیں جن پر ہمارے لیے اپنے نظر و فکر اور عمل کا قبلہ درست کرنے کی ضرورت ہے۔





## دینی مدارس اور تربیت اساتذہ

ڈاکٹر سرور عالم ندوی ☆

اسلام ایک جامع تصور حیات کا نام ہے، اس کی اساس عقائد، اصول اور اقدار حیات پر قائم ہے، وہ ایک مخصوص انفرادی کردار کے ساتھ صالح سماج کی تشکیل کرتا ہے وہ نہ قدامتوں کا ایسا داعی ہے جو محض روایت پرستی کو لائق پرستش سمجھتا ہو اور نہ ہی جدیدیت کا ایسا دیوانہ ہے کہ اسے ہر جدید چیز پر کشش معلوم ہوتی ہو، بلکہ وہ ایک متوازن اور معتدل نظام زندگی کا علمبردار ہے۔ اور اسلام کا اعتدال و توازن بغیر تعلیم کے ممکن نہیں ہے، کیونکہ تعلیم اسلامی نقطہ نگاہ سے ایک معاشرتی عمل ہے جسکے ذریعہ معرفت الہی حاصل کرنا، اپنے آپ کو پہچانا، کائنات کی حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے جستجو کرنا ہے، اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اسلام کے نظریہ تعلیم اور دیگر نظریات کے مابین پایا جاتا ہے۔

سقراط نے صرف حقیقت کی تلاش کو تعلیم کہا، افلاطون نے معاشرے کی متوازن تنظیم کو تعلیم سے تعبیر کیا، ارسطو نے تعلیم کو جسمانی اور عقلی تربیت کا وسیلہ بنایا، لیکن اسلام جسم اور روح دونوں کی تربیت کو مقاصد تعلیم قرار دیتا ہے تاکہ ذات اور معاشرہ کو پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنایا جاسکے۔

اسلامی فلسفہ تعلیم کا مقصد صرف انفرادی اصلاح نہیں بلکہ فرد اور اجتماع دونوں کی فلاح و بہبود ہے، وہ نوجوانوں کی ذہنی، علمی اور دماغی صلاحیتوں کو اعلیٰ اقدار پر استوار کرنا چاہتا ہے۔

کیونکہ نوجوان ملت کے وہ قیمتی اثاثہ ہیں جن کے بقا و تحفظ پر ہی انسانیت کا انحصار

☆ شعبہ عربی پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قومی، ملی، دینی، تہذیبی اور اخلاقی میراث محفوظ رہے اور نسل بعد نسل اسی طرح ایک دوسرے تک منتقل ہوتی رہے تو ہمارا اخلاقی فریضہ بلکہ انسانیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اپنی جدید نسل کی ذہنی و جسمانی نشوونما اور صحیح تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں اور ان کے لئے وہ ساری سہولیات فراہم کریں جو ان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کر سکتی ہیں، کیونکہ آج کے یہی نوجوان درحقیقت ملک و ملت کے معمار ہیں، انہیں پر اقوام و ملل کے عروج و ارتقاء کا انحصار اور انہیں کے کاندھوں پر قومی، ملی، دینی اور مذہبی روایات و شخصیات کے تحفظ کا بار رکھا جانے والا ہے۔

یہ اپنی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے اہل اسی وقت ہو سکتے ہیں جب ان کی تعلیم و تربیت اور ذہنی و جسمانی نشوونما مکمل تندہی اور چابک دستی کے ساتھ کی گئی ہو، اور گھر، خاندان، معاشرہ، مملکت و حکومت اور اسکول و مدرسہ سب کا بھرپور اشتراک رہا ہو؛ اس لئے کہ تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان میں سے ہر ایک پر عائد ہوتی ہے، یہ اور بات ہے کہ کسی پر کم اور کسی پر زیادہ؛ مگر بہر حال اعانت ہر ایک کی لازمی ہے۔

لیکن حالات اور زمانہ کے موجودہ تناظر میں ان میں سب سے زیادہ اہمیت ہماری دینی اور مذہبی اداروں کی ہے؛ کیونکہ یہی وہ ادارے ہیں جو صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعہ انسانی خدوخال کو اس کے حقیقی اور مطلوبہ روپ میں نکھار اور سنوار سکتے ہیں، کیونکہ زمانہ کے ترقی پسند نظریات اور معاشی اور اقتصادی مسائل کی کثرت نے سماجی اور معاشرتی شیرازہ بندی کو بالکل منتشر کر کے رکھ دیا ہے، کوشش و کاوش کا سارا محور صرف ذات تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے، کسی کو چنداں اس کی فکر نہیں کہ وہ معاشرے اور سماج کیلئے کیا کرنا چاہتا ہے۔

ایسے نازک حالات میں ہماری یہ دینی ادارے ہی درحقیقت راہب کا چراغ بن کر راہ سے بچھڑے لوگوں کو منزل کا سراغ دے سکتے ہیں، لیکن یہ عمل جتنا ضروری اور اہم ہے اتنا مشکل

بھی ہے، یہ کام صرف کتابوں کے چند اوراق رٹا دینے سے پورا نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے ایک مکمل نظام کی ضرورت ہے، اور اس نظام کا اصل محور حضرات اساتذہ کرام کی ذات اور شخصیت ہے۔

تعلیم کے کسی بھی نظام میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے، اس لئے استاذ کے انتخاب میں بھی غایت درجہ احتیاط کی ضرورت ہے، نہ تو ہر صاحب علم استاد بن سکتا ہے اور نہ ہی ہر استاد صاحب علم ہو سکتا ہے، یہی وہ بنیادی اور اہم نکتہ ہے جس کی روشنی میں جدید دور کا ہر نظام تعلیم استاد کی اپنی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کرتا ہے اس لئے کہ کوئی استاد اس وقت تک کامیاب استاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ فن تدریس سے واقف نہ ہو۔

بلاشبہ کچھ لوگوں میں تدریس کا قد رٹی ملکہ ہوتا ہے لیکن فی زمانہ یہ ایک ایسا فن ہے جسے دلچسپی لے کر سیکھا جاسکتا ہے اور اس سلسلہ میں عملی تربیت کے ذریعہ جدید ترین ذرائع کے استعمال سے بھی واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے جس کی طرف ہمارے مدارس کی نگاہ التفات کا حقہ اب تک نہیں ہے یا اگر ہے تو بہت کم ہے، کیونکہ حصول تعلیم کا مقصد بیشتر ذمہ داران مدارس کے سامنے اب تک واضح نہیں ہے، وہ طلباء کی ایک جھيڑ کو تیار کر لینے کے خواہاں ضرور ہوتے ہیں لیکن ان کے ذہنی اور عقلی نشوونما کے ساتھ علمی اور تربیتی نشوونما کی ویسی فکر نہیں ہوتی جیسی ہونی چاہئے۔

موجودہ حالات میں اپنے تعلیمی معیار کو بلند کر کے طلباء مدارس کو صالح معاشرے کی تشکیل میں اہم رول ادا کرنے اور عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کے لائق بنانے کیلئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اساتذہ کی تربیت پر بھی اتنی ہی توجہ مبذول کریں جتنی طلباء کی تعلیم و تربیت کی طرف کرتے ہیں، جب تک اساتذہ صحیح تربیت کے حامل نہیں ہوں گے اس وقت تک طلباء کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، اساتذہ کیلئے خصوصی تربیتی ادارے اس دور کے ہر نظام تعلیم کا جزو ہیں، اسلامی نظام کے تحت یہ ادارے غیر معمولی اہمیت کے مالک ہوں گے؛ اس لئے کہ در

اصل ان کی صحیح نہج پر نظام تعلیم کی صحیح تشکیل کا مدار ہوگا۔

اس تربیتی نظام کا مرکزی نکتہ یہ ہو کہ اساتذہ میں ان کے نصب العین کا واضح شعور اور گہری وابستگی پیدا کرے اور ان میں وہ اخلاقی کردار اور مشنری جذبہ پروان چڑھائے جو انہیں اس منصب کے تقاضے کو صحیح صحیح ادا کرنے کے لئے تیار کرے۔ اس سلسلہ میں ایک مسلم ماہر تعلیم کے اصول و ضوابط ضبط تحریر کئے جاتے ہیں جن کی رعایت اس عمل میں رہنمائی کا کام انجام دے سکتی ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ان کو (اساتذہ کو) یہ تربیت دی جائے کہ وہ اپنے اپنے مضامین اسلامی فلسفہ تعلیم کی مطابقت میں پڑھائیں۔

۲۔ انہیں اپنے ملک کے اور بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کے بارے میں شعور و آگہی فراہم کی جائے تاکہ وہ بعد میں اپنے زیر تعلیم و تربیت طلباء تک اسے منتقل کر سکیں۔

۳۔ انہیں اسلام کے فلسفہ تعلیم، مقاصد تعلیم اور مفکرین تعلیم کے خیالات سے آگاہ کیا جائے۔

۴۔ مغربی تعلیمی فکر اور طریقہ ہائے تدریس کا مطالعہ تنقیدی نقطہ نظر سے کروایا جائے۔

۵۔ نصاب میں ایسے عناصر نہ ہوں، جو ان کے ذہن کو پراگندہ اور ان کی شخصیت کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے والے ہوں۔

۶۔ ایسی کتابیں استعمال کی جائیں جو اسلامی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہوں، ایسی تحریریں، رسالے یا کتابیں کورس میں نہ ہوں جو اجتماعی نصب العین کے بارے میں ایمان کو کمزور کرنے والی ہوں۔

۷۔ تدریس کو موثر کرنے کے لئے جدید سمعی و بصری آلات کے استعمال سے واقف کروایا

جائے (اسلامی نظام تعلیم کے خدو خال، ص: ۸۷-۸۸، مطبوعہ فاؤنڈیشن فار ایجوکیشن ڈیولپمنٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء)۔



اساتذہ کی تربیت کا نظام دو طرح سے نافذ کیا جاسکتا ہے ایک عمل تدریس کے آغاز سے قبل اور دوسرا دوران تدریس۔

عمل تدریس کے آغاز سے قبل شروع ہونے والے نظام کو ایک مکمل نصاب کے ذریعہ طویل مدتی نظام کے تحت بروئے کار لایا جاسکتا ہے جو ایک سالہ مدتی نظام و نصاب پر مشتمل ہو، جس میں طریق تدریس، اصول تدریس اور مقاصد تعلیم جیسے موضوعات کو شامل کیا جائے اور اس میں عملی مشق کی شکلیں بھی شامل ہوں۔

دوسرا دوران تدریس تربیتی نظام۔

اس میں تدریس کے دوران اساتذہ کی تربیت کیلئے جزو وقتی یا مختصر وقتی نظام بنایا جائے، اس کا مقصد تدریسی فرائض انجام دینے والے اساتذہ کرام کو نئی معلومات سے روشناس کرانا ہوتا کہ اس کے ذریعہ انہیں اپنے طریقہ تدریس کو آسان، دلکش اور قابل فہم بنانے کے لئے نئے طریقہ تدریس سے واقفیت ہو سکے، اور ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہو، اس کے لئے ریفریشر کورسز، ورک شاپ، اسٹڈی گروپ وغیرہ جیسا نظام مفید ہو سکتا ہے۔

یہ وہ پہلو ہے جس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت ہمارے مدارس نظام تعلیم میں شدت سے محسوس کی جا رہی ہے، کیونکہ یہ مدارس موجودہ حالات اور تقاضوں کے تحت اپنے فرائض منصبی کو اسی وقت پورا کر سکتے ہیں جب وہ طلباء کی تعلیم و تربیت کی طرف اپنی توجہ کا حقہ مبذول فرمائیں، اور طلباء کی صحیح تعلیم و تربیت اساتذہ کی تربیت کے بغیر کامل اور مکمل نہیں ہو سکتی۔



## مساجد اور نظام تعلیم

☆ مولانا محمد شبلی القاسمی ☆

علوم اسلامیہ کے فروغ و اشاعت اور اس کی ترویج و ترقی میں مساجد کو ابتدائے اسلام ہی سے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے، چنانچہ عہد رسالت میں مسجد نبوی کے فرش سے انجام دیئے جانے والے کارناموں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ایک طرف وہاں مالک حقیقی کے حضور عجز و نیاز، خشوع و خضوع اور گریہ و زاری سے معمور برگزیدہ پیشانیوں کے زریں نقوش نظر آتے ہیں تو دوسری طرف دین و دنیا کے سارے قوانین ترتیب پاتے نظر آتے ہیں۔ لشکر اسلام کو قواعد جنگ سکھائے جاتے اور یہیں سے جہاد میں فوجیں روانہ کی جاتیں۔ مختلف ممالک دور افتادہ علاقوں اور اطراف و اکناف کے وفود یہیں اترتے تھے۔ اسی مسجد میں امام الاولین والآخرین محمد رسول اللہ ﷺ کا دربار لگتا تھا اور اسی میں مقدمات کی سماعت ہوتی اور فیصلے دیئے جاتے، اسی میں مجرمین بھی قید کئے جاتے اور اسی میں حامل وحی ختم الرسل استاذ کامل محمد عربی ﷺ کا درس ہوتا۔ اسلام کا پہلا مدرسہ صفۃ النبی کے نام سے اسی مسجد کے صحن میں قائم ہوا۔ مسجد میں کل وقتی اور جزء وقتی دونوں طرح کے تشنگان علوم ربانی رہا کرتے۔ مسجد نبوی کی زیارت کرنے والے آج بھی صفۃ نبی کو اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں وہ مقام مسجد نبوی کے دیگر مقامات حتی کہ ریاض الجنۃ (جنت کی کیاری) سے بھی قدرے اونچا ہے گویا یہ اشارہ ہے کہ علم کا مقام عبادت سے اور اہل علم کا مقام اہل طاعت و زہد سے

☆ (کنوینر تنظیم تحریک ائمہ مساجد آل بہار پھلواڑی شریف، پٹنہ)

بلند و برتر ہے اور وہیں سے پوری دنیا کے مسلمانوں کو یہ خاموش پیغام بھی مل رہا ہے کہ آپ کی مساجد بھی تعلیم و تعلم کا مرکز ہوں۔ زمانہ خیر القرون اور اس کے بعد چوتھی صدی ہجری کے ختم تک مسلمانوں کے لئے دنیا میں مساجد ہی درس گاہ اسلامی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ موجودہ شکل میں رائج شدہ مدارس کا رواج نہیں تھا۔ مورخ اسلام علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

اگرچہ ۱۴۳ھ کے متصل ہی تمام ممالک اسلامی میں درس و تدریس کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم ہو گیا اور انہی دو تین صدیوں میں جس درجے کے سیکڑوں، ہزاروں مجتہد، فقیہ، ادیب، شاعر، فلاسفر، مورخ پیدا ہو گئے، زمانہ کونو سو برس کی وسیع مدت میں بھی اس پایہ کے لوگ نصیب نہیں ہوئے لیکن تعجب ہے کہ تاریخ کے صفحوں میں چوتھی صدی کے اخیر تک کسی کالج یا اسکول کا نشان نہیں ملتا، مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے، علماء کے معمولی مکانات یہی اس وقت کے مدرسے یا دارالعلوم تھے (دیکھئے: مقالات شبلی ۳۷۷)۔

آگے لکھتے ہیں: عام خیال یہ تھا کہ اول جس نے مدرسوں کی بنیاد ڈالی وہ دولت سلجوقیہ کا وزیر اعظم نظام الملک طوسی تھا پھر لکھتے ہیں کہ اولیت کی تعین تو ہم بھی نہیں کر سکتے ہیں مگر یہ بتا سکتے ہیں کہ نظام الملک سے قبل علمی عمارتوں کے آثار موجود تھے۔ ۴۰۰ھ میں حاکم مصر نے مصر میں ایک بڑا مدرسہ بنوایا، سلطان محمود غزنوی نے متھرا کی فتح سے واپسی پر ۴۱۰ھ میں دار السلطنت غزنین میں عالی شان مدرسہ بنوایا۔ مکہ المکرمہ اور اس کے نواح میں ۵۷۹ھ سے پہلے کسی مدرسہ کا نشان نہیں ملتا۔ ۵۷۹ھ میں امیر فخر الدین زنجیلی نے مکہ معظمہ میں ایک مدرسہ بنوایا تھا اس کے بعد ہی دیگر مدارس کے قیام کا علم ہوتا ہے اندلس (اسپین) جس کو یورپ کی استادی کا فخر حاصل ہے اس کے بارے میں علامہ مقری تک نے اقرار کیا ہے کہ تمام اسپین میں ایک بھی مدرسہ نہیں تھا صرف مسجدوں کے صحن تھے جن میں تمام علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے (دیکھئے: الطیب تاریخ اندلس مطبوعہ فرانس ۱۳۶۱)۔

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں: ہم قرطبہ (کارڈوا) غرناطہ (گرینڈا) کی شہرت و عظمت کے

منکر نہیں ہیں قرطبہ کے نقشہ میں ہم ۷۸۳ مسجدیں ۷۰۰ حمام ۱۳۰۰۰ عام رعایا کے مکانات دیکھتے ہیں لیکن اس تمام وسعت میں کسی کالج یا اسکول کا نشان نہیں ملتا (مقالات شبلی ۷۳/۳)۔

متحدہ ہندوستان میں بھی علم کی سوتیں مساجد کی راہوں سے ہی جاری ہوئیں۔ بعد میں

مدارس کے لئے الگ سے عمارتیں بنانے کا سلسلہ جاری ہوا۔ یادایام کے مصنف لکھتے ہیں:

ہمارے پیر و مرشد روحی فداہ نے خاک پاک مدینہ میں جو پہلی عمارت بنائی تھی اور جس

کو مسجد نبوی کہتے ہیں وہ ہمارا پہلا مدرسہ تھا اس کے بعد جتنی مسجدیں دنیا میں تیار ہوئیں انہی کو

آپ مدارس سے تعبیر کر سکتے ہیں تعلیم کا پرانا طریقہ یہ تھا کہ استاذ مسجد میں آکر بیٹھ جاتا اور اس

کے گرد و پیش شاگردوں کا حلقہ بن جاتا اساتذہ خالصاً لوجہ اللہ تعلیم دیتے اور ان کے شاگرد

چٹائیوں پر بیٹھ کر دود چراغ کھا کر تحصیل علم کرتے، بڑے بڑے شہزادوں کو بھی اگر علم کا ذوق ہوتا

تو وہ بھی مسجدوں میں جاتے اور اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب کر کے بیٹھتے یہی طریقہ چوتھی

صدی ہجری تک علی العموم جاری رہا اس کے بعد سب سے پہلے نیشاپور میں مدرسہ کے لئے شاندار

عمارت بنائی گئی اس کے بعد مولانا نے ہندوستان کی چند مسجدوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں جو نپور کا

امالہ کی مسجد، لاہور میں وزیر خان کی مسجد، نئی دہلی میں ماہم بیگم کی مسجد، پرانی دہلی میں مسجد فتحپوری،

سورت میں مرجان شامی کی مسجد کا خاص طور سے تذکرہ کیا ہے (یادایام ۳۲)۔

اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی جامعہ ازہر مصر ہے اس کی بھی

شروعات مسجد سے ہوئی آج بھی وہ مسجد موجود ہے، متحدہ ہندوستان کی سب سے بڑی دینی و علمی

درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی بھی شروعات چھتہ کی مسجد سے ہوئی، مفتاح العلوم مئو یوپی کی مسجد کا

آغاز بھی کٹرا کی مسجد سے ہوا، اورنگ زیب عالمگیر نے اورنگ آباد میں جامع مسجد کی تعمیر کی اور

اسی کو تعلیم کا مرکز بنایا، فتاویٰ کی شہرہ آفاق کتاب فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا عظیم الشان کارنامہ



بھی اسی مسجد میں انجام پایا، بعد میں اس کے گرد مدرسہ کے لئے الگ سے عمارتیں بنوائیں، جو اب مدرسہ کاشف العلوم کے نام سے موسوم ہے۔ ان کے علاوہ ہزاروں مدارس ملک میں ایسے ہیں جن کی شروعات مسجدوں کی چٹائی اور ان کی بوریوں سے ہوئیں۔ طوالت کے خیال سے ہم ان کا تذکرہ چھوڑتے ہیں مگر مذکورہ بالا تاریخی حقائق ذکر کرنے کا مقصد ملت میں اس شعور کو بیدار کرنا ہے کہ مساجد کو دوبارہ تعلیم گاہ بنانے کی تحریک شروع کی جائے۔

جن مدارس میں نظام تعلیم قائم ہے ان کو مفید اور چوکس بنانے کی سعی کرتے ہوئے انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ شہروں سے دور اور شہری سہولیات سے محروم دور افتادہ علاقوں کی مساجد کی ٹوٹی پھوٹی چٹائیوں پر بیٹھ کر چھوٹی چھوٹی عمروں کے معصوم نونہالوں کو خدا اور رسول، عقائد اور بنیادی اعمال سے روشناس کرانے والے معلمین انگلیاں پکڑ کر حروف شناسی کرائے والے اساتذہ کرام کا ہم احسان مانیں کہ انہیں کے دم خم اور مخلصانہ کوششوں سے اس پر فتن دور میں بھی نئی نسلوں میں دینی شعور زندہ ہے۔ ہم بعض اوقات دانستہ یا نادانستہ طریقہ سے ان معلمین کے سلسلے میں غلط زباں استعمال کرتے ہیں جو ہم سب کے لئے لمحہ فکریہ اور تعلیم کی راہ میں سد باب ہے۔ حالانکہ رسمی مدارس کے مقابلہ میں ان معلمین کو تعلیم کی راہوں میں غیر معمولی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے باوجود معاشرہ میں انہیں میاں جی مولیٰ صاحب ملاجی وغیرہ الفاظ کے ذریعہ پکار کر ان کے عظیم کاموں سے صرف نظر کیا جا رہا ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ مدارس کے مقابلہ میں مساجد کی تعلیم اور ان کے معلمین کو اہمیت دی جاتی، کیونکہ رسمی مدارس کے مقابلہ میں مساجد کی تعلیم قائم کرنا سہل ہی نہیں سہل تر ہے، نہ جگہ کی تلاش نہ عمارت کی فکر نہ معلمین کے طعام و قیام کی الگ سے ذمہ داری صرف انہیں مساجد کے ائمہ کرام کو مزید وظیفہ دے کر یہ اہم کام لیا جاسکتا ہے۔ غور کیجئے مدارس کے لئے زمین کی فراہمی مکانوں کی تعمیر وغیرہ کتنا اہم مسئلہ ہے پھر بھی مطلوب نتیجہ سے ہم بہت

دور ہیں۔ لہذا نئے نئے غیر ضروری مدارس کے قیام سے گریز کرتے ہوئے مساجد کو تعلیم کا مرکز بنانے کی فکر اہل علم و دانش اور رہنمائے قوم و ملت کو کرنی چاہئے ممکن ہے کہ بعض اہل علم کو مساجد میں دی جانے والی تعلیم اور طریقہ تعلیم کے بعض عیوب و نقائص سے دل برداشتگی ہو اور وہ اب اس کی افادیت کے قائل نہ ہوں ان کی خدمت میں مولانا مناظر احسن گیلانی کی تذکیر بسورۃ الکہف کا مختصر سا اقتباس لکھ کر اپنے مقالہ کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں:

انتہائی کس مہر سی کے حالات میں گم نام قصبوں اور دیہاتوں کی مسجدوں کے گوشوں میں کچھ پڑھنے پڑھانے والے سمٹ گئے تھے تعلیمی نصاب نقائص و عیوب سے معمور تھا نہ عصری تقاضوں کے مطابق علوم و فنون کی کتابیں اس میں شریک تھیں نہ دنیا کی موجودہ علمی زبانوں میں سے کسی زبان کو اس نصاب میں جگہ دی گئی تھی لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا عیوب و نقائص سے پاک کر کے ان مدارس کو بھی عصری جامعات اور کلیات کے مطابق بنادیا جاتا تو دینی فتنہ کے پچھلے تاریک دنوں میں بچی کچھی نجات کی کچھ کشتیاں جو میسر آرہی ہیں جو ایمان و عمل صالح کی زندگی کے ساتھ قبر کے کناروں تک پہنچنے میں اب تک کامیاب ہوئے ہیں کیا ہم ان نجات کی کشتیوں کو پاسکتے تھے (ص ۲۵۴)۔

اخیر میں میری گزارش ہے کہ معقول تنخواہ دے کر باصلاحیت ائمہ کرام مساجد میں مہیا کئے جائیں اور تعلیم کی ذمہ داری ان کے سپرد کی جائیں مساجد میں کل وقتی اور جز وقتی، صبا حی اور مسائی نظام تعلیم بنائے جائیں تاکہ ہماری آنے والی نسلوں میں دینی شعور اور مزاج برقرار رہ سکے اور مدارس کو بھی اچھے طلباء میسر ہو سکیں۔





چوتھا باب  
مدارس اور کتب خانے





## دینی مدارس کے کتب خانے جمود و ترقی کے آئینہ میں

مفتی محمد ارشد فاروقی ☆

### لوح محفوظ اولین کتب خانہ

علم کی صفت الہی کا ظہور ”علم الانسان مالہ یعلم“ سے وحی کے ذریعہ ہوا، اس علیم کے علم کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا؛ جیسی اس کی ذات لامتناہی ویسی ہی اس کی صفات غیر محدود، وہی علیم وہی علام، اسی کے عطا کردہ علم سے انسانوں کے دماغ روشن، ضمیر منور، اسی کے نور علم سے عالم صوفشاں، اللہ نور السموات والأرض علیم وخبیر کے علم کی حفاظت کا مسئلہ نہیں کہ یہ اس کی صفت ہے، وہ بذاتہ العلیم کے ساتھ الحفیظ ہے؛ البتہ اس کی صفت علم کے ظہور کا مخزن ”لوح محفوظ“ ہے، ”بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ“ اس طرح اگر تعبیر درست ہو تو تعلیم کا اولین مدرسہ درس گاہ الہی ہے اور اولین و آخرین کتب خانہ لوح محفوظ ہے، اس طرح علم مدرسہ، اور کتب خانہ ایک ایسا مثلث ہے کہ انفکاک ناممکن ہے۔

زبور، توریت، انجیل، صحف ابراہیم و موسیٰ کو بہ حفاظت رکھنے کا ہمیشہ اہتمام ادب و احترام کے ساتھ کیا گیا جس طرح ان کی تعلیم کا انتظام ہوتا رہا، اس طرح علم و مدرسے و کتب خانے کا رشتہ جڑا رہا۔

جسبہ انشاء الہی کے مطابق آسمان کا رشتہ زمین سے چھٹی صدی عیسوی کے بعد جڑنے

☆ صدر شعبہ افتاء جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

لگا اور حراء میں نور چمکا، العلق کی ابتدائی پانچ آیات کا نزول ”اِقرأ“ سے ہوا تو رسول معظم نے اپنے قلب و دماغ میں ان آیات کو محفوظ فرمالیا اور جب وحی کا تسلسل رہا تو بڑی جان فشانی سے حفظ وحی فرماتے، تو الحفیظ نے حفاظت کی ذمہ داری لی: لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علينا جمعه وقرآنہ۔

جمع قرآن کا ایک طریقہ تو حفظ قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ذمہ داری خود لی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و دماغ میں قرآن رچ بس گیا کہ ام المؤمنین عائشہؓ فرماتی ہیں: کان خلقہ القرآن۔

اسی کے ساتھ وحی الہی کے کاتبین مقرر ہوئے اور نزول وحی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاتبوں کو لکھنے کا حکم فرماتے، رفتہ رفتہ جستہ جستہ آپ صلی اللہ کی تعلیم کے مطابق آیات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے موافق لکھ لی جاتیں، اور قرآن کریم مکمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تحریر میں ضبط کر لیا گیا۔

## حفاظت علم کے دو طریقے

”ان علينا جمعه“ میں اشارہ ملتا ہے کہ ہر دور میں علم کی حفاظت و جمع کے دونوں طریقے کا وجود ضروری ہے: ایک حافظہ انسانی میں محفوظ ہوا اور دوسرے تحریر و کتاب کی شکل میں موجود ہو، یہی سنت الہی ہے کہ کتب الہی کے ساتھ انبیاء و رسل کی بعثت ہوتی رہی اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن کریم جسے ”ہدی للناس“ قرار دیا کا نزول ہوا۔

## دو طرح کے کتب خانے

علوم کی حفاظت کے لئے دو طرح کے کتب خانوں کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ ایک شخصیات کی شکل میں دوسرے متداول نظام کتب خانہ کی شکل میں۔

علامہ انور شاہ

سلف میں ایسی مثالیں بہت ہیں جن کو چلتے پھرتے کتب خانے کے نام سے یاد کیا جاتا۔ ہندوستان کیا عالم اسلام کی وہ آخری شخصیت جو اس کا مصداق تھی وہ حضرت الامام علامہ انور شاہ کشمیری تھے۔

امام محمد قاسم نانوتوی

جماعت دیوبند کے سرخیل بانی دارالعلوم قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی اپنی مثال آپ تھے، وہ ایک مکتوب کے جواب میں لکھتے ہیں: ”میرے پاس کتابیں نہیں ہوتیں“ حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ فرماتے ہیں: ان کے پاس قرآن کریم، صحیح بخاری اور مشنوی مولانا روم ہوتی۔ قابل غور یہ امر ہے کہ کتب کی عدم موجودگی کے باوجود جب وہ خطاب فرماتے یا تصنیف کرتے تو ایسے علوم کے دریا بہتے اور اسرار و حکم شریعت، متکلمانہ انداز میں بیان ہوتے جس کی نظیر نہیں، اور وہ علم کلام کو اپنے دور کے مطابق ڈھالنے والے تھے، اس لئے ایسا کتب خانہ ہی چلتا پھرتا کتب خانہ کا مصداق ہو سکتا ہے۔

لوح محفوظ حافظہ الہی

جب ذکر نانوتوی کا آگیا تو موضوع سے متعلق ان کی ایک تقریر کا خلاصہ پیش کرنا مفید ہوگا۔ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ نے فرمایا: ”مولانا نانوتویؒ سے پوچھا گیا کہ لوح محفوظ آخر کتنی لمبی چوڑی ہے کہ اس میں ہر چیز محفوظ ہے۔ نانوتوی نے سائل سے دریافت کیا کہ آپ کو بچپن کی باتیں یاد ہیں؟ عمر کے مختلف مراحل کے واقعات یاد ہیں؟ جواب ملا ہاں اگر تحریر میں لائی جائیں تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائیں۔ حضرت نانوتوی نے سوال کے جواب کی اس تمہید کے



بعد فرمایا: جب آپ کے حافظہ میں آپ کی زندگی کے احوال کے دفتر کے دفتر موجود ہیں تو خالق کائنات کے حافظہ کا کیا پوچھنا۔ لوح محفوظ اللہ تعالیٰ کا حافظہ ہے (اقتباس از ایک مجلس)۔

### ظرفیت میں کتب خانہ کا مفہوم

”بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ“ لوح کو ظرف بتایا گیا جس سے ظرفیت کا معنی واضح ہے اور اسے کتب خانہ کا نام دیا جاسکتا ہے۔  
حضرت نانوتوی نے جو اسلوب اختیار کیا اس سے بھی اس مفہوم کی تاکید ہوتی ہے۔

### کتب قیمہ

البینہ کی آیت ”فیہا کتب قیمہ“ کے ترجمے میں کتب کا ترجمہ جہاں احکام کیا گیا وہیں کتابیں بھی کیا گیا (ترجمہ عبدالقادر) احکام مانیں یا کتابیں ان کا ظرف صحف قرار دیا گیا تو احکام یا کتابوں کو رکھنے کا مفہوم پایا گیا، اسی مفہوم کی حقیقت کتب خانے ہیں۔

### آپ کے گھرانے کتب خانے

قرآن کے نزول کے دورانیہ اور تکمیل کے بعد رسول اللہ کے گھرانے کتب خانے تھے اور سب سے بڑی متاع لکھی ہوئی آیات و سورتیں تھیں۔ ام المؤمنین حفصہؓ کے یہاں سے خلیفہ المسلمین سیدنا عثمانؓ نے قرآن کریم کا نسخہ حاصل کیا، یہ ام المؤمنین کی ذاتی لائبریری میں محفوظ تھا۔

### دور جاہلیت اور کتب خانے

اسلام کی آمد کے دور اولین میں کتب خانے کا وجود و اہمیت کا اندازہ سطور بالا سے ہوتا ہے، اس کے بعد علم کی وسعت کے بہ قدر کتب خانہ وسیع ہوتا چلا گیا لیکن دور جاہلیت میں بھی کتب خانے کا وجود ملتا ہے بلکہ پبلک لائبریری پائی جاتی تھی، جب شعراء شعر کہتے تو اسے اس

وقت کی سب سے عام جگہ بیت اللہ میں رکھ دیتے، ”المعلقات“ کی یہی تشریح ہے۔

## ارتقائی مراحل

علم کے ساتھ تمدنی ادوار ارتقاء میں کتب خانہ کی معنویت و جامعیت بھی ارتقائی مراحل سے گزرتی رہی اور ظاہری صورت بھی بہتر سے بہتر بنتی رہی، نظم و نسق نے اس کے حسن میں اضافہ کیا اور عالمی سطح پر موجودہ کتب خانے کے وجود نے دنیا کے علوم کو حسین شکل میں پیش کرنے کے ساتھ استفادے کو آسان سے آسان تر بنادیا، جدید ذرائع نے خوبصورت ترین و سہل ترین بنادیا۔

## علم، مدرسہ، کتب خانہ ایک مثلث

دینی مدارس اور کتب خانے میں سے کسی ایک کا تصور دوسرے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا، گوان دونوں کا رشتہ عدم توازن و عدم اعتدال کا شکار زیادہ تر رہتا ہے۔

علم جن ادوار سے گزرتا رہا اسی رفتار سے مدرسے اور کتب خانے وجود میں آتے رہے، جب علم کی شمعیں روشن ہوئیں، مدارس کے مینار بلند ہوئے، کتب خانے سنگ میل بنے اور جب علم کی قدیلیں ماند پڑیں، رفتار رکی، جمود و تعطل کا بھیا نک سایہ پڑا، تب مدارس ویران ہوئے عمارتیں کھڑی رہیں، ذہن و دماغ پر بجلی گری، فکر فرزانہ جہالت کے دلدل میں پھنستی دھنستی گئی اور علمی ورثہ، کتابوں کا مجموعہ ”کتب خانہ“ گرد و غبار کی دبیز تہہ میں ہیرے کی طرح چھپ گیا، بازاروں میں ردی کے بھاؤ بک گیا۔

## دینی مدارس کے کتب خانوں کی تاریخ

ہندوستان میں مدارس دینیہ کی تاریخ کئی صدی پر محیط ہے اور یہی تاریخ مدارس کے کتب خانوں کی ہے، البتہ اس مختصر تحریر کو ایک خاص عرصہ تک محدود رکھا گیا ہے۔

## دینی مدارس

جب سلطنت مغلیہ کا نودال ہوا اور انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے تو یہ قبضہ صرف سرحدی زمینی قبضہ نہ تھا بلکہ تہذیبی اور فکری قبضہ تھا، عقائد اسلامیہ و تشخص اسلامی کو مٹانے کا حملہ تھا، اس لئے جو دینی مدارس موجود تھے وہ مختلف اسباب کے تحت ختم ہونے لگے، سلطنت کے خاتمے نے ان کا خاتمہ کر دیا اور مسیحیت کی اشاعت کے لئے اسکول مشنری کے تحت پورے ملک میں کھلنے لگے، ایسی کڑی گھڑی میں سرخیل جماعت دیوبند قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنے جلیل القدر موقع شناس رفقاء کے تعاون سے دیوبند میں عربی مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور اسے صرف مدرسہ نہیں تحریک قرار دیا۔ اس مدرسے کے نصاب میں شاہ ولی اللہ کے علوم قرآنیہ اور احادیث نبویہ، فرنگی محلی کے فقہ، خیرآبادی منطق و فلسفہ، عربک کالج دہلی کے علوم عصریہ کو شامل کرنے کے ساتھ اس دور کی ہر ضروری صنف علم کو حصہ نصاب بنایا۔ اور حج سفر سے لوٹتے وقت جب عیسائی مبلغ سے ترجمان کے ذریعہ گفتگو ہوئی تو اس کی خواہش کا اظہار فرمایا کہ زندگی نے وفا کی تو انگریزی سیکھوں گا تا کہ براہ راست اپنی بات کہہ سکوں۔

اس ادارے کے قیام کے بعد اس منہج پر مدرسے قائم ہوتے گئے اور نصف صدی تک یہی طرز ہر لحاظ سے ہر حلقہ میں مقبول رہا۔

اس کے بعد تبدیلی کی ضرورت کا احساس زمانے کے مفکرین کو ہوا اور ندوۃ العلماء کے تحت دارالعلوم لکھنؤ میں قائم ہوا۔

پھر مدرسہ الاصلاح سرانے میرٹھ وجود میں آیا۔

اور سہارنپور میں مظاہر علوم دیوبند میں مدرسہ کے قائم ہونے کے چند ماہ بعد قائم ہوا۔ البتہ وہاں طرز تدریس میں مطلوبہ جامعیت کی کمی کا احساس حد درجہ یکسوئی کے لئے باعث پایا جاتا ہے۔

دیوبند، سہارنپور، لکھنؤ، سرائے میر کے مدارس کے طرز پر ہندوستان میں مدارس کی بڑی تعداد موجود ہے اور ان کا انتساب دیوبندیت کی طرف ہوتا ہے، اس لئے ان مدارس میں موجود کتب خانوں کو دیوبندی کتب خانے سے تعبیر کیا جائے گا۔

## ۱- دیوبندی کتب خانے

دارالعلوم دیوبند میں موجود کتب خانے کا شمار ملک کے بڑے ممتاز تاریخی کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ درسی کتب کی تعداد کئی لاکھ ہے اور دیگر علوم و فنون پر مشتمل کئی ہزار، ان میں درجنوں نایاب سینکڑوں کمیاب ہیں۔ یہ انتہائی قیمتی اثاثہ ہے۔ وقف دارالعلوم نے بھی ربع صدی کی مدت میں مفید جامع کتب خانہ تیار کر لیا ہے۔

دارالعلوم کا کتب خانہ تعلیمی اوقات (۶ گھنٹے) میں کھلتا ہے۔ جب امتحان قریب ہوتا ہے تو رات میں مقررہ وقت کے لئے محدود حصہ کھلتا ہے۔ اب ایک بڑی عمارت کتب خانے کے لئے زیر تعمیر ہے۔ خدا کرے جدید ذرائع سے مرصع ہو۔

مظاہر علوم سہارنپور کے جدید و قدیم کتب خانے کو ملا کر دیکھیں تو کتابوں کا عظیم ذخیرہ موجود ہے، وقف مظاہر میں قدیم مراجع زیادہ ہیں تو مظاہر جدید میں جدید مراجع زیادہ ہیں۔ دونوں جگہ کا نظم ادارہ کے تابع ہے۔

## طلبہ کے کتب خانے

دارالعلوم دیوبند و مظاہر علوم سہارنپور کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں طلبہ کی ضلعی انجمنیں تقریر و تحریر کی مشق کے لئے قائم ہیں اور ہر انجمن کے پاس ایک لائبریری ہے، خواہ وہ ایک الماری میں ہی بند ہو۔ اس میں ان کی ضرورت کی کتابیں ہوتی ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا کتب خانہ ہر شکوہ عالیشان کئی منزلہ عمارت میں استفادے



کی دعوت دیتا ہے، درسی وغیر درسی کتب کا بڑا ذخیرہ ہے، اور استفادے کو آسان بنانے کی ممکن  
کوشش کی گئی ہے۔ تعلیمی اوقات میں کھلتا ہے اور رات میں بھی ایک خاص حصہ طلبہ کے لئے کھلا  
رہتا ہے۔

ندوہ میں تمام طلبہ کے لئے ایک انجمن ہے جس کی مستقل لائبریری ہے، اس میں طلبہ  
کے اندر خطابت و مقالہ نویسی کی صلاحیت اجاگر کرنے سے متعلق کتابیں ہیں۔

### ندوہ کی قابل تقلید خصوصیت

کتب خانے و لائبریری کے حوالہ سے استفادے کی سہولت کے لحاظ سے ندوۃ العلماء کا  
یہ اقدام قابل ستائش و تقلید ہے کہ اربابِ حل و عقد نے ندوہ کے ہر ہاسٹل میں ایک کتب خانہ کی  
سہولت رکھی ہے جس میں اس ہاسٹل کے طلبہ کے درجات کے لحاظ سے کتابیں ہوتی ہیں اور نگران کی  
موجودگی میں رات کے مطالعہ کے لئے مختص دورانیہ میں طلبہ استفادے کے لئے پابند ہوتے ہیں۔  
مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ اس نے اپنا نام ابھی تک  
مدرسہ تک محدود رکھا ہے، اس میں موجود کتب خانہ میں غیر درسی کتب کی تعداد چھ ہزار سے زائد  
ہے۔ اس کے کھلنے کا وقت بھی تعلیمی دورانیہ ہے۔

اہم امتیاز: مدرسۃ الاصلاح کا اہم امتیاز یہ ہے کہ اس میں ایک بہت وسیع گونا گوں علمی  
اصناف پر مشتمل لائبریری صرف طلبہ کے لئے ہے، اور جگہ کی وسعت، کتب کے تنوع، نظام کی  
بہتری کے اعتبار سے علمی دنیا میں نمایاں ہے۔

دیوبندی طرز کے مدارس جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہیں اور ایک دو کمرے کی  
مکانی حیثیت رکھتے ہیں یا لقمہ و دق عمارت میں قائم ہیں ان کے دامن میں درسی کتب کا ذخیرہ ایک  
گوشہ یا حجرہ یا عمارت میں موجود ہے اور ارباب انتظام مطمئن ہیں۔

## ۱- بریلوی کتب خانے

بریلوی مکتب فکر کی مشہور درسگاہ جامعہ اشرفیہ مبارکپور اعظم گڑھ میں ہے، اس کا مکتبہ اپنے جلو میں کئی ہزار کتابیں رکھتا ہے اور ردو یو بندیت پر کتب کی بڑی تعداد موجود ہے جس طرح یو بندی کتب خانے میں ردو بریلویت پر مشتمل کتب ہوتی ہیں۔

بریلوی مکتب فکر کے مدارس کے تقلیدی کتب خانے بھی زیادہ تر تدریسی کتب اور ان کے متعلقات سے پر ہیں، نظام بھی بندھاٹکا سا ہے، بریلی کے مدرسے میں مولانا احمد رضا خان کی تصنیفات و قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔

## ۳- اہل حدیث کتب خانے

ملک میں اہل حدیث حضرات کے مدارس بھی متعدد ہیں اور حجم کے اعتبار سے ضخیم بھی ہیں، ان کی بڑی درسگاہ جامعہ سلفیہ بنارس ہے، اس کے کتب خانے میں جدید مراجع اور نئی مؤلفات کی کثرت ہے، درسی کتب حسب ضرورت ہیں۔ اس میں ایسی کتابوں کا بھی وجود ہے جو مقلدین ائمہ کی تقلید کو ناپسند کرتی ہیں، جس طرح مقلدین کے کتب خانوں میں عدم تقلید کو ناپسند کرنے والی کتابیں پائی جاتی ہیں۔

## جامعہ دارالسلام عمر آباد

یہ جامعہ اعتدال پسندی کا نمونہ ہے، بڑی خوبصورت عمارتیں سلیقہ مندی کا پتہ دیتی ہیں، نسبتاً تعلیمی اسلوب زائر کی داد لئے بغیر نہیں رہتا، اسی صاف ستھرے ذوق کا عکاس مکتبہ کتابوں سے مالا مال ہے۔

## شیعی مدارس

ہندوستان کے مختلف شہروں میں شیعہ آباد ہیں۔ ان کے مکاتب کی انجمن تنظیم الکاتب

ہے اور مدرسے بھی بنارس، لکھنؤ کے مدارس شہرت رکھتے ہیں۔ دہلی میں بھی کئی مدرسے قائم ہوئے ہیں۔ گوان کی علمی مرجعیت قم کو حاصل ہے۔ ان کے کتب خانے میں مناقب اہل بیت پر کتب دستیاب ہیں تو معزز شخصیات سے اظہار ناپسندیدگی کے مضامین پر مخموی کتب بھی ہیں۔

## شافعی کتب خانے

ہندوستان کے ساحلی علاقے میں حضرات شوافع کی آبادی پائی جاتی ہے، ان کے مدارس میں جامعہ اسلامیہ بھٹکل بڑا مدرسہ ہے، اور تعلیمی امور میں ندوۃ العلماء سے منسلک ہے، اس ادارے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ۹۵ فی صد طلبہ صرف بھٹکل شہر کے دارالاقامہ میں رہ کر تعلیم پاتے ہیں، اس کے کتب خانہ میں فقہ شافعی کے مراجع بڑی تعداد میں ہیں۔

سرسری جائزہ بتاتا ہے کہ پانچ طرح کے کتب خانے دینی مدارس میں پائے جاتے ہیں۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شافعی اور شیعہ مکاتب فکر کے ملک میں پھیلے کتب خانوں میں کئی کروڑ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے جو ملت اسلامیہ ہندیہ کا بہترین اور قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کی حقیقی قدردانی اس سے استفادہ ہے۔ اس لئے بہتر سے بہتر استفادے کی صورتیں نکالنا منتظمین کا فرض منصبی ہے، اگر ان اثاثوں پر تالے پڑے رہیں تو ایسا ہی ہے جیسے کسی خزانہ پر سانپ کی اجارہ داری ہو۔

## کوٹاہیوں کا ازالہ

عموماً بڑے مدارس کے ساتھ چھوٹے مدارس کے کتب خانے صرف تعلیمی اوقات میں کھلتے ہیں، تعلیم میں مصروف ہونے کے باعث طلبہ فائدہ نہیں اٹھا پاتے، اس لئے سفارش کی جاتی ہے کہ تعلیمی اوقات کے علاوہ کتب خانے کے دروازے کھلیں۔

☆ طلبہ میں کتب بینی اور مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے

- ☆ مطالعہ کا طریقہ سکھایا جائے
- ☆ مدارس ہر سال کتب خانہ کے لئے معقول رقم بجٹ میں مختص کریں
- ☆ جدید ذرائع کا استعمال کیا جائے
- ☆ سند یافتہ لائبریرین کا انتخاب کیا جائے

### پانچ مکاتب فکر کے کتب خانے کے اثرات

دینی مدارس میں پائے جانے والے پانچ مکاتب و فرقے کے پانچ علمی ذخائر کے جامع کتب خانوں کے امت پر اثرات کیا مرتب ہو رہے ہیں اس کا تجزیہ بھی ضروری ہے۔ کسی زمانے میں مسلکی تشدد کو ہوا دی گئی تو خون ریزی تک بات پہنچی اور عباسی دور میں شوافع و حنابلہ کے مابین شدید اختلافات ہوئے، لڑائیاں ہوئیں، معتزلی و اشعری اختلافات بھی جنگ کی صورت اختیار کر گئے۔ اس دور میں امریکا و اسرائیل مسلمانوں کو دو بلاک (سنی شیعہ) میں تقسیم کرنے پر پھر آمادہ ہے۔ ایک طرف مقلدین و غیر مقلدین ایک دوسرے پر سخت تنقید کرتے ہیں، بریلوی دیوبندیوں کو حق کلمہ گوئی سے بھی محروم کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ سوچ یہ فکر ان کتابوں کی رہن منت ہیں جو کتب خانوں میں قرینے بے قرینے رکھی ہیں۔

یہ کتب خانوں کے رد عمل ہیں اس لئے کتب خانوں کا صحیح مقاصد کے لئے استعمال ضروری ہے، ان سے ایسی کتابیں منتخب کی جائیں جو وحدت کی تعلیم دیتی ہوں، تفرقہ سے نفرت دلاتی ہوں اور فضلاء کی ایسی جماعت تیار کی جائے اور ان کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ اعداء کی چال سمجھیں، اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کریں، امت کو انتشار و اختلاف سے بچائیں، اختلافی امور میں راہ اعتدال اپنائیں، دوسرے فریق کو معذور سمجھیں۔ اس کے اختلاف مسلک کو جنگ کے راستے پر نہ لے جائیں۔



## گروہ بندی کے نقصانات

مسلمی گروہ بندی کے نقصانات میں مضرت ترین یہ ہے کہ دنیا مسلمانوں اور اسلام کی خصوصیات سے ناواقف ہو جائے گی۔ اور وہ سنجیدہ کاوشیں بے سود ہو جائیں گی جو دعوت اسلام کے محاذ پر جاری ہیں، اس لئے ہر باشعور، غیور مسلمان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اختلافات کو ختم کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ ان تمام دینی اداروں کا فریضہ ہے کہ وہ ایک سنجیدہ مستعد ٹیم تیار کریں جو امت کے کینسر کا خاتمہ کرے اور کلمہ کی بنیاد پر متحد کرے اور بنیان مرصوص کا مصداق بنے۔

## احساس جاں گزریں ہو

ایسے افراد کے اندر یہ احساس جاں گزریں ہو کہ وہ علمی کمالات و اختصاصات کسی معیار کو پہنچ جائیں، حقائق سے بالکل واقفیت ضروری نہیں چونکہ احاطہ کرنے والی ذات باری تعالیٰ ہے۔ دین اور دینداری کے فرق کو سمجھیں، بین مسالک گفتگو، انٹرویو، سوال و جواب کے طریقے کو عام کریں، مسالک و مذاہب کے بننے کے عوامل پر نگاہ رکھیں، طلبہ کے درمیان مناقشے کی طرح ڈالیں، عالم اسلام میں پائی جانے والی گروہ بندی کے خاتمے کی سبیل کریں، ایسے اقدامات کریں جن سے وحدت قائم ہو، دوسرے کے قول کو سننے غور کرنے کی عادت ڈالیں۔

## اصل شکل نظر آئے

دینی مدارس کے کتب خانوں میں ایسے مقالات اور تصنیفات کو جمع کیا جائے جو مذہبی مسلکی مشربی مکتبی جماعتی اور ذوقی عصبیتوں پر ڈھیر ساری مٹی ڈال دیں اور پڑھنے والے کا دماغ و ضمیر ایسا آئینہ بن جائے جس میں القرآن والسنة اور مجتہدین و مجددین کی تشریحات اصل شکل میں نظر آئیں۔

## مثبت کردار ادا کریں

موجودہ دور میں جو صہیونی سازش کام کر رہی ہے وہ امت مسلمہ کی تقسیم در تقسیم کر کے کمزور ترین کرنے اور ان پر کلی غلبہ پانے کی ہے اس لئے اسلامی و دینی کتب خانوں کا کردار بڑے نازک مرحلے میں داخل ہو چکا ہے، مصنفین و مؤلفین اور مفکرین کی ذمہ داری دو چند ہو چکی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ کتب خانے اپنا کردار ادا کریں اور شیعہ و سنی اپنے تشخص کے تحفظ کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کے لئے مساعی تیز سے تیز تر کر دیں۔ اور دیگر اسلامی مذاہب کے اختلافی مسائل کو باہمی اختلاف و نزاع کا ذریعہ نہ بنائیں، گروہ بندی کی فضا ختم کریں اور ہر اختلافی مسئلے کو سمجھنے کی تہہ تک پہنچنے کی راہ اعتدال نکالنے کی کوشش کریں، اور نقطۂ اتحاد تلاش کریں۔

سنی و شیعہ اتحادی فکر کے لئے علوی و صفوی شیعہ فلسفے کا مطالعہ علی شریعتی کے مقالات اور تصنیفات کے ساتھ شیخ مہدی، شمس الدین، احمد الکاتب، عبد الحمید کی کتابیں پڑھنے والوں کے اندر شعور پیدا کرے گا۔

علامہ ابن تیمیہ کی مشہور کتاب منہاج السنۃ النبویہ، فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب، سید قطب کی ”الامۃ ایسی کتابیں ہیں جو گروہ بندی کی جگہ شیرازہ بندی کی ملاحیت پیدا کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ المذاہب الاسلامیہ تیمور اور ابوزہرہ کی، اور ”الامۃ“ ناصیف نصار، محمد مبارک اور احمد فرحات کا مطالعہ بھی مفید ثابت ہوگا۔

## دیوبندیت و سلفیت کشمکش دور کی جائے

دینی مدارس کے کتب خانوں میں دیوبندیت و سلفیت یا مقلدیت و غیر مقلدیت کے موضوع پر اختلافی کتب کا روز بہ روز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، جو ان دونوں طبقوں میں پائے جانے والے اختلافات کے عکاس ہیں۔ بات صرف کتب اختلافیہ کی نہیں بلکہ نوبت مناظرہ تک

پہنچ رہی ہے، اس لئے ان دونوں طبقات کے مابین گروہی اختلاف کے ازالہ کے لئے ان کتابوں کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی ضروری ہے، جو راہ اعتدال کی رہنمائی کریں۔

یہ طے ہے کہ علماء اہل حدیث و علماء دیوبند مذاکرے کے ذریعہ ان اختلافات کو ختم نہیں کر سکتے اس لئے ضلال و گمراہی کے فتوؤں سے گریز ضروری ہے، اور مفتی عزیز الرحمن، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند نے اہل حدیث کا شمار اہل سنت والجماعت میں کیا ہے اس لئے اتفاقی امور پر اتحاد اور اختلافی امور میں ایک دوسرے کو معذور سمجھتے ہوئے زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھنا چاہیے۔ دونوں طرف کے اکابر علماء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ میں اتحاد قائم رکھے ہوئے ہیں اس کی دعوت عام زندگی میں دی جائے، اور ان کتابوں کے پڑھنے سے گریز کا مشورہ دیا جائے جو اختلافات پیدا کرتی ہیں۔

### دینی کتب خانے کا دنیوی کتب خانے سے مقابلہ میں امتیاز

آج کی دنیا آسمان پر کمند ڈال رہی ہے، مادی ترقی روز بہ روز ہو رہی ہے، تجرباتی علم سائنس نے ایجادات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اور چاند و مریخ تک تحقیقات کا دورازہ کھلا ہے۔ ان علوم کا احاطہ بھی کتب خانہ ہی کرتا ہے، اس لئے دینی مدارس کے کتب خانوں کے بالمقابل عصری علوم کے کتب خانے پوری دنیا میں جدید ترین ذرائع کی شکل میں موجود ہیں، انٹرنیٹ پر کتب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ موجود ہے۔ اور دنیا کی توجہ کا مرکز ہے، اب سوال یہ ہے کہ دینی مدارس کے کتب خانوں کی ان عصری کتب خانوں کے تئیں کیا ذمہ داری ہے؟ جواب دو ٹوک ہے کہ دینی مدارس کے کتب خانے دینی رہنمائی کا علم رکھتے ہیں اور علم شریعت کا ماخذ اولین قرآن ہدی للناس ہے، اس طرح دینی کتب خانے دین کی روشنی دیگر تمام کتب خانے تک پہنچانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ان کا فریضہ منصبی ہے۔ دین کی روشنی قرآن کی تبدیل ہر کتب خانے کو ہر علم کو مفید بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، روشن کرنے کی لیاقت رکھتی ہے، اور یہ مرکزی

کردار ہے دینی مدارس کے کتب خانوں کا دنیا کے کتب خانوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن کریں اور کتب خانوں کے غلط استعمال پر روک لگائیں، خیر امت اور خیر مکتبہ کا یہی تقاضا ہے۔

## دینی کتب خانوں کے لئے چیلنج

آج غیر دینی کتب خانے نے دینی کتب خانے کے لئے جو مشکلات پیدا کی ہیں وہ دینی کتب خانے کے لئے چیلنج ہیں، جیسے مغربی استعمار، صہیونی معرکہ آرائی، آزاد بے ہنگم میڈیا، تعلیمی مشکلات، صنعتی و تکنیکی دشواریوں پر مبنی کتب خانے، مسلم ممالک پر تسلط کی بڑھتی کوششیں، اخلاقی اقدار، سیاسی و اقتصادی فلسفے کے ساتھ مسلم امت کے اندر پائی جانے والی خرابیوں اور دشواریوں پر محیط کتب خانے جیسے مسلمانوں کی معاشی پسماندگی، غربت و فقر، جسمانی امراض، معاشرے کی بربادی، ذخیرہ اندوزی، نسلی و علاقائی عصبیت کے سوا، ایک قطبی نظام کی طاغوتی خواہش، اخلاقی ضمیر کی موت، روح کی پڑمردگی، تشدد پسندی، خاندانی بکھراؤ، مخدرات کا استعمال، ذہن و دماغ پر چھاپے اور میڈیا کا فکری و عقلی کھلواڑ، کساد بازاری، پروپیگنڈہ بازی، آزادی و حریت کے مفہوم کا غلط استعمال، ایٹمی توانائی پر تسلط اغیار انسانی وجود کے لئے خطرہ، ان تمام مشکلات اور چیلنج سے معاصر عصری کتب خانے بھرے ہیں جو دینی کتب خانے کے لئے کھلا چیلنج ہیں۔

## فساد کے مقابل اصلاح

ان فساد پھیلانے والے لٹریچر اور فکری یلغار کرنے والے کتب خانے کا مقابلہ اصلاح پر مبنی لٹریچر اور دینی کتب خانے کے ذریعہ ہی کیا جانا وقت کی ضرورت، انسانیت کی بقا، حیات کے ارتقاء کے لئے لازمی ہے۔ ان کا حل صرف اور صرف قرآن و حدیث میں ہے، دینی کتب خانہ کی اساس اور سب سے بڑا سرمایہ یہ قرآن و سنت ہے، قرآن فساد کا مقابلہ اصلاح سے سکھاتا ہے، فاسد لٹریچر کے مقابلہ میں صالح لٹریچر کا طاقتور ہونا ضروری ہے، قرآن ایمان کی تجدید پر زور



دیتا ہے جس میں ہر عصر کے مطابق مشکلات کے حل تلاش کرنے کی دعوت ہے، قرآن غلط کے مقابلہ صواب پسند کرتا ہے، مختلف صلاحیتوں کے نشوونما کی دعوت دیتا ہے، جسم و عقل اور نسل کے تحفظ کو فرض قرار دیتا ہے، مزاجوں کی رعایت اس کے خمیر میں ہے، ہر چیز میں عادلانہ تقسیم پر ابھارتا ہے، معاشرتی نیشنل و انٹرنیشنل قیام امن کا علمبردار ہے، روحانی و نفسیاتی جذبات کی رعایت رکھتا ہے، اخلاقی ضمیر کی رہنمائی کرتا ہے، صحیح تعلیم کی تلقین کرتا ہے، فکر و رسا عقل کی بلندیاں عطا کرتا ہے، کوتاہ عقلی سے دور رکھتا ہے، شدت پسندی سے اجتناب سکھاتا ہے، دھوکہ دہی، جھوٹ، انسانی خواہشات پر بیجا بندش پر پابندی لگاتا ہے، زمینی آبادی کی بربادی کی ہر سوچ کا خاتمہ کرتا ہے۔

ان اصولوں پر مبنی دینی کتب خانہ دنیوی کتب خانے کے مقابلے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دینی مدارس میں موجود کتب خانے سے ان موضوعات کی کتابوں کو نمایاں مقام پر رکھنے کا انتظام کیا جائے۔ اور اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ کو مطالعہ کی میز پر بٹھایا جائے، ان اصولوں کا تعارف کرایا جائے، ان کے ذہن و دماغ میں راسخ کیا جائے کہ ان کا ضمیر جاگ اٹھے، خیر کے فوارے ان افکار سے پھوٹیں، شرار بولہبی پر ڈھیروں اوس پڑے، باطل پاش پاش ہو۔ جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔



## دینی مدارس اور کتب خانے

☆ مولانا رضوان احمد ندوی ☆

مدارس دینیہ اسلام کی حفاظت و بقا کے مضبوط قلعے اور علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت کے سرچشمے ہیں، یہاں دین کے داعی و مبلغ اور اسلام کے سپاہی و مجاہد تیار ہوتے ہیں اور ضلالت و گمراہی میں ڈوبی انسانیت کو نئی زندگی عطا کرتے ہیں، لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر علم و ہدایت کی راہ پر گامزن کرتے ہیں، علماء کا یہی وہ امتیازی وصف ہے جس سے وہ سماج و معاشرہ میں قبلہ نما کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن اب دنیا کے حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں، الحاد و بے دینی کے فتنے نئے نئے روپ میں ظاہر ہو رہے ہیں، اسلام مخالف تحریکیں نئے منصوبوں کے ساتھ میدان عمل میں سرگرم ہو رہی ہیں کہ کس طرح اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچایا جائے، ان حالات میں اصحاب مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ نئے حالات، نئے تقاضوں اور نئے فتنوں کا پوری تیاری اور عالمانہ بصیرت و داعیانہ حکمت کے ساتھ مقابلہ کریں، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے: ”آج زمانے کے خیالات اور دنیا کے واقعات میں اس تیزی سے تبدیلی ہو رہی ہے کہ ان کو جانے اور سمجھے بغیر آپ مسلمانوں کی خدمت نہیں کر سکتے، دنیاوی، سیاسی اور اقتصادی خیالات ایسے چھائے ہوئے ہیں اور انقلاب کی گھڑیاں وہاں اس طرح پے در پے آرہی ہیں اور گزر رہی ہیں کہ ایک عالم دین کے لئے جس کو مسلمانوں کا خدمت گزار ہونا ہے ان کو سمجھنا اور ان کے حل کی تدبیریں سوچنا ضروری ہے، صرف اعراض اور تغافل سے آپ ان مسائل کو حل نہیں

☆ امارت شرعیہ بہار، اڈیسہ و جھارکھنڈ

کر سکتے، آپ کے توجہ نہ کرنے سے نہ دنیا اپنے قاعدے کو بدل سکتی ہے اور نہ زمانہ اپنے رخ کو پلٹ سکتا ہے، مشکلات کا مقابلہ کرنا اور موجودہ جدوجہد میں مناسب حصہ لینا اور ملک و قوم کی زندگی میں مسلمانوں کے مناسب مقام حاصل کرنے کی کوشش کرنا بھی ایک عالم دین کا فرض ہے“ (حیات سلیمان ۱۱۷)۔ ضرورت ہے کہ مخالفانہ ماحول کے رخ کو پھیرنے کے لئے مدارس کے نظام تعلیم و تربیت اور طریقہ تدریس کو معیاری اور پرکشش بنایا جائے، حاملین علوم نبوت کے اخلاق و کردار کو بلند کیا جائے، ان کی فکری قوتوں کو پروان چڑھانے اور دماغی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لئے مطالعہ اور کتب بینی کے ذوق و شوق کو ابھارا جائے، معلومات کے دائرہ کو وسیع کرایا جائے، اس کے لئے ہر مدرسہ میں ایک معیاری کتب خانہ قائم کرایا جائے جو مختلف علوم و فنون: تفسیر و حدیث، تاریخ و سیر، فقہ و اصول فقہ جیسے امہات الکتاب کا بیش بہا خزانہ ہو، کیونکہ مدرسہ اور کتب خانہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، ان دونوں کی اساس اقراء اور قید و العلم بالکتاب پر قائم ہے اور جب تک اس عالم میں اقراء کا سلسلہ قائم رہے گا اس کی تحریک احیاء علوم و کتب کا دریائے فیض رواں رہے گا۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عہد میں مسلمانوں کی علمی تاریخ کا باب نہایت شاندار رہا ہے، خاص طور پر عہد عباسی کو اس باب میں امتیاز حاصل رہا ہے، اس دور میں کتب خانوں کی اتنی کثرت رہی ہے کہ اس سے قبل انسانی تاریخ کے کسی دور میں ہمیں کتب خانوں کی اتنی کثرت و تنوع کا کہیں سراغ نہیں ملتا، شاہان عباسی نے خزانہ الحکمة، بیت الحکمة، خزانہ الکتاب قائم کر کے کتب خانہ سازی کی تحریک کو عالمگیر تحریک بنا دیا۔

جب اسلام کی شعاع برصغیر ہندوپاک میں پھیلی تو ہندوستان کے ہر علم دوست سلاطین نے مدرسوں کے قیام کے ساتھ کتب خانے بھی تعمیر کرائے جس کی ایک طویل تاریخ ہے لیکن جب تک ان کتب خانوں سے استفادہ کرنے والے اصحاب علم و فضل موجود رہے کتب خانوں میں زندگی کی حرارت باقی رہی اور جب علمی زوال آیا، اخلاف نے اسلاف کے علمی ذوق کی قدر

نہ کی تو کتب خانے بھی ویران ہونے لگے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلابی عہد کے بعد جب علماء ہند نے ہندوستان میں مدرسوں کا جال بچھایا تو اس کے ساتھ ہی سیکڑوں ہزاروں کتب خانے بھی قائم کئے، ہر مدرسہ کے احاطہ میں کتب خانہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ لیکن اب بھی بہت سے ایسے دینی مدارس ہیں جہاں مدرسہ کے منتظمین مدرسہ کے لئے فلک شگاف عمارتیں تعمیر کراتے ہیں، اس کو گنبد و محراب سے مزین کرتے ہیں، مگر کتب خانہ کے قیام کے سلسلہ میں بڑی بے توجہی و بے اعتنائی برت رہے ہیں، اس پہلو پر اصحاب الرائے علماء کو غور کرنا چاہئے اور مدارس کے ذمہ داروں سے کہنا چاہئے کہ مدرسوں کے عام بجٹ میں کتب خانہ کی تعمیر اور کتابوں کی خریداری کو بھی لازماً شامل کریں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جن اداروں میں کتب خانہ قائم ہے وہاں مطالعہ کا ذوق و شوق اور کتب بینی کا مزاج کم ہوتا نظر آ رہا ہے، جب کہ ہر ایک کتاب کے لئے اس کا پڑھنے والا چاہئے، پڑھنے والے کے بغیر کوئی کتاب چاہے وہ کیسے ہی قیمتی اور عالمانہ کیوں نہ ہو بے معنی و بے مقصد ہے، رابندر ناتھ ٹیگور نے ۱۹۲۸ء کی آل انڈیا لائبریری کانفرنس میں کہا تھا کہ: ”اگر لوگ کتب خانے سے استفادہ نہ کریں تو ایسے کتب خانہ پر فخر کرنا جہالت و نادانی کی بات ہوگی“۔ علامہ بدیع الزماں ہمدانی نے اپنے بھانجے کو ایک خط میں لکھا کہ ”تم میرے بیٹے ہو جب تک علم تمہاری شان اور مدرسہ تمہارا مکان ہے، قلم دوات تمہارا ساتھی ہے اور کتاب تمہاری دوست ہے، اگر تم اس میں کوتاہی کرو گے تو پھر تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا“ (الرسائل لبديع الزماں ہمدانی ۱۳۴۹ھ / ۱۲۳۹۱۵۲)۔ یہی وجہ ہے کہ مطالعہ سے عدم دلچسپی کے باعث مدرسوں کے اکثر کتب خانوں میں کتابیں منتشر اور بکھری رہی ہیں، بے ترتیب کتابوں پر گرد و غبار کی تہیں تک جم جاتی ہیں جن سے استفادہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس بے حسی کو دور کرنے کی ضرورت ہے کہ کتابوں کو منظم اور مرتب انداز میں رکھا جائے، اس کے لئے مستقل ایک اندراج کتب رجسٹر بنایا جائے جس میں کتاب کا نام، مصنف کا نام، زبان، مطبع، سن طباعت اور صفحات کی تعداد کی صراحت و وضاحت ہو اور یہ بھی تحریر کر دیا جائے کہ یہ کتاب لائبریری میں کب آئی اور کہاں سے



آئی، خریدی گئی ہے یا کر، نے ہدیہ و تحفہ میں عنایت کی ہے، پھر ان کتابوں پر مہر لگا کر فن و ار  
الماریوں میں ترتیب اور سنیت سے جمائی جائیں، ہر فن کی کتابوں پر علیحدہ علیحدہ چٹ لگا کر  
الماریوں میں رکھی جائیں۔ کتابوں میں طلبہ کی ضرورت کے لحاظ سے درسی کتب کے کئی کئی نسخے  
کتب خانوں میں موجود رہیں۔ تاہم استفادہ میں سہولت ہو، اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون کی غیر  
درسی کتب کا بھی معتمد بہ ذخیرہ کتب خانہ میں ہونا چاہئے، تاکہ اساتذہ و طلبہ فرصت کے اوقات  
میں ان سے استفادہ کر سکیں۔ اس موضوع پر تحقیق و ریسرچ میں ان سے مراجعت  
کریں (۱)۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ کتب خانہ برفضا مقام پر صاف ستھرے ہونے چاہئے تاکہ  
اس کے ظاہری حسن و جمال کے خوشگوار اثرات نظر پر پڑ سکیں، کتب خانہ میں فن و ار حروف  
تہجی کے اعتبار سے کٹلاگ کا بھی انتظام ہونا چاہئے۔ متعلقہ موضوع کی کتابیں آسانی سے  
دستیاب ہو سکیں۔ بہر حال جدید تعلیمی نظام میں کتب خانہ کی اپنی اہمیت رہی ہے اور اس سے کوئی  
بھی علم دوست حضرت بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ خدا کرے یہ چند کوئی چھوٹی سطریں اس بات کا داعیہ  
پیدا کرنے میں کامیاب ہوں جس کے نہ ہونے سے ہماری تعلیمی زندگی میں ایک بڑا خلا پیدا ہو رہا  
ہے۔ یا ہونے کے باوجود عدم دلچسپی پائی جا رہی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

حاشیہ:

(۱) جیسا کہ ملک کے بیشتر مرکزی اداروں میں اس طرح کا نظم ہے:

(الف) کتب خانہ دارالعلوم: دارالعلوم دیوبند کا کتب خانہ بڑا قیمتی اور معیاری ہے جس میں  
معرکہ الاراء کتابوں کے علاوہ علوم عصریہ کی بھی قابل ذکر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، یہاں ایک  
لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔

(ب) ندوۃ العلماء کا کتب خانہ: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا کتب خانہ علوم اسلامیہ کا  
سب سے قیمتی سرمایہ ہے جس میں پچاس ہزار کتابیں ہیں ۶۷۰ کتابیں نوادرات میں شمار ہوتی ہیں۔

اور مختلف علوم و فنون میں مخطوطات کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے۔

(ج) جامعہ رحمانی مونگیر کتب خانہ: جامعہ رحمانی مونگیر کتب خانہ شاندار اور جدید طرز کی

عمارت میں قائم ہے جس میں تقریباً ۲۵ ہزار کتابیں ہیں۔

اس کے علاوہ مظاہر علوم سہارنپور، ضیاء العلوم رائے بریلی، دارالعلوم حیدرآباد، سبیل السلام

حیدرآباد، المعبد العالی الاسلامی حیدرآباد، جامعۃ الفلاح بلریا، مدرسۃ الاصلاح سرائے میرا عظیم گڑھ،

خانقاہ مجیبہ پھلواری شریف وغیرہ جیسے اداروں کی لائبریریوں میں موزوں کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے

جس کی حیثیت علمی گلزار کی ہے۔





پانچواں باب  
مدارس میں عربی کی تعلیم





## ہندوستان میں عربی زبان و ادب ماضی اور حال کے آئینہ میں

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم  
النبيين محمد وعلى آله وصحبه أجمعين۔

حضرات! اس سمینار کے لئے جو موضوعات اختیار کیے گئے ہیں، ان میں ایک موضوع  
”دینی مدارس میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر مروج کرنے کی ضرورت اور اس کے لئے  
تدبیریں“ بھی ہے، اس مسئلہ کا تعلق بنیادی طور پر اس بات سے ہے کہ عربی زبان و ادب کے  
بارے میں ہمارے علماء کا موقف کیا رہا ہے اور کیا ہے؟ اور مدارس کے نصاب میں اس کو کیا  
حیثیت دی گئی ہے، یہ بہت تفصیلی موضوع ہے، اس کے لئے نصاب کا جائزہ لینے کی ضرورت  
ہے، ہم یہاں پر صرف عہد قدیم اور موجودہ عہد میں جو موقف رہا اس پر اکتفا کریں گے۔

نصاب تعلیم پر مستقل سمینار کی ضرورت ہے، پہلے یہ طے کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم  
نصاب تعلیم اور منہج تعلیم میں تبدیلی کے لئے کم از کم غور کرنے کے لئے تیار بھی ہیں یا اپنے اس  
نظام کو کلی طور پر باقی رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

حضرات! گزشتہ صدیوں میں ہندوستانی علماء اور باحثین کے عربی زبان و ادب سے

شغف کا بنیادی سبب علوم اسلامیہ اور ان کے سرچشمہ قرآن و حدیث سے تعلق اور ان کو سیکھنے سکھانے کا جذبہ تھا، اسی طرح فقہ سے تعلق بھی تھا جس پر عہد اسلامی میں تمام توجہات مرکوز ہو گئی تھیں۔ ایک دوسرا سبب عربی زبان سے ان کی محبت بھی تھا، جیسا کہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی طرف اشارہ کیا ہے، علوم اسلامیہ کی تاریخ کا جائزہ لینے والا اس حتمی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ تمام علوم اسلامی: نحو، صرف، بلاغت اور لغت وغیرہ کا بنیادی مقصد فہم قرآن کو سہل اور آسان بنانا ہے، اور یہی چیز شعر جاہلی پڑھنے پڑھانے کا قوی محرک بنی، چنانچہ آمد اسلام کے بعد عربی زبان اسکالروں اور باحثین کا مرکز توجہ اور ان کا حقیقی ہدف بن گئی تھی، اس لئے کہ عربی زبان تمام اسلامی علوم و فنون کی کنجی ہے، اسی وجہ سے ہندوستانی علماء نے تمام زمانوں میں عربی زبان سیکھنے اور اس میں عبور حاصل کرنے پر بھرپور توجہ دی، عرب فاتحین کی آمد اور یہاں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد سے وسیع پیمانے پر مدارس قائم کیے گئے اور عرب ملکوں سے امہات کتب اور مراجع کے حصول کو آسان بنانے کے لئے تمام علوم و فنون میں کتابیں تصنیف کی گئیں۔ اس علمی سرگرمی کے نتیجہ میں ہندوستان میں عربی زبان و ادب کے بڑے بڑے ماہرین اور مرجع کی حیثیت رکھنے والے نابغہ روزگار علماء پیدا ہوئے، ان میں سرفہرست صاحب ”العیاب الزاخر“ شیخ حسن بن محمد صغانی متوفی ۶۵۰ھ، صاحب ”مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار“ شیخ محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ، صاحب ”الفرائد شرح الفوائد“ شیخ محمود بن محمد عمری جوہپوری متوفی ۱۰۶۲ھ اور صاحب ”تاج العروس شرح القاموس“ سید مرتضیٰ زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ ہیں۔ اس طرح ان صدیوں میں عربی زبان تصنیف و تالیف کی زبان تھی اور فارسی زبان کے ملک کی سرکاری زبان ہونے کے باوجود عربی زبان علماء اور اسکالروں کی مرکز توجہ بن گئی تھی۔

عہد بعہد نصاب تعلیم کا سرسری جائزہ بتاتا ہے کہ علوم عقلیہ اور فقہ کی طرف رجحان عام کے باوجود نصاب میں عربی زبان کو ہمیشہ مرکزی مضمون کی حیثیت حاصل رہی ہے، اس لیے کہ

عربی زبان حکام، امراء اور وزراء کا تقرب اور حکومت میں اعلیٰ مناصب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ تھی، اس طرح عربی ادب کے دونوں پہلو نظم و نثر میں ہندوستانی علماء نے گراں قدر تصنیفات پیش کی ہیں، اور ان کے نثری اور شعری نمونوں کو عربی ادب میں بڑا مقام حاصل ہے، درج ذیل حضرات شاعری میں درجہ کمال پر فائز نظر آتے ہیں۔

قاضی عبدالمقتدر کندی صاحب القصیدۃ اللامیۃ (متوفی ۷۹۱ھ)۔ شیخ احمد بن محمد تھانیسری صاحب القصیدۃ الدلیۃ (متوفی ۸۲۰ھ)۔ شیخ غلام نقشبندی صاحب القصیدۃ المدحیۃ اللامیۃ (متوفی ۱۱۲۶ھ)۔ شیخ غلام علی آزاد بلگرامی صاحب السبع السیارة (متوفی ۱۲۰۰ھ)۔ مفتی اسماعیل بن وجیہ لکھنوی متوفی ۱۲۵۳ھ، شیخ فضل حق خیر آبادی صاحب القوانی والتجنیس (متوفی ۱۲۷۸ھ)۔ صاحب الشعر الرصین الرقیق سید احمد حسن قنوجی متوفی ۱۲۷۷ھ، مفتی صدر الدین دہلوی متوفی ۱۲۸۵ھ، شیخ فیض الحسن سہارنپوری متوفی ۱۳۰۲ھ، شیخ ذوالفقار علی دیوبندی متوفی ۱۳۲۲ھ اور استاد ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء شیخ عبدالرحمن کاشغری متوفی ۱۹۷۱ء۔

حضرات! ہندوستانی علماء نے علوم اسلامیہ میں ایسی ایسی عظیم تصنیفات پیش کی ہیں جو صدیوں عالم اسلامی اور عالم عربی میں داخل نصاب رہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں نے بیش بہا کتب خانہ تیار کر دیئے، جن علماء عظام نے کتب حدیث کی شروح لکھی ہیں اور علم حدیث، فقہ اور اصول فقہ میں ان کی تصنیفات کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی ان کی فہرست طویل ہے، اسی کے ساتھ ایسے ایسے نابغہ روزگار ادباء اور محققین بھی ہوئے ہیں جنہوں نے عربی ادب (نثر و نظم) کی کتابوں کی شرح اور ایسی تحقیقی خدمات انجام دی ہیں کہ عربی ادب کے اسکالروں اور شائقین کو غیر ہندوستانی علماء اور محققین اور متقدمین کی تحقیقات اور شروحات سے بے نیاز کر دیا، بروکلمان نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”تاریخ الادب العربی“ میں ایسے متعدد محققین کا تذکرہ کیا ہے، اخیر عہد میں عربی زبان و ادب کے عظیم محقق شیخ عبدالعزیز مبینی راجکوٹی (متوفی ۱۹۷۸ء) نے اپنی علمی،



تاریخی اور ادبی تحقیقات و تعلیقات اور قیمتی حواشی کی بنا پر عرب ادباء سے خراج تحسین حاصل کیا ہے، عرب ادباء نے ان کی معرکہ آراء کتاب ”سمط اللالی شرح الآمالی“ اور ”ابوالعلاء و مالیه“ کو بحث و تحقیق اور نقد و تمحیص کے میدان میں ٹکسالی نمونہ قرار دیا ہے، پہلی کتاب میں مبینی صاحب نے ابو عبید بکری کی آراء اور قالی پر نقد کی علمی و تاریخی بحث کی ہے، اور دوسری کتاب میں ڈاکٹر طہ حسین کی کتاب ”ذکری ابی العلاء“ کا مدلل جواب دیا ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب ”الفائت من شعر ابی العلاء و الممتنی“ عالم عربی میں مقبول ہوئی، شیخ سعید انصاری صاحب نے لوئیس شیخو یسوی کی کتاب ”شعراء النصرانیہ“ پر سخت نقد کیا، علامہ شبلی نعمانی نے جرجی زیدان کی کتاب ”تاریخ التمدن الاسلامی“ کے بعض مضمون پر سخت مواخذہ کیا، جس کا عالم عربی میں اعتراف کیا گیا، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی معرکہ آراء کتاب ”ارض القرآن“ میں عربوں کے علم جغرافیہ میں قیمتی معلومات کا اضافہ کیا جو تاریخ ادب عربی میں اہمیت کی حامل ہیں، ہندوستانی علماء کی بعض تصنیفات کو عربوں میں بڑی پذیرائی ملی، ان کی طباعت و اشاعت کا انتظام ہوا، اور نصاب تعلیم میں شامل کی گئیں، جن دیگر کتابوں کو عالم عربی میں بڑی مقبولیت اور پذیرائی ملی ان میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب ”حجۃ اللہ البالغۃ“ علامہ صدیق حسن خاں قنوجی کی تالیفات اور علماء فرنگی محل شیخ عبدالباری فرنگی محلی اور ابوالحسنات علامہ عبدالحی فرنگی محلی کی تصنیفات ہیں، جو تحقیق و تعلیق کے بعد بڑے پیمانے پر عالم عربی میں طبع ہو کر مقبول ہوئیں۔

حضرات! ملک کی آزادی کے بعد عربی زبان کو تعلیمی اور ادبی مقاصد کے ساتھ ساتھ سیاسی اور تجارتی مقاصد کے لئے بھی اختیار کیا جانے لگا، اور اسے عالمی زبانوں میں ایک اہم مقام حاصل ہو گیا، ہندوستان اور عالم عربی کے مابین دوستانہ روابط، تجارتی و سفارتی تعلقات مستحکم ہو جانے اور دیگر اسباب کی بنا پر عربی زبان و ادب کو بڑا فروغ ہوا، ان اسباب میں سے ایک سبب انگریزی سامراج کے اثرات کو مٹانا اور قدیم مشرقی تہذیب کے خلاف مغربی یلغار کا

مقابلہ تھا، لہذا دینی اور اسلامی مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو ہندوستان اور عالم عربی کے مابین تعلقات استوار کرنے اور تمام سیاسی، اقتصادی اور علمی میدانوں میں تعاون اور اشتراک کو مضبوط بنانے کے لئے سرکاری حلقوں کی طرف سے بھی اس پر توجہ دی گئی، اور اس کے لئے سرکاری اداروں اور یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب، اسلامیات اور مطالعات مشرق وسطیٰ کے شعبے قائم کیے گئے۔

اس رجحان کو ان کانفرنسوں اور علمی مذاکرات سے اور تقویت ملی جو ہندوستان میں منعقد ہوئے اور ان میں عالم عربی کے ممتاز علماء اور محققین شریک ہوئے یا وہ عالم عربی میں منعقد ہوئے اور ان میں ہندوستان کے علماء شریک ہوئے، عالم عربی اور ہندوستان کے درمیان محققین، اسکالرز اور ماہرین کا تبادلہ شروع ہوا، ایک دوسرے کے یہاں تعلیمی و فوڈ کی آمد و رفت ہوئی، ان تمام باتوں سے عربی زبان پر اور زیادہ توجہ مرکوز ہوئی اور بہترین مستقبل کے متلاشیوں میں اس سے شغف اور تعلق پیدا ہوا، عربک لینگویج کے سنٹر قائم ہوئے، عالم عربی اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کو مستحکم کرنے کے لئے حکومت نے بھی عربی زبان کے ادارے قائم کیے، وزارت دفاع نے دہلی اور پونہ میں لسانیات کے شعبے قائم کیے، حیدرآباد میں غیر ملکی زبانوں کا سنٹرل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا اور دیگر وزارتوں نے بھی اس طرح کے سنٹر قائم کیے، ان تمام اداروں نے عربی زبان کے فروغ میں بڑا حصہ لیا، اور عربی زبان کے اچھے جاننے والے تیار ہوئے، عربی زبان کی تعلیم کو آسان بنانے کے لئے اس موضوع پر کتابیں بھی تصنیف کی گئیں، عالم عربی میں ہندوستانی وزارت خارجہ میں کام کرنے والوں کے لیے عربی ترجمہ اور بول چال کے مختصر کورس تیار کیے گئے، اس طریقہ سے عربی زبان کو علمی اور مادی مقاصد کے لیے سیکھا جانے لگا، جس سے عربی زبان کو فروغ ملا، ادبی، علمی اور مادی مقاصد کے لئے جو ادارے قائم ہیں، وہاں جدید عربی زبان و ادب اور عالم عربی کے سیاسی اور ثقافتی رجحانات پر زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔

حضرات! مدارس عربیہ کے نصاب کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہو کر سامنے آئے گی کہ اخیر کی صدیوں میں ان کے نصاب درس کے عربی ادب کے نصاب میں ایک تو زبان کو عملی طور پر سکھانے کا کوئی نظم نہیں رکھا گیا، عربی ادب کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ قدیم عہد سے تعلق رکھتا ہے، مثلاً ”نظم الیمین“، ”مقامات حریری“ اور نظم میں تعلقات، دیوان مثنوی اور لامیۃ العرب والعجم وغیرہ کو عربی ادب کا اصل نمونہ سمجھا جاتا رہا، اور اب بھی زیادہ تر مدارس میں انہی کتابوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، کچھ مدارس میں اب بعض نئی کتابیں جیسے ”القراءۃ الواضحة“ وغیرہ نصاب میں شامل کی گئی ہیں، اور جو کتابیں عربی ادب کے نصاب میں شامل رکھی گئیں ان میں لغوی اور علمی افادیت کے پہلو کو ترجیح دی گئی، بلاغت، نحو و صرف اور لغت کو زیادہ اہمیت دی گئی، تاکہ قدیم علمی اور فلسفی کتابیں سمجھی جاسکیں، متغیر اسالیب بیان اور قوت تعبیر پیدا کرنے والی کتابوں کو نظر انداز کیا گیا، تاریخ، ادب اور تنقید کو بھی نصاب میں جگہ نہیں دی گئی، بلاغت اور نحو و صرف میں وہ کتابیں باقی رکھی گئیں، جو دو سو سال پہلے نصاب میں شامل کی گئی تھیں، جبکہ ان موضوعات میں نئی اور سہل اسلوب میں لکھی ہوئی کتابیں جدید عربی زبان و ادب اور عالم عربی میں عام ہو چکی ہیں، اس کی وجہ سے عالم عربی اور اس کے حالات سے ہمارے مدارس کے فارغین کا تعلق قائم نہ ہو سکا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اس ضرورت کو شروع سے محسوس کیا اور عربی زبان کی تعلیم زندہ اور عصری زبان کی حیثیت سے دینے کے لئے ایک نیا نصاب تیار کیا جس میں پہلے زبان سکھانے کا اہتمام کیا گیا، اس کے بعد عربی ادب کی کلیدی کتابوں کو جو مختلف عصور سے متعلق ہیں شامل کیا گیا، عربی بول چال کی مشق کا شروع سے اہتمام کیا گیا، اور عربی میں تعلیم کا بھی نظم کیا گیا، اس کے ساتھ عربی صحافت سے واقفیت اور صحافتی مشق کا بھی اہتمام کیا گیا، جدید ادب کی کتابیں اور جدید اہل قلم سے واقفیت کے لئے تاریخ ادب اور نقد کے موضوعات بھی نصاب میں

شامل کیے گئے۔

حضرات! عالم عربی میں نشاۃ ثانیہ کے بعد کا ادب، قدیم ادب سے کلی طور پر مختلف ہے، اس کا اسلوب اور اس کے موضوعات قدیم اسلوب اور موضوعات سے مختلف ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مصر و شام کے ادباء یورپ کی علمی برتری کے دور میں یورپ کے ادب سے متاثر ہوئے، چاہے معاملہ کے ذریعہ ہو، یا براہ راست یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے ذریعہ، مغربی ادبی مدارس سے ان سب نے استفادہ کیا اور نئے رجحانات، افکار اور تصورات کو اپنی ادبی نگارشات میں داخل کیا، شروع میں ترجمہ کے ذریعہ اور بعد میں اس نہج کو اختیار کر کے، اس میں قصہ اور مقالہ جو ادب عربی میں نئی قسم کہلاتے ہیں، مغربی فکر سے سب سے زیادہ متاثر ہو گئے، ڈاکٹر طہ حسین، عقاد، ہیکل، مازنی، تیمور، توفیق الحکیم اور نجیب محفوظ نے ادب عربی کو نیا رخ دیا، اس ادب نے عالم عربی کی ثقافت پر گہرا اثر ڈالا، اس وقت عالم عربی میں مغربی ثقافت کا جو غلبہ ہے اس کی تشکیل میں اس ادب کا بڑا حصہ ہے، ان ادباء نے ادب کو زندگی اور فکر سے جوڑنے کی کوشش کی، ادب سے چاہے وہ نظم ہو یا نثر، ناواقف ہیں اور اس کی وجہ سے وہ عالم عربی کے واقعات اور رجحانات کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، عالم عربی کو سمجھنے کے لئے جدید ادب کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قصہ جو پہلے صرف تفریح کا ذریعہ تھا اور اس میں صرف ایسے موضوعات اختیار کیے جاتے جن کا تعلق عیاری، مکر و فریب، مال کے حصول کی کوشش یا امراء کے تنعم کے واقعات سے ہوتا یا ساحروں اور شاطروں کے قصوں پر مشتمل ہوتے، اب زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہو گیا ہے، اور وہ حقیقت اور موجودہ زندگی کی تصویر کے ساتھ مستقبل کی طرف رہنمائی کا کام کرتا ہے، نجیب محفوظ جن کو نوبل پرائز دیا گیا ان کے قصوں پر یہ بات صادق آتی ہے، اسی طرح ڈاکٹر طہ حسین کی کتابیں خاص طور پر ”مستقبل الثقافة فی مصر“ کے



مطالعہ سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

عربی ادب کے اس رجحان اور اس کے مضر اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ”مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش“ (ص: ۱۴۷) میں عالم عربی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یورپ سے تعلیم پا کر آنے والے عرب فضلاء کی حالت یہ تھی کہ مغربی روح ان کے اندر پوری طرح سرایت کر چکی تھی، وہ اسی کے دماغ سے سوچتے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اسی کے پھیپھڑوں سے سانس لیتے تھے، وہ اپنے مستشرق اساتذہ کی صدائے بازگشت بن کر وہی خیالات و نظریات پورے یقین و وثوق اور پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ اپنے ملک میں پھیلانے کی کوشش کرتے، دنیا کے کسی گوشے میں اگر کوئی مستشرق کوئی نظریہ یا خیال پیش کرتا تو مصر میں نہ صرف اس کی حمایت کرنے والا بلکہ پورے خلوص اور پورے زور قلم اور انشا پردازی کے ساتھ اس کا شارح و داعی کوئی نہ کوئی ادیب اور مفکر اسی وقت مہیا ہو جاتا۔

مثلاً قرآن مجید کا انسانی تعبیر کا نتیجہ ہونا، دین و سیاست کی تفریق، اسلام کی نظام حکومت سے یکسر بے تعلقی اور اس کا محض اعتقادی، اخلاقی اور عبادتی نظام ہونا، سیکولرزم کی دعوت، عربی زبان و ادب کے اولین مآخذ (شعر جاہلی) کی صحت و ثبوت سے انکار، حدیث کی قیمت، حجیت اور سنت کی صحت کا انکار یا تشکیک، عورتوں کی آزادی اور مردوں کے ساتھ مساوات کلی اور بے پردگی کی تلقین و تحریک، فقہ اسلامی کو رومن لاسے مآخوذ اور اس کی اسپرٹ سے متاثر قرار دینا، قدیم تہذیبوں کے احیاء کا نعرہ، عہد فرعون کی تقدیس، اس کی تہذیب، ادب اور کارناموں پر فخر، مقامی عامی زبان میں تصنیف و تالیف اور لاطینی حروف کو اختیار کرنے کی دعوت، مغربی قانون کی بنیاد و اصول پر قانون سازی اور عربی قومیت اور مادی سوشلزم اور بعض وقت مارکسی کمیونزم کی دعوت، ان سب چیزوں میں مغربی فکر بلکہ مغربی طرز ادا اور تعبیر تک کے گھنے

سائے آپ کو اہل عرب کے دماغوں اور ان کی تحریروں پر اپنے بازو پھیلائے ہوئے نظر آئیں گے، گے اور اس پر اس طرح چھا گئے جس طرح بڑے درخت نوخیز پودوں کو اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں، مغربی فکر کا عکس ان پر اس طرح پڑتا نظر آتا ہے جس طرح کسی صاف شفاف آئینہ میں آفتاب کا عکس۔

”اس مغربی رجحان اور فکر کو مقبول بنانے کی کوشش میں مصر کے بعض چوٹی کے اہل قلم اور صاحب طرز انشاء پرداز شریک تھے، اور اس میدان میں متعدد ایسی شخصیتیں نمایاں ہوئیں جن کی زبان اور زور بیان کا سارا عرب لوہا مانے ہوئے تھا، لیکن دوسری طرف نہ صرف مصر بلکہ پورے مشرق عربی میں عملی، طبعی، میکانیکی اور ریاضیات کے میدان میں مجتہد قسم کے افراد مطلق پیدا نہ ہو سکے، جن کی ان علوم میں برتری اور بالادستی اور ان کی تحقیقات اور علمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اعتراف مغرب کو کرنا پڑتا اور دنیا کے بین الاقوامی حلقہ میں ان کو کوئی مقام حاصل ہوتا۔“

حضرات! عالم عربی کے حالات کو سمجھنے کے لئے اور وہاں دعوتی کام کرنے کے لئے ادب حدیث کا مطالعہ اشد ضروری ہے، عصر حدیث میں عربی زبان و ادب میں مسیحی عنصر غالب نظر آتا ہے اور یورپ میں رہنے والے عرب ادباء جنہیں مہجری ادباء کہا جاتا ہے، خاص طور پر لبنان کے مارونی ادباء نے عربی ادب میں اپنی گہری چھاپ ڈالی ہے، انہوں نے قدیم عہد کے ادب کے بارے میں اپنے مخصوص خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط تصورات قائم ہوئے ہیں، لغت، تاریخ، ادب، تنقید، قصہ، ناول اور ڈرامہ جو ذہن سازی کے اہم ذرائع ہیں، ان سب پر انہوں نے ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے، جس سے مسلمان ادباء بھی متاثر ہوتے ہیں، بعض موضوعات پر انہی کی کتابیں مرجع اور مصدر سمجھی جاتی ہیں، جرجی زیدان نے تاریخ اسلام پر اتنا مواد جمع کر دیا ہے جس پر کسی مسلم کاتب نے اضافہ نہیں کیا، اسی طرح اسلامی شخصیات پر قصہ کی شکل میں اس نے ایک بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، عربی صحافت پر

عیسائی اور عیسائی فکر سے متاثر ادباء کا شروع سے قبضہ رہا ہے، اکثر بڑے اخبارات یا مجلات عیسائیوں کے قبضہ میں ہیں۔

اگر ہمارے نصاب کا مقصد صرف قدیم درسی کتابوں کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے تو یہ نصاب کافی ہے، اور اگر عالم عرب میں دعوتی کام کرنا بھی مقصد ہے اور وہاں کے غلط رجحانات کا سامنا کرنا ہے اور عربوں سے روابط قائم کرنا ہے، یا نئے لٹریچر کو چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی سمجھنا ہے تو اس نصاب اور نظام میں تبدیلی ضروری ہے۔

اس وقت عالم عربی جن حالات سے گزر رہا ہے اس کو سمجھنے کے لئے اور اس میں موثر رہنمائی کا کردار ادا کرنے کے لئے جدید ادب کا مطالعہ اور جدید زبان و ادب کو سمجھنے اور اس میں اظہار خیال کرنے کی شدید ضرورت ہے، اس لیے عربی زبان و ادب کے نصاب میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔



## دینی مدارس میں عربی زبان ذریعہ تعلیم ضرورت و تدابیر

ڈاکٹر محمد مسیح اختر ☆

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں جہاں دیگر بہت سارے عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہیں ان کی زبان کی ترقی یا تنزلی کا بھی اہم رول ہوتا ہے۔ اس دنیا میں وہی قومیں عام طور پر ترقی و کامیابی کی اعلیٰ منزلوں کو چھوتی ہیں اور امامت و سیادت کے منصب پر فائز رہتی ہیں جو فتوحات ملکی کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کی حفاظت کرتی ہیں اور اپنی تہذیب و تمدن کی روایت کو سینے سے لگائے رکھتی ہیں۔ زبان کی بدولت ہی انسان اپنے افکار و خیالات کو دوسروں تک منتقل کر سکتا ہے اور دوسروں کے تجربات و احساسات سے مستفید ہو سکتا ہے۔ زبان ہمیشہ سے ماضی اور حال کے درمیان رشتے کو مضبوط کرنے کا اہم ذریعہ رہی ہے۔ اسی زبان کی بدولت آج ہم اپنے اسلاف کے گراں قدر علمی و مذہبی کارناموں سے واقف ہو سکے ہیں۔ دوسری تلخ تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ عام طور پر قوموں کے انحطاط کے ساتھ ہی ان کی زبانوں کا وجود اور ان کی تہذیب و تمدن کے باقیات بھی رفتہ رفتہ ناپید ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں دنیا کی ترقی یافتہ شمار کی جانے والی قوموں کا آج کوئی نام لیوا بھی باقی نہیں رہ گیا۔ عربی زبان کے علاوہ قدیم سامی زبان سے نکلنے والی بابلی، آشوری، عبرانی، آرامی، کنعانی، سریانی اور یونانی وغیرہ متعدد زبانیں اس دنیا سے ختم ہو چکی ہیں، یہاں تک کہ یورپ تک یونانی علوم و فنون کا ذخیرہ بھی عربی تراجم کی شکل میں پہنچا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علم دوست عباسی

☆ ایسوی ایٹ پروفیسر شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ



خلفاء نے اپنے دور حکومت میں دنیا کی بیشتر زبانوں بالخصوص یونانی، سنسکرت اور فارسی زبانوں میں موجود علمی ذخائر کو بڑے پیمانے پر عربی زبان میں منتقل کرنے کا اہتمام کیا تھا۔

بہر کیف آج عربی زبان ہی دنیا کی واحد قدیم ترین علمی، تہذیبی اور ادبی زبان ہے جو اپنے آغاز سے لے کر آج تک نشیب و فراز اور ترقی و ادبار کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بھی اپنی اصل حالت پر پوری تروتازگی اور تزک و احتشام کے ساتھ باقی ہے؛ کیونکہ عربی زبان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس زبان کا رشتہ قرآن کریم اور دین اسلام کے ساتھ جوڑ کر گردش زمانہ کے ہاتھوں نہ صرف اسے خرد برد ہونے سے بچالیا بلکہ قیامت تک کے لئے اس زبان کے حق میں بقاء دوام کا پروانہ لکھ دیا۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی اپنے دور اقتدار میں عربی زبان کو ایک زندہ علمی و تحقیقی زبان کی حیثیت عطا کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج عربی زبان نہ صرف یہ کہ ایک مذہبی زبان ہے بلکہ صدیوں پرانی ہماری تہذیب و تمدن کا آئینہ دار اور ہمارے پیش بہا علمی، سائنسی اور تحقیقی کارناموں کی امین بھی ہے۔ عربی زبان کو کم و بیش آٹھ صدیوں تک پوری دنیا کی واحد علمی، تحقیقی و سائنسی زبان ہونے کا شرف حاصل ہے، مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں اس زبان کا دائرہ وسیع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، مختلف زبانوں کے الفاظ و مصطلحات کو وقت و حالات کی ضرورت کے پیش نظر اس میں داخل کیا۔ یہ درست ہے کہ عثمانی دور کے بعد عیولی کے حملے تک عربی زبان نے عرب ممالک میں بھی گمنامی کی زندگی بسر کی لیکن بہت جلد ہی عربوں کو اپنی محرومی، غلامی اور ناکامی کا احساس ہوا اور انہوں نے سامراجی قوتوں سے گلو خلاصی کے بعد سب سے پہلے عربی زبان کو زندہ کرنے اور اس کے علمی و ادبی وقار کو بحال کرنے کی طرف بنیادی توجہ دی، اور مختلف عرب ممالک میں جدید سائنسی و اجتماعی علوم کے مختلف میدانوں میں ہونے والی تحقیق و ایجادات کو سامنے رکھتے ہوئے لغوی اکیڈمیاں قائم کی گئیں جنہوں نے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی وغیرہ

زبانوں کے ضروری الفاظ و مصطلحات کو عربی بان میں منتقل کیا۔ چنانچہ آج عربی زبان کو ایک بار پھر دنیا کی ترقی یافتہ علمی تہذیبی، ادبی و تحقیقی اور ساتھ ہی سیاسی، و تجارتی زبان کا مقام و مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ اور آج بائیس عرب ممالک کی سرکاری زبان عربی ہے۔ دوسری بات یہ کہ عربی زبان کا رشتہ دین اسلام اور قرآن کریم سے جڑنے کی بدولت پوری دنیا کے مسلمانوں نے اس کو سیکھنے اور اس کی حفاظت کرنے کی کوشش کی۔ مسلمان دنیا کے جس خطے میں بھی گئے انہوں نے دینی و ثقافتی ضرورتوں کے تحت اس زبان کو پڑھنے پڑھانے کا اہتمام کیا یہاں تک کہ سوویت یونین میں تقریباً ایک صدی تک ہر طرح کی مذہبی سرگرمیوں پر سخت پابندی کے باوجود مسلمانوں نے اپنے گھروں کے تہ خانوں میں چھپ کر قرآن کو پڑھنے اور دینی تعلیمات سے واقفیت کے لئے عربی زبان کو سیکھنے کا اہتمام کیا۔ اسی طرح ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے ہندوستان میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی یہاں عربی زبان کی تعلیم و تدریس اور اس زبان میں تصنیف و تالیف کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ہنوز جاری ہے گو کہ عربی زبان کو ہندوستان میں کبھی بھی بادشاہوں یا حکومتوں کی سرپرستی حاصل نہیں رہی۔

عربی زبان و ادب کی حفاظت اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت کے میدان میں ہندوستان کے مدارس عربیہ کا اہم رول رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں مدارس عربیہ کو ہر دور میں اسلام کے قلعہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آج ہندوستان میں مسلمانوں کے ملی و تہذیبی تشخص کا متبادل ہمارے علماء کرام کی بے لوث قربانیوں اور ان کی انتھک کوششوں کا ثمرہ ہے جو کسی دنیوی مفاد یا جاہ و منصب کے حصول سے بے نیاز خالصتاً رضائے الہی کی خاطر ان مدارس میں عربی زبان و ادب اور کتاب و سنت کی تعلیم دیتے آرہے ہیں۔ دور جدید میں فارسی زبان و ادب کے مایہ ناز محقق ممتاز مصنف مرحوم پروفیسر نذیر احمد مدارس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یہ دینی ادارے غیر منظم صورت میں بھی مہتمم بالشان خدمت انجام دے رہے ہیں، انہیں کی وجہ سے آج ملک کے عرض و طول میں دین کا چراغ روشن ہے، یہ ہی دین کے سب سے بڑے محافظ و پاسبان ہیں۔ عربی زبان و ادب سے متعلق سارا عملہ بھی ان میں دینی مدارس کا تربیت یافتہ ہے، یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں عربی زبان کے اساتذہ، سفارت خانوں کے عربی مترجمین، ریڈیو اور نشر و اشاعت کے دوسرے اداروں کے اراکین کی تربیت میں بھی انہیں مدارس کا ہاتھ ہے“ (مجلہ علوم اسلامیہ، ج: ۱۲، ص: ۱۰۲، شعبہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۸۸)۔

ہمارے دینی مدارس میں عربی زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ صدیوں سے جاری تو ضرور ہے لیکن اس کی طرف ایک زندہ، متحرک، علمی و عملی زبان کے بجائے ایک کلاسیکی اور ذیلی زبان کی حیثیت سے توجہ دی گئی، اس زبان کو کبھی باقاعدہ مقصد کے طور پر نہیں بلکہ ہمیشہ کتاب و سنت کو سمجھنے اور اسلامی علوم و فنون میں درک حاصل کرنے کی خاطر ایک واسطہ یا ذریعہ کے طور پر پڑھایا گیا، اس زبان کی بندہ ہی تقدیس کو تو باقی رکھا گیا مگر اس کی دنیوی اہمیت اور اس کی سیاسی و اقتصادی افادیت کو نظر انداز کیا گیا۔ عربی زبان میں معاشی ضرورتوں کے پیش نظر مہارت پیدا کرنے کو ہمیشہ معیوب سمجھا گیا۔ تمام ہی مکاتب فکر کے مدارس میں عربی زبان کو نصاب کے لازمی جزء کا درجہ تو دیا گیا لیکن عربی زبان کی تدریس کے نام پر نحو و صرف اور بلاغت کی بعض کتابوں اور قدیم عرب شعراء و نثر نگاروں کے بعض منتخبات کی تدریس کو کافی تصور کیا گیا۔ مدارس عربیہ نے سارا زور تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، منطق و فلسفہ جیسے علوم کی تحقیق و تالیف میں صرف کیا، جس کے نتیجے میں آج ان موضوعات پر ہندوستانی علماء کی ایسی گراں قدر تالیفات موجود ہیں جن کی علمی قدر و منزلت کا اعتراف عرب علماء و محققین نے بھی کیا ہے۔ اور ہندوستانی علماء کی عربی زبان میں علمی کاوشیں آج بھی ہمارے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔ عربی تفاسیر میں علامہ نظام الدین کی ”غرائب القرآن“، ”رغائب الفرقان“، علامہ علاء الدین گجراتی کی تفسیر

بصیر الرحمن فی تفسیر القرآن، علامہ فیضی کی تفسیر ”سواطع الالہام“، مولانا شبیر عثمانی کی ”الروح فی القرآن“، علامہ تاج الدین کی ”جواهر القرآن“ وغیرہ اہم ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ہندوستانی علماء کی عربی تفاسیر، پروفیسر محمد سالم قدوائی، شعبہ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء)۔

اسی طرح علوم القرآن پر مولوی عبدالکریم کی ”سبل الرسوخ فی علم الناسخ والمنسوخ“، شیخ محمد شافعی کی ”نثر المرجان فی رسم نظم القرآن“، محمد علی کی ”الرسالة الواضحة فی تخریج الآیات“، علامہ حمید الدین فراہی کی ”مفردات القرآن“، الامعان فی اقسام القرآن“ اور ”نظم القرآن“، علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی ”مشکلات قرآن“، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ”الإفادات العزیزہ“ اور سید سلیمان ندوی کی ”أرض القرآن“ وغیرہ مشہور ہیں (ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات، ص: ۸-۹، مرتب: عماد الحسن آزاد اردو، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء)۔

اسی طرح عربی زبان میں ہندوستانی محدثین کی تالیفات بھی اہم ہیں جن میں علامہ رضی الدین حسن بن محمد صفانی کی ”مشارق الانوار النبویہ فی صحاح الاخبار المصطفویہ“، عبدالاول جوہوری کی ”فیض الباری فی شرح صحیح البخاری“، علاء الدین بن حسام الدین متقی الہندی کی ”کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال“، علامہ طاہر پٹنی کی ”مجمع البحرین“۔ فقہ میں علامہ سراج الدین کی ”زبدۃ الحکام فی اختلاف ائمة الاسلام“ اور ”الغرة المنیفة فی ترجیح مذهب ابی حنیفة“، مفتی ابوالفتح رکن الدین بن حسام کی ”الفتاویٰ الحادیۃ“ وغیرہ مشہور ہیں (اللغة العربیة فی الہند عبر العصور ص: ۸-۱۰، خورشید اشرف اقبال ندوی، البیہیہ المصریة العلمیة، قاہرہ، ۲۰۰۸ء)۔

علم منطق میں ملاحت اللہ بہاری کی ”سلم العلوم“، مولانا فضل امام خیر آبادی کی



”المرقاۃ“، ملا محمد جوہر پوری کی ”شمس بازغہ“ وغیرہ اہم ہیں، عربی لغت کے میدان میں ہندو علماء کا لوہا تو عرب محققین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ علامہ حسن بن محمد صفانی کی کتاب ”الغزاة“ کو آج بھی عربی لغت کے میدان میں ایک اہم ماخذ و مصدر کی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ سیوطی نے تو ان کو عربی لغت کا امام اور امام ذہبی نے ان کی کتاب کو علم لغت کا مرجع و منہج قرار دیا ہے، علامہ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی کی تاج العروس فی شرح القاموس دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جو علامہ مجد الدین فیروز آبادی کی عربی قاموس ”القاموس المحیط“ کی شرح، اضافہ اور تصحیح (ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، ص: ۳۰-۳۵، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلامیہ، لکھنؤ، ۱۹۹۲ء)۔

اسی طرح دور جدید میں عربی زبان و ادب اور تحقیق نصوص کے ماہر علامہ پروفیسر العزیز میمنی کی عربی زبان و تحقیق کے میدان میں گرانقدر خدمات سے بھلا کون ناواقف ہوگا۔ کی لغوی و تحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف ڈاکٹر احمد امین، علامہ محبت الدین خطیب، ڈاکٹر ناصر الدین اسد، ڈاکٹر شا کر فحام، ڈاکٹر محمود شا کر جیسے دور جدید کے نامور عرب ادباء و محققین نے کیا۔ انہوں نے ”مجلة المجمع العلمی“ دمشق میں متعدد مقالات کے ذریعہ لسان العرب عربی زبان کی مستند لغت میں موجود سیکڑوں غلطیوں کی طرف نشاندہی کی، چنانچہ لسان العرب نظر ثانی کے لئے مصر میں جو کمیٹی تشکیل دی گئی اس میں عرب محققین کے ساتھ ان کا نام سرفہرست تھا۔ اسلامی علوم و فنون کے علاوہ خالص عربی ادبیات یعنی شاعری و نثر نگاری، میدان میں ہندوستانی ادباء و شعراء کی کاوشوں پر نظر ڈالیں تو اس میدان میں ان کی کاوشیں عربی زبان و ادب کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی نظر نہیں آتیں، ان کے نثری و شعری مجموعوں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان پر مذہب اور تقلید کا رنگ غالب ہے، زیادہ تر عربی اشعار و رسائل میں عقیدت یا اخلاقی و دینی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ عربی ادبیات کے میدان میں غلام

ابوبکر امی، مولانا فضل حق خیر آبادی، شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، علامہ  
والدین فراہی، مولانا انور شاہ کشمیری اور علی عباس چریا کوٹی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں  
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات، ص: ۱۲۰۔

عربی شعر و شاعری کے ہندوستان میں نشوونما نہ پانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ  
عربی زبان کو ہندوستان کے مسلم امراء و سلاطین کی کبھی سرپرستی حاصل نہیں رہی اور نہ ہی اسے کبھی  
ہندوستان کی سرکاری زبان کا درجہ ہی ملا۔ عربی نثر نگاری کے میدان میں بھی ہمارے قدماء کی  
نثر کتابوں کا تعلق تاریخ، تذکرہ یا اسلامی علوم سے ہے جن کے اسلوب پر علمی و تحقیقی پہلو غالب  
ہے۔ دور جدید میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے پہلی بار اسلامی موضوعات پر عربی زبان  
ن اپنی کاوشوں کو خالص ادبی اسلوب میں پیش کیا اور دنیاۓ عرب میں عربی زبان و ادب کے  
ایک صاحب طرز ادیب، صحافی اور انشا پرداز کی حیثیت سے اپنی جگہ بنائی۔ چنانچہ ”ماذا خسرو  
لعالم بانحطاط المسلمین“، ”الصراع بین الفکر الاسلامیہ والغربیہ“ اور  
”رجال الفکر والدعوة فی الاسلام“ جیسی معرکہ الآراء تصانیف کے ذریعہ عرب ادباء و انشا  
پردازوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے دینی مدارس میں عربی زبان و ادب کی تعلیم و تدریس  
کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور اساتذہ بڑی محنت و لگن کے ساتھ عربی نحو و صرف اور عربی نثر  
و اشعار کی تعلیم طلبہ کو دیتے آرہے ہیں، چنانچہ ان مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ کی اکثریت کی  
عربی گرامر عام طور پر مضبوط ہوتی ہے اور وہ اسلامی علوم و فنون پر موجود عربی کتابوں کو آسانی سے  
سمجھ لیتے ہیں؛ لیکن عربی زبان کو صحیح لب و لہجہ میں بولنا، اپنے افکار و خیالات کو ضبط تحریر میں لانا  
ان کے لئے مشکل ہوتا ہے؛ کیونکہ عربی نحو و صرف میں مہارت حاصل کر لینا ایک الگ چیز ہے  
لیکن عربی زبان میں تحریر و تقریر کی صلاحیت پیدا کرنا الگ بات ہے جس کے لئے مدارس میں عربی

زبان کے رائج نصاب اور نظام تعلیم دونوں ہی میدان میں بنیادی تبدیلیاں درکار ہیں۔ آج علماء و دانشوروں کا اس امر پر تقریباً اتفاق ہے کہ عربی زبان کو محض ایک مذہبی زبان کی حیثیت سے دیکھتے ہوئے اسے ایک ترقی یافتہ، زندہ علمی، ادبی، سیاسی، معاشی اور عالمی زبان کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے، دینی مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کے اندر عربی زبان میں تقریر، تعبیر اور تحریر کی مطلوبہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے ضمن میں مدارس کے اندر اردو یا مقامی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کے بجائے عربی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اس کی ضرورت اور افادیت سے تو کسی کو انکار نہیں لیکن اسے عملی طور پر نافذ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

گزشتہ چند دہائیوں سے عربی و دینی مدارس میں رائج قدیم نصاب تعلیم میں وقت کی ضرورت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ضروری اصلاح و تبدیلی کے موضوع پر متعدد ورکشاپ یا سمینار اور کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں جہاں ملت کے قائدین، تعلیم کے ماہرین اور علماء کرام کے باہمی مشوروں سے نصاب میں تبدیلی کے مسئلے پر بہت حد تک اتفاق رائے کی صورت بھی پیدا ہو چکی ہے اور بعض خا کے بھی ترتیب دیئے جا چکے ہیں لیکن ان خاکوں میں پوری طرح رنگ بھرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ اس طرح کی کوششوں کا اتنا نتیجہ تو ضرور نکلا ہے کہ بعض مدارس نے انگریزی، عمرانیات اور سماجیات سے متعلق کچھ مضامین کو اپنے نصاب میں داخل کر لیا ہے۔ یہاں تک کہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ بھی جدید علوم کے مخالف نہیں تھے، خود ان کے دور میں دارالعلوم میں بعض سائنسی مضامین کی تدریس کا تجربہ بھی کیا گیا تھا۔ علامہ نانوتویؒ نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ ان کو کسی علمی مجلس میں اسلام کی موثر ترجمانی کے لئے انگریزی زبان سے براہ راست واقفیت حاصل کرنے کا احساس پیدا ہوا، چنانچہ انہوں نے سفر حج سے واپسی کے بعد یورپ جا کر انگریزی زبان سیکھنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن زندگی نے ساتھ نہیں دیا اور ان کا یہ



خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا۔ مولانا مناظر حسن گیلانی اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اگر یہ صورت ممکن ہو جاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ج: ۲، ص: ۴، ندوۃ المصنفین، دہلی)۔

بعض مدارس کے ذمہ داروں کو عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر نافذ کرنے کا احساس تو ہوا ہے مگر یہ کافی نہیں ہے؛ کیونکہ آج بھی بیشتر عربی مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کا بنیادی مقصد اسلامی علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنا ہے تاکہ طلبہ فراغت کے بعد تفسیر، حدیث، فقہ یا دعوت دین کے میدان میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں، عربی زبان کی تعلیم سے ان کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ صاحب طرز ادیب، صحافی، انشا پرداز یا مترجم بن جائیں، یہی وجہ ہے کہ عالمیت و فضیلت کے درجات میں عام طور پر نحو و صرف کو چھوڑ کر تفسیر، حدیث، فقہ اور منطق وغیرہ کی کتابیں زیادہ ہوتی ہیں۔ میری ناقص معلومات کی حد تک ندوۃ العلماء کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ایسا مدرسہ ہے جہاں عربی زبان کو ایک زندہ، متحرک اور روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی زبان کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کی اکثریت میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو کسی موضوع پر عربی زبان میں دس منٹ تقریر کر سکے یا ایک صفحہ میں اپنے خیالات کو قلمبند کر سکے۔ اور یہ صورتحال صرف مدارس ہی کی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں اور کالجوں سے عربی زبان میں ایم اے اور بسا اوقات ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے طلبہ کے اندر بھی عربی زبان میں تحریر و تقریر کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے؛ کیونکہ عام طور پر ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں عربی زبان کی تدریس وہاں کے مقامی زبانوں میں ہوتی ہے، وہاں عربی زبان ذریعہ تعلیم نہیں ہے اور نہ ہی عربی زبان میں تقریر و تحریر کی باقاعدہ مشق کا کوئی نظم ہے۔ آج مدارس اور جامعات میں عربی ادب کے نام پر عام طور سے نحو و صرف کی بعض قدیم کتابوں، معلقات، حماسہ، مقامات اور نثر الیمن وغیرہ کے منتخب



اشعار و ابواب کی تدریس کو کافی سمجھا جاتا ہے جب کہ ان کتابوں کی تدریس سے عربی زبان و انشاء کو سیکھنے میں کوئی خاص مدد نہیں ملتی اور نہ طلبہ کو عربی زبان کے جدید الفاظ و مصطلحات سے واقفیت ہوتی ہے اور وہ اپنی محنت اور ذہانت کے باوجود عملی میدان میں ترقی و کامیابی حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مدارس کے ذمہ داران دور جدید کے عملی تقاضوں اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے یا تو بے خبر ہیں یا اگر باخبر ہیں تو پھر اپنے اندر عملی اقدام کی سکت محسوس نہیں کرتے۔ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد اسی صورتحال کو محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قرآن تو ہر مسلمان کو کائنات پر غور کرنے، متحرک رہنے، آگے بڑھنے اور اپنے حالات کو بہتر بنانے کی دعوت دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ جو قوم خود اپنی حالت کو بدلنے کے لئے مضطرب نہ ہو یا ہاتھ پیر نہ مارے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔“ یہ ہماری بدبختی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم نے تقلید کی ریت کو فرمودات باری تعالیٰ پر ترجیح دی، فضا کچھ ایسی بنی ہوئی ہے کہ ہمیں اپنی محرومیوں کا احساس ہی نہیں ہوتا، جو لوگ زندگی کی کال کوٹھری میں ایک عمر گزار دیتے ہیں روشنی ان کی آنکھوں کو ناگوار ہوتی ہے۔ یہ بات بار بار دہرائے جانے کے قابل ہے کہ ہندوستان میں خصوصاً آزادی کے بعد دینی مدارس نے دین کے تحفظ کے لئے بڑا کام کیا ہے لیکن اگر نصاب میں اصلاح راہ پا جاتی تو وہ اس سے بھی بڑا کام کر سکتے تھے“ (ملک و ملت کی تعمیر دینی مدارس، ص: ۱۲۲)۔

مولانا محمد سالم قاسمی دینی مدارس میں عربی زبان و ادب کی زبانوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اس درس نظامی میں عربی زبان کی وہ لسانی حیثیت جو اظہار مافی الضمیر کا اولین اور ضروری وسیلہ ہوتی ہے وہ بالغ الفکر اہل علم و فکر کے استثنا کے ساتھ بیشتر معاہد و مدارس میں اس درجہ معرض خمول میں پڑ گئی ہے کہ اہل نظر اس کی ضرورت و اہمیت کو بدلائل و جواہر ثابت کر کے پیش بھی کرتے ہیں تو اسے ماننے یا قابل قبول قرار دیئے جانے کے بجائے دور از کار، بے ضرورت

اور غیر مفید بلکہ مضر ہونے کی تاویلات کی صورت میں اس کا جواب ملتا ہے“ (عربی و اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے، ج: ۲، ص: ۱۰۴، خدا بخش اور نیشنل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵)۔

ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی ابتر صورتحال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بیسویں صدی عیسوی کے عظیم مفکر، مورخ، ادیب اور محقق علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں:

”آج عربی کی تعلیم صرف ان لوگوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے جو افلاس کی وجہ سے اور کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، عربی کی تعلیم ایسی بے کار شے سمجھ لی گئی ہے کہ بغیر کسی ترغیب کے کوئی شخص اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، امراء کا گروہ عربی و مذہبی تعلیم سے یکسر محروم رہ جاتا ہے“ (عربی و اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم، ج: ۳، ص: ۷۰)۔

بہر حال دینی مدارس میں عربی کو ذریعہ تعلیم بنانے سے قبل ہمیں اپنے قدیم طرز فکر کو تبدیل کرنا ہوگا اور دنیا میں رائج طرز تعلیم و تربیت کو اختیار کرنا ہوگا۔ آج وہی قومیں ترقی و خوشحالی کے راستے پر گامزن ہیں جنہوں نے حالات کے رخ کو پہچانتے ہوئے اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے کے لئے تیار کیا۔ اسلام تعلیم و تربیت کے میدان میں ہونے والی مفید ترقیات و ایجادات کو اپنانے کی راہ میں قطعی حائل نہیں ہے، مگر افسوس کہ آج بھی بعض ایسے افراد ہیں جو مدارس میں عربی زبان کو جدید تقاضوں کے مطابق ایک زندہ، متحرک اور عالمی زبان کی حیثیت سے پڑھائے جانے کے حق میں نہیں ہیں، اور ان کو اندیشہ ہے کہ اس صورت میں دینی مدارس کے قیام کا مقصد فوت ہو جائے گا اور طلبہ دعوت دین اور اصلاح معاشرہ کا فریضہ انجام دینے کے بجائے دنیوی اغراض کے حصول میں کھو جائیں گے جب کہ دنیا میں ایک باوقار مسلم کی حیثیت سے زندگی گزارنا بھی اسلام کے مقاصد میں شامل ہے۔ ایک صاحب علم دانشور کا ماننا ہے:

”اس سے زیادہ قابل افسوس ان لوگوں کا انداز فکر ہے جنہوں نے نصاب تعلیم کا صرف یہی مقصد قرار دے رکھا ہے کہ کچھ عربی لکھنا اور بولنا سکھا کر اور کچھ عربی زبان و ادب میں

مہارت پیدا کر کے ان طالبان علوم نبوت کو عربی ممالک میں قابل ملازمت یا دیگر یونیورسٹیوں میں قابل داخلہ بنا دیا جائے، یا عربی مدارس کی سند کو دنیا کی دیگر یونیورسٹیاں تسلیم کر لیں، لیکن نتیجہ عربی ریڈیو اسٹیشنوں اور سفارشات خانوں میں ملازمت کے سوا اور کیا رہا؟ (ملک و ملت کی تعمیر اور دینی مدارس، ص: ۱۸۳، مولانا ابوالحسن اعظمی)۔

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اب ایسی محدود سوچ رکھنے والے افراد بہت کم رہ گئے ہیں اور مدارس کے ذمہ داروں کے نقطہ نظر میں بنیادی تبدیلی آئی ہے، آج ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں مدارس کا جامعہ ملیہ اسلامیہ، ہمدرد یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، لکھنؤ یونیورسٹی جیسے سرکاری اداروں سے الحاق ہو چکا ہے، اور ان مدارس نے الحاق کی شرائط کے مطابق اپنے نصاب تعلیم کو تو کسی حد تک تبدیل کر لیا ہے مگر نظام تعلیم کے میدان میں تبدیلی لانا ابھی باقی ہے۔ عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کرنے میں شاید ندوۃ العلماء کے علاوہ کسی اور مدرسے نے کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے۔ ندوۃ العلماء نے آغاز سے ہی اپنے طلبہ کے اندر عربی زبان میں تحریری و تقریری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۱ء میں جب وہ ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں مصر سے شائع ہونے والے بعض عربی اخبارات و رسائل کا مطالعہ کیا۔ اور پھر انہوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کے دور ہی میں عربی زبان میں اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ وہ کسی بھی موضوع پر برجستہ عربی زبان میں تقریر کرنے پر قادر تھے، اور پھر جب ۱۹۲۵ء میں علامہ سید سلیمان ندوی وہاں کے معتمد تعلیم بنے تو انہوں نے عربی ادب و انشاء کی تعلیم و تدریس کے لئے بعض عرب اساتذہ کی خدمات بھی حاصل کیں، اور انہوں نے اپنے دور میں ہندوستان سے پہلا عربی اخبار ”الضیاء“ نکالنے کا اہتمام کیا (تذکرہ سلیمان: غلام محمد، ص: ۴۴)۔

چنانچہ ندوۃ العلماء سے گزشتہ ساٹھ سالوں سے ایک علمی، ادبی اور تحقیقی میگزین مجلہ

”البعث الاسلامی“ اور پندرہ روزہ اخبار ”المرائد“ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ ندوۃ العلماء کی اس تحریک سے دیگر عربی مدارس اور خاص طور پر جامعہ سلفیہ بنارس سے ”صورة الامة“ اور دیوبند سے ”الداعی“ شائع ہو رہا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنے دور نظامت میں ندوہ کے اندر عربی ادب و انشا پردازی کو ایک نئی بلندی تک پہنچا دیا۔ مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

”ندوۃ العلماء نے عربی زبان و ادب کی تعلیم کی طرف بھی ایک زندہ اور جدید زبان کی حیثیت سے توجہ منعطف کی؛ کیونکہ عربی زبان میں قرآن و سنت کے فہم کی کلید اور اس کے راز ہائے سر بستہ کی امین ہے۔ دارالعلوم نے کبھی عربی زبان کو کبھی ایک قدیم اور مردہ زبان (جس کے بولنے اور لکھنے والے اس دنیا میں ناپید ہوں) نہیں سمجھا جب کہ ہندوستان نے اس زبان کے ساتھ یہی سلوک کر رکھا تھا“ (ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، ص: ۱۳)۔

چنانچہ عربی زبان و ادب سے متعلق اپنے اس انقلابی نقطہ نظر کی بدولت آج ندوۃ العلماء کو نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند بھی عربی ادبیات اور عربی خطابت، صحافت اور انشا پردازی کے میدان میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور آج عربی زبان میں اپنی اسی مہارت کی بدولت وہاں کے فارغین مختلف ملکی و بین الاقوامی اداروں میں عربی زبان کے اساتذہ کی حیثیت سے علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

بہر حال گزشتہ چند دہائیوں میں امت مسلمہ کی سوچ میں تبدیلی تو ضرور آئی ہے اور مدارس کے نصاب و نظام تعلیم میں وقت کی ضرورت کے مطابق ضروری اصلاح کے لئے ذہن سازی کی حد تک کام بھی ہوا ہے تاہم دینی مدارس میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر نافذ کرنے کی مہم آسان نہیں ہے بلکہ ایک صبر آزمائش ہے۔ اس کی ضرورت، افادیت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ مدارس کے اندر عربی میڈیم کو کس طرح نافذ کیا جائے جب کہ یہاں زیر تعلیم طلبہ کی اکثریت اردو زبان بھی بہتر انداز سے بولنے اور لکھنے پر قادر نہیں ہے، مدارس



میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی صورت میں اساتذہ، نصاب اور نظام تعلیم کی جہت سے مختلف قسم کی مسائل پیش آسکتے ہیں جن کو بعض عملی تدابیر کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے۔

### اساتذہ کی ٹریننگ (اکیڈمک اسٹاف کالج کا قیام):

مدارس میں عربی زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دینے والے اساتذہ کی اکثریت تدریس کے جدید طریقوں سے یا تو پوری واقفیت نہیں رکھتے یا اگر واقف ہیں تو جدید تکنیک کو نافذ کرنے کے لئے مدارس میں ضروری وسائل کا فقدان ہے۔ دوسری بات یہ کہ مدارس میں تدریسی خدمات انجام دینے والے اساتذہ کی اکثریت انہیں مدارس اسلامیہ سے فارغ التحصیل ہے جہاں عربی زبان کو ایک کلاسیکل لنگویج کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے، اور عربی زبان کی تعلیم کا اس سے زیادہ اور کوئی مقصد نہیں ہوتا کہ طلبہ کے اندر کتاب و سنت اور اسلامی شریعت کے بنیادی مصادر کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اس صورتحال کے لئے مدارس کے اساتذہ سے زیادہ ارباب مدارس ذمہ دار ہیں کہ انہوں نے انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی غیر زبانوں کی تدریس کے میدان میں ہونے والی جدید ترقیات سے اپنے اساتذہ کو بخوبی واقفیت بہم پہنچانے کا کوئی باقاعدہ سسٹم تیار نہیں کیا۔ آج کسی دینی مدرسے میں عربی اساتذہ کی باقاعدہ ٹریننگ کا کوئی نظم نہیں ہے۔ بعض عربی مدارس میں رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے مدینہ یونیورسٹی سے فارغ بعض ہندوستانی اساتذہ کو مبعوث کر دیا جاتا ہے لیکن ان اساتذہ سے بھی عربی میڈیم میں تدریس کا مسئلہ حل نہیں ہوگا؛ کیونکہ مدینہ یونیورسٹی کی عالم عرب میں کم و بیش وہی حیثیت ہے جو ہمارے یہاں دینی مدارس کی ہے جس کا بنیادی مقصد دعا و مبلغین تیار کر کے دنیا کے مختلف حصوں میں ان کو دعوتی کاموں کے لئے مبعوث کرنا ہے۔ پھر ہمارے مدارس سے فارغ طلبہ کو یہاں زیادہ تر کلیۃ الدعوة، کلیۃ الشریعہ، کلیۃ الحدیث وغیرہ ہی میں داخلہ ملتا ہے، لہذا وہ یہاں بھی عربی زبان کی تدریس کے جدید طریقوں سے واقف نہیں ہو پاتے۔ آج کے دور میں

عربی عبارت کو پڑھ لینا اور سمجھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ طلبہ کے اندر عربی زبان کو صحیح مخارج کے ساتھ بولنے کی صلاحیت بھی ناگزیر ہے اور اس کے لئے اساتذہ کا عربی زبان میں ماہر ہونا اور تدریس کے جدید طریقوں سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ اور عربی اساتذہ کی مطلوبہ ٹریننگ اسی صورت میں مکمل ہو سکتی ہے جب ہم یو جی سی کے طرز پر اساتذہ کی تربیت کے لئے ریاستی یا کم از کم ملکی سطح پر کوئی ایک اکیڈمک اسٹاف کالج کے طرز پر اپنا کوئی ٹریننگ کالج قائم کریں جہاں ہر طرح کی جدید سہولیات میسر ہوں۔

آج سے تقریباً تیس سال قبل ملک کے ماہرین تعلیم نے جدید سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جانے والے نئے اساتذہ کو تعلیم و تدریس کے میدان میں ہونے والی جدید ترقیات اور علم کے مختلف میدانوں میں ہونے والی ایجادات سے واقف کمرانے کے لئے ملک کے عرض و طول میں مختلف یونیورسٹیوں کے اندر بیسیوں اکیڈمک اسٹاف کالج قائم کر دیئے جہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بحال ہونے والے اساتذہ کے لئے تین سے چار ہفتوں پر مشتمل مختلف قسم کے تربیتی (Orientation) اور ریفریشر کورسز چلائے جاتے ہیں۔ اسی طرز کا کوئی ادارہ مدارس کے عربی اساتذہ کی ٹریننگ کے لئے بھی ضروری ہے، اس کے بغیر ہم مدارس میں عربی میڈیم نافذ کر کے متوقع نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ درست ہے کہ اس طرح کے کسی ٹریننگ کالج کا قیام مدارس کے ذمہ داروں کے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے؛ لیکن اگر صحیح پلاننگ اور منصوبہ بند طریقے سے کام کیا جائے تو یہ کام ناممکن بھی نہیں ہے۔ پہلا مرحلہ تو اس طرح کے کسی بڑے تربیتی ادارے کو قائم کرنے کی ضرورت پر اتفاق رائے ہونا ضروری ہے۔

یو جی سی کے تحت چلائے جانے والے بعض اکیڈمک اسٹاف کالجز میں عربی اساتذہ کے لئے بھی ریفریشر کورسز ہوتے ہیں جہاں عربی زبان کے ماہر اساتذہ کو عربی ادبیات کی موثر تدریس کے جدید طریقوں پر توسیعی لیکچر کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف دینی مدارس کے عربی اساتذہ کو ہی تربیت کی ضرورت ہے بلکہ آج بھی ہندوستان کے مختلف صوبوں

کے سرکاری کالجز اور یونیورسٹی کے عربی شعبوں میں بھی عربی کے بجائے مقامی زبانوں ہی میں عربی کی تعلیم ہوتی ہے یہاں تک کہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں تو ریسرچ کا مقالہ تک ہندی زبان میں لکھنے کی اجازت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری کالجز سے فارغ طلبہ کے اندر بھی عربی زبان میں بولنے اور لکھنے کی صلاحیت مفقود ہے۔ چنانچہ سرکاری یونیورسٹیوں میں بھی عربی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کی جا رہی ہیں۔

پہلے مرحلے میں ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلم دیوبند یا جامعہ سلفیہ بنارس جیسے بڑے مدارس میں اساتذہ کے لئے تربیتی سینٹر کھولے جاسکتے ہیں جہاں اس مدرسے کی شاخوں کے ساتھ دیگر مدارس کے اساتذہ کو بھی مختصر تربیتی کورسز کے لئے مدعو کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے تربیتی مراکز یا اکیڈمک اسٹاف کالج کے قیام کے ضمن میں مالی وسائل کی فراہمی کے لئے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو (NCPUL)، مرکزی وقف کمیٹی، اقلیتی کمیشن، مولانا آزاد فاؤنڈیشن، وزارت برائے اقلیتی فلاح و بہبود اور مرکزی وزارت برائے انسانی وسائل سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ رنگ ناتھ کمیشن اور سچر کمیٹی کی سفارشات کے بعد مرکزی حکومت اس طرح کے اداروں کو خود قائم کرنا چاہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر سنجیدگی کے ساتھ مخلصانہ کوشش کی جائے تو مالی وسائل کی فراہمی آج کے دور میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ہے۔

اس طرح کے تربیتی اداروں میں عربی زبان کے ماہر اساتذہ کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لئے مختلف اوقات میں ان کو توسیعی خطبات کے لئے مدعو کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ثقافتی تبادلے (Cultural Exchange) پر دو گرام کے تحت بعض عرب ممالک کے اساتذہ کی خدمات کو بھی کچھ دنوں کے لئے حاصل کیا جاسکتا ہے جو ہمارے اساتذہ کو عربی زبان کی تدریس کے جدید طریقوں سے واقف کرائیں۔

جب تک مدارس کی سطح پر ان کا اپنا کوئی نظم نہ ہو مدارس کے ذمہ داران براہ راست یو جی سی کے تحت چلنے والے اکیڈمک اسٹاف کالجز کے ڈائریکٹریا اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے



براہ راست ربط قائم کر کے عربی کے ریفریشر کورسز میں اپنے اساتذہ کی شرکت کی اجازت حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو مدارس کے ذمہ دار لمبی تعطیل کے دوران کیمپس کے اندر میں ایک دو ہفتے پر مشتمل عربی اساتذہ کی تربیت کے لئے خصوصی ورکشاپ کا نظم کر سکتے ہیں جہاں ماہرین تعلیم اور عربی زبان کے ادباء اور ماہر اساتذہ کو مدعو کر کے ان سے عربی ذریعہ تعلیم کو موثر طریقے سے نافذ کرنے سے متعلق مختلف عملی پہلوؤں پر لکچر دلوا سکتے ہیں۔ اس طرح کے کورسز سے اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں میں یقیناً اضافہ ہوگا اور وہ طلبہ کے اندر عربی زبان و ادب کا ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

اگر ممکن ہو تو مدارس کے اساتذہ کو عربی زبان سے متعلق تدریسی کورس کرنے کے لئے سوڈان کے خرطوم یونیورسٹی، سعودی عرب کے جامعہ ملک سعود، جامعہ احمد بن سعود اور جامعہ ام القری کے معہد اللغة العربیہ میں عربی زبان کی تدریس سے متعلق ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی ٹریننگ کورسز میں بھیجنے کی کوشش کی جائے؛ کیونکہ ان اداروں میں عربی زبان کو جدید تکنیک کے مطابق موثر انداز میں پڑھانے کے آسان اور مفید طریقے بتائے جاتے ہیں۔

### نظام تعلیم سے متعلق بعض تدابیر

- اسی طرح آج کل عربی زبان کو جدید تکنیک کے مطابق پڑھانے کے موضوع پر عرب ممالک سے مختلف کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کا مطالعہ عربی زبان کے اساتذہ کے لئے مفید ہوگا، ان کتابوں کی مدد سے اساتذہ بہتر انداز میں تدریسی خدمات انجام دے سکتے ہیں؛ کیونکہ ان کتابوں میں تدریس کے نظریاتی طریقوں کے بجائے عملی طریقوں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ عربی نحو و صرف کے اصولوں کی الگ سے تعلیم دینے کے بجائے دوران درس ان اصولوں کی طرف نشاندہی پر زور دیا گیا ہے۔ پروفیسر ثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:



”تعلیم اب ایک مکمل فن کی صورت اختیار کر چکا ہے، دنیا میں ہزاروں لاکھوں ادارے اس موضوع اور اس کے طریقہ کار پر کام کر رہے ہیں لیکن ہمارے مدارس نے طریقہ تدریس میں کوئی اضافہ یا اصلاح کرنے کی کبھی نہیں سوچی، مثلاً عربی زبان کی تعلیم و تدریس کے اب بہت سارے نئے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں، اب گرامر کی مدد سے زبان پڑھانا غیر ضروری اور غیر مفید سمجھا جاتا ہے بلکہ نصوص کے ذریعہ گرامر کو سمجھایا جاتا ہے، جس طرح ہم نے قواعد پر نظر رکھے بغیر اپنی مادری زبان سیکھ لی اور اسے بولتے وقت تذکیر و تانیث یا واحد، جمع یا غائب، حاضر، متکلم کے قواعد کا غیر شعوری طور پر ہمیں احساس رہتا ہے اور ہم کوئی غلطی نہیں کرتے اسی طرح عربی زبان کو بھی سیکھا جاسکتا ہے“ (عربی و اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم، ج: ۲، ص: ۶۴)۔

- تفسیر، حدیث، فقہ اور منطق وغیرہ سے متعلق تمام مضامین کی تعلیم کے لئے عربی میڈیم کو لازم کرنے کے بجائے صرف عربی ادب کے لئے ہی عربی زبان میں تدریس کو ضروری قرار دیا جائے کیونکہ تمام اسلامی علوم کو عربی زبان میں پڑھانے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔

- فضیلت کے آخری درجات میں تمام طلبہ کے لئے ہر مضمون کو لازم قرار نہ دیتے ہوئے اختصاص کے اصول کے تحت طلبہ کی صلاحیت اور ان کی دلچسپی کے مطابق ان کو اسلامی علوم یا عربی ادبیات میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے۔ عربی ادبیات میں طلبہ کی صلاحیت اور ان کی دلچسپی کو پرکھنے کے لئے ایک داخلہ Test رکھا جائے اور اس میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو ہی عربی ادبیات میں اختصاص تدریس کے لئے داخلہ دیا جائے۔ اور پھر اتنی ہی تعداد میں طلبہ کو داخلہ دیا جائے جن کی ہمہ جہت تعلیم و تدریس کے لئے ہمارے پاس اساتذہ موجود ہوں۔

- عربی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی صورت میں عربی ادب کے استاد کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ عربی متون کو صحیح مخارج، اصول تجوید، نطق و لہجہ کی پوری رعایت کے ساتھ طلبہ کے

سامنے متعدد بار بلند آواز سے پڑھے اور پھر باری باری طلبہ سے بھی اس لب و لہجے میں پڑھوانے کی مشق کرائے؛ کیونکہ تدریس کے جدید طریقوں کے مطابق کسی بھی زبان کو سن کر اور پھر اسی طرز پر بول کر آسانی سے سیکھا جاسکتا ہے۔ عربی زبان میں الفاظ کے صحیح مخارج کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ تلفظ کے اختلاف سے یہاں معانی و مفہوم یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں، اگر ہم درست لہجے میں عربی الفاظ کو ادا نہ کریں تو ایک عرب ہماری گفتگو کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ اسی طرح استاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوران تدریس اپنے چہرے کے تاثرات اور بوقت ضرورت ہاتھوں کے اشارات کا بھی استعمال کرے؛ کیونکہ تدریس کی جدید تکنیک میں باڈی لنگویج کی بڑی اہمیت ہے، الفاظ کے ذریعہ جو کمی رہ جاتی ہے اشارات سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

- عربی ادب کے استاد کے لئے یہ بھی مناسب ہے کہ وہ اپنے مطالعہ کو وسیع کرے تاکہ وہ دوران تدریس متون کی وضاحت کے لئے درسیات تک میں محدود نہ رہے بلکہ وہ کتاب سے ہٹ کر مترادفات اور مختلف اسالیب بیان کو اختیار کرے، اس صورت میں طلبہ درس میں پوری دلچسپی لیں گے، استاد کی باتوں کو غور سے سنیں گے، ان کے دلوں میں استاد کی قدر و منزلت بڑھے گی اور ان کو اس بات کا احساس ہوگا کہ آج دوران درس ان کو کچھ نیا سیکھنے کو ملا اور ان کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس طرح وہ طلبہ کے اندر علم کا شوق پیدا کرنے اور اس موضوع سے متعلق دیگر کتابوں کا مطالعہ کرنے کی طرف رغبت دلانے میں کامیاب ہو سکے گا۔ استاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ طلبہ کو عربی اخبارات و رسائل کا پابندی سے مطالعہ کرنے پر آمادہ کرے۔

- عربی میڈیم کو موثر بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کلاس کا ماحول خوشگوار ہو۔ طلبہ کے دلوں میں اپنے اساتذہ کے لئے احترام اور اساتذہ کے دلوں میں طلبہ کے لئے پدرانہ شفقت و محبت ہو۔ وہ تعلیم و تدریس کے ساتھ اپنے شاگردوں کی جائز ضرورتوں کا خیال رکھیں، اگر ممکن ہو تو ان کے ذاتی مسائل میں بھی دلچسپی لیں۔ عہد اکبری میں مشہور مدرس حکیم علی گیلانی

کے متعلق نقل ہے کہ وہ ہمیشہ طلبہ کو درس دیتے اور ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے (ہندوستانی مسلمان: ابوالحسن علی ندوی، ص: ۱۳۴)۔ استاذ الملک مولانا محمد افضل جو نیپوری کو اپنے عزیز شاگرد ملا محمد جو نیپوری سے ایسا تعلق خاطر تھا کہ جب ان کا انتقال ہوا تو اس کی تاب نہ لاسکے، اور چالیس روز تک کسی نے استاد کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا اور اس کے بعد وہ اپنے شاگرد سے جا ملے (ہندوستانی مسلمان: ابوالحسن علی ندوی، ص: ۱۳۴)۔ اور دوسری طرف طلبہ بھی اپنے استاذ سے ایسی ہی عقیدت رکھتے تھے، ایک مرتبہ شمس العلماء ملا نظام الدین فرنگی محلی کے انتقال کی خبر مشہور ہو گئی، یہ خبر سن کر ان کے ایک شاگرد سید ظریف عظیم آبادی کی روتے روتے آنکھیں جاتی رہیں، اور دوسرے شاگرد سید کمال عظیم آبادی کا یہ خبر سنتے ہی انتقال ہو گیا جب کہ یہ اطلاع غلط تھی (نفس مصدر: ابوالحسن علی ندوی، ص: ۱۳۳)۔ ظاہر ہے اس طرح کے خوشگوار ماحول ہی میں طلبہ بے جھجک اپنے استاذ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ عربی بولنے کی مشق کر سکتے ہیں۔

- عربی ادبیات کے نصاب میں شامل عربی زبان کے بعض مشہور اخلاقی و اصلاحی ڈراموں کو استاد اپنی نگرانی میں چھٹی کے دنوں میں اسٹیج کرانے کی کوشش کرائے جس کے کرداروں کا انتخاب طلبہ کے درمیان سے ہی کیا جائے اور پھر ان کو ان کے ڈائیلاگ یاد کرائے جائیں، کرداروں کا انتخاب، مکالمات کے اندر حسب ضرورت تصرفات کے پورے اختیارات طلبہ کے سپرد کر دیئے جائیں، اس سے طلبہ کے اندر خود اعتمادی آئے گی، ان کی جھجک اور شرم ختم ہوگی اور ان کو روزمرہ کی زندگی میں بول چال کے بہت سارے الفاظ یاد ہو جائیں گے۔

- کلاس میں طلبہ کے اندر دلچسپی اور حرکت و زندگی باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ استاد بلیک بورڈ کا استعمال ضرور کرے، درس میں آنے والے مشکل الفاظ کو بلیک بورڈ پر لکھ کر ان کی وضاحت کرے، اس درس پر مبنی مختلف سوالات کو جلی حروف میں لکھ دے اور طلبہ کو ان کا عربی میں جواب دینے کے لئے کہے، اور جہاں تک ممکن ہو سکے استاد کلاس میں کھڑے ہو کر پڑھانے



کی کوشش کرے۔

- آج علم و فن، سائنس و ٹکنالوجی، تجارت و معیشت، طب و جراحات، سیاست و حکومت، نشر و اشاعت، تبلیغ و دعوت غرضیکہ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو کمپیوٹر سے اچھوتا ہو، زندگی کے ہر چھوٹے بڑے میدان میں اس کی گراں قدر افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آج کے دور میں وہ شخص ناخواندہ کہا جاتا ہے جو کمپیوٹر اور اس سے بڑی تکنیک انٹرنیٹ وغیرہ کے استعمال سے ناواقف ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آج انٹرنیٹ پر صرف مخرّب اخلاق اور فحش فلمیں ہی موجود ہیں بلکہ عربی زبان و ادب سے جڑی ہوئی مفید معلومات کا ایک سمندر موجود ہے، عربی زبان کو بہتر طور پر بولنے اور لکھنے سے متعلق ہزاروں پروگرام موجود ہیں، اسی طرح انٹرنیٹ پر عرب ممالک سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل، شعراء کے دواوین، قصہ، ناول، اور ڈرامہ وغیرہ کا بڑا ذخیرہ ہے جن میں سے اکثر کو طلبہ مفت میں Downlode کر سکتے ہیں۔ ہم مدرسے کے کسی ایک کمرے کو کمپیوٹر روم بنا سکتے ہیں جہاں کچھ کمپیوٹر رکھ دئے جائیں اور ان کو انٹرنیٹ سے جوڑ دیا جائے اور اساتذہ میں سے کسی ایک کو اس کی ذمہ داری دے دی جائے، اس کے لئے بھی بہت زیادہ سرمائے کی ضرورت نہیں ہوگی، کیونکہ کمپیوٹرس کی قیمتیں دن بدن کم ہوتی جا رہی ہیں، ہم اس کے لئے پرانے کمپیوٹر بھی لے سکتے ہیں جو بہت کم قیمتوں پر دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کے سینٹر قائم کرنے کے لئے مدارس کے ذمہ داران ادارہ برائے فروغ اردو زبان سے بھی رجوع کر سکتے ہیں جس کے پروگرام میں اقلیتوں کے لئے کمپیوٹر سیکھنے کے تربیتی سینٹر قائم کرنا شامل ہے، اس کے لئے وہ کمپیوٹر کے ساتھ ایک Instructor بھی مہیا کراتے ہیں۔ بعض مدارس میں ان کے کمپیوٹر سینٹر قائم ہیں۔

- عربی میڈیم کو موثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ طلبہ کو ابتدائی درجات میں زیادہ سے زیادہ قرآنی سورتوں اور احادیث کو زبانی یاد کرایا جائے، اور ان کے الفاظ و معانی میں موجود



زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کے نکات کی نشاندہی بھی کر دی جائے اسی طرح تدریجاً اگلی کلاسوں میں منتخب شعراء کے اشعار اور عربی نثر کے مشہور پاروں کو بھی زبانی یاد کرانے کی مشق کرائی جائے، اس طرح طلبہ کے پاس عربی الفاظ اور اسالیب بیان کا بڑا ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور وہ آسانی سے اپنی تقریر و تحریر میں ان کا استعمال کر سکتے ہیں۔ دور جدید میں ملک و بیرون ملک کے عربی زبان و ادب کے ادباء و محققین کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے قدیم ادباء کی پوری پوری کتاب کو حفظ کر لیا تھا، تعلقات، جمہورۃ اشعار العرب، کامل کی المبرد وغیرہ تو ہر ادیب و محقق یاد کر لیتا تھا، پروفیسر عبدالعزیز مبینی کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے عربی لغت اور ادب کی بعض کتابوں کو حفظ کر لیا تھا اور آخری ایام تک ان کو عربی زبان کے تقریباً ایک لاکھ اشعار یاد تھے۔

— اگر وسائل اجازت دیں تو اساتذہ کی نگرانی میں عربی زبان میں ماہانہ یا سہ ماہی کوئی عربی رسالہ یا میگزین نکالنے کی کوشش کی جائے جس میں مختلف موضوعات پر ضروری اصلاح کے بعد طلبہ کی تخلیقات کو شائع کیا جائے۔ ضروری نہیں کہ آغاز سے ہی یہ رسالہ قومی یا بین الاقوامی معیار کے مطابق ہو، وسائل کے مطابق پہلے اسے ریاستی سطح پر اور پھر ملکی پیمانے پر آگے بڑھایا جائے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے اخبار ”الرائد“ کے ماڈل کو سامنے رکھا جائے۔ اس طرح کے رسائل و اخبارات میں مدارس کے طلبہ کے مقالات شائع ہونے کی صورت میں ان کی ہمت افزائی ہوگی اور عربی زبان میں لکھنے کی مشق بھی ہوگی۔

— کسی زبان کو صحیح لب و لہجہ میں بولنے کی ٹریننگ دینے میں آج کل لنگوتج لیب کی بھی بڑی اہمیت ہے، لنگوتج لیب کی سہولیات اس وقت جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (دہلی)، انگلش ایجنڈ فارن لنگویجز یونیورسٹی (حیدرآباد) اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے عربی شعبوں میں موجود ہیں۔ مدارس اپنے طویل مدتی پروگرام میں اس طرح کا لیب قائم کرنے کا منصوبہ رکھ سکتے ہیں۔ اس

طرح کے لیب قائم کرنے کے لئے بھی اقلیتی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے والے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری مالی اداروں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

- آج کل ہم بڑی چھتریوں یا انٹرنیٹ کی مدد سے مختلف عرب ممالک سے نشر ہونے والے عربی پروگرام اور عربی نیوز چینلس کو آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ عربی ٹی وی چینلوں پر سیریل کی شکل میں دور جدید کے بعض مشہور ادباء کے عربی و تاریخی ڈرامے بھی نشر کئے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں کو ریکارڈ کر کے سی ڈی کی مدد سے بھی طلبہ کو یہ عربی ڈرامے دکھائے جاسکتے ہیں۔ اس طرح کے عربی نیوز چینل اور عربی ڈراموں کے ذریعہ طلبہ کو بول چال کی عربی زبان اور عربی لہجے کو سیکھنے میں کافی مدد ملے گی۔ ضروری ہے کہ طلبہ اس طرح کے ٹی وی پروگرام کسی عربی استاد کی نگرانی میں دیکھیں تاکہ استاد بعض جدید الفاظ و مصطلحات کی بروقت ان کے سامنے وضاحت بھی کر دے۔ اس طرح بعض ٹی وی چینلوں پر عربی زبان کو سکھانے کے لئے صحیح تلفظ اور مخارج کی بھی تعلیم دی جاتی ہے، اس طرح کے پروگرام عربی زبان کی تدریس میں اختصاص رکھنے والے ماہر اساتذہ کی سرپرستی میں تیار کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح مصر، سعودی عرب، سوڈان، لبنان جیسے مختلف ممالک کے ریڈیو اسٹیشن سے بھی مختلف اوقات میں عربی زبان سکھانے کے پروگرام اور خبریں نشر کی جاتی ہیں۔

- عرب ممالک کی مختلف یونیورسٹیوں کے لنگویج کے شعبے نے غیر عربوں کو عربی زبان سکھانے کے لئے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کی شکل میں عربی دروس تیار کئے ہیں، ان کیسٹس میں ریکارڈ ہونے والے اسباق کو کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا ہے، عربی زبان سکھانے کے لئے ہم اس طرح کے کیسٹس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ طلبہ کے درمیان کتاب کو تقسیم کر کے ٹیپ ریکارڈ کو آن کر دیا جائے اور طلبہ اس کتاب کی مدد سے کیسٹس کی آواز اور لہجے کو Catch کرنے کی کوشش کریں؛ کیونکہ عربی زبان کو سیکھنے کا بنیادی اصول سننا اور بولنا ہے۔ کئی بار سبق کو سنانے کے بعد ٹیپ کو بند کر کے طلبہ

سے کہا جائے کہ وہ اسی لب و لہجے میں اسی سبق کو دہرائیں اور ان کی آواز کو ریکارڈ کر کے ان کو سنایا جائے اور پھر استاد ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی اصلاح کر دے۔

- عربی ادب و انشاء کی کلاس میں جہاں استاد عربی زبان میں تشریح کرے وہیں طلبہ کو بھی دوران درس عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں بولنے کی اجازت نہ ہو۔ درس ختم ہونے کے بعد استاد طلبہ سے عربی زبان ہی میں سوالات کرے جن کا جواب بھی عربی زبان میں دینا لازمی ہو، اور کبھی ان کو کچھ ایسے سوالات دے دیئے جائیں جن کا جواب طلبہ دوسرے دن لکھ کر لائیں۔ استاد اپنے طلبہ کو کلاس کے باہر بھی دوستوں سے عربی زبان میں گفتگو کرنے کی رغبت دلائے کیونکہ عربی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا بنیادی مقصد ہی عربی زبان میں تقریر و تحریر کی صلاحیت کو پروان چڑھانا ہے۔

## عربی ادبیات کے نصاب سے متعلق تدابیر

بیشتر مدارس میں رائج عربی زبان و ادب سے متعلق نصاب میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ طلبہ کے اندر کتاب و سنت کو سمجھنے اور فقہی مسائل کے استنباط کی شکلیں آسان ہو جائیں، یہی وجہ ہے کہ مروجہ عربی نصاب میں عربی نحو و صرف کی مشق پر خاص زور دیا جاتا ہے اور عربی ادبیات کے نام پر معلقات، حماسہ، مقامات، کلیلہ و منہ اور بعض مدارس میں مختارات و منشورات سے بعض منتخب اشعار و ابواب کے تدریس کو کافی سمجھا جاتا ہے، جب کہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے عربی ادبیات کے نصاب پر نظر ثانی کر کے اس میں ضروری تبدیلی لانا ضروری ہے۔ مدارس میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے نافذ کرنے کی صورت میں ہماری یہ ترجیح ہونی چاہئے کہ عربی ادبیات کے نصاب میں انشاء، تجوید، شعر و نثر کی ایسی کتابوں کو شامل کیا جائے جو زبان و بیان کے اعتبار سے سہل اور افکار و معانی کے اعتبار سے اخلاقی قدروں پر پوری اترتی ہوں۔ نثری و شعری مجموعوں کے انتخاب میں ادبی معیار کے ساتھ ساتھ طلبہ کے



ذہنی استعداد اور ان کے ذوق اور دلچسپی کا بھی خیال رکھا جائے۔ عربی ادبیات کا ایک متوازن نصاب تیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان اور عرب ممالک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ثانوی، بی اے اور ایم اے کے درجات میں پڑھائی جانے والی کتابوں کو بھی سامنے رکھا جائے، بہتر ہوگا کہ مدارس میں عربی ادبیات کا نصاب تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دے دی جائے جس میں مختلف مدارس میں عربی ادب کے اساتذہ کے ساتھ بعض یونیورسٹیوں کے عربی اساتذہ کو بھی رکھا جائے اور پھر باہم مشورے سے کوئی نصاب تیار کیا جائے۔ کتابوں کا بوجھ کم کرتے ہوئے ادب و انشا سے متعلق کتابوں کو زیادہ رکھا جائے جس سے عربی زبان کو بولنے اور لکھنے کی زیادہ سے زیادہ مشق ہو سکے۔ کتابوں کے انتخاب میں انگریزی و فرانسیسی جیسی ترقی یافتہ زبانوں کے معیار کو سامنے رکھا جائے۔ عربی نحو و صرف کی تعلیم کے لئے قدیم کوئی اور بصری نحو یوں کی ضخیم کتابوں کے بجائے نحوی و صرفی اصولوں کو آسان طریقے سے سکھانے کے لئے لکھی گئی جدید کتابوں کو نصاب میں جگہ دیں۔ سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ماہر تعلیم جناب سید حامد صاحب نے مدارس کے نصاب میں تبدیلی کے متعلق کہا تھا:

”ماضی سے واقفیت اس لئے حاصل کی جاتی ہے کہ ہم حال کو بہتر سے بہتر بنا سکیں اور پھر ایک تابندہ مستقبل کی تعمیر کر سکیں، اس لئے نہیں کہ ماضی کے اسیر ہو جائیں۔ دینی مدارس کی تعلیم اگر عصری تقاضوں سے اسی طرح بیگانہ، ماضی، حافظہ اور تقلید کے مثلثی حصار میں اسی طرح اسیر رہی تو وہ فرسودہ ہوں گے اور ذہین طالب علموں کے لئے اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہے گی۔ وہی بچے اب دینی مدارس میں داخل ہوتے ہیں جو مالی یا ذہنی اعتبار سے عام انگریزی اسکولوں میں داخل نہیں ہو سکتے، یہ صورتحال تشویشناک ہے“ (ملک و ملت کی تعمیر اور دینی مدارس، ص: ۱۲۴)۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ قدیم اور جدید عربی ادب میں کوئی خاص فرق نہیں ہے لیکن ایسا کہنا بہت زیادہ درست نہیں ہوگا؛ کیونکہ عربی زبان نے اپنی طویل تاریخ کے ہر دور میں مختلف زبانوں کے الفاظ اور مصطلحات سے اپنے دامن کو وسیع کیا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری



ہے۔ آج عرب کے مختلف ممالک میں ایسی بڑی بڑی لغوی اکیڈمیاں قائم ہیں جو سائنسی و ادبی علوم و فنون کے میدان میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی جیسی ترقی یافتہ زبانوں سے الفاظ و مصطلحات کو مستعار لیتے ہوئے عربی زبان میں داخل کر رہی ہیں؛ چنانچہ آج بازار میں میڈیکل، انجینئرنگ، سیاسیات، معاشیات اور دیگر سائنسی علوم کے لیے عربی زبان میں مستقل ضخیم لغات دستیاب ہیں۔

### مراجع و مصادر:

- ۱۔ عربی و اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے۔ خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵
- ۲۔ مقالات شبلی، علامہ شبلی نعمانی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۳۲
- ۳۔ مجلہ علوم اسلامیہ، ج: ۱۲، ص: ۸۹، شعبہ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۸
- ۴۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، مولانا ابوالحسنات ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۱
- ۵۔ دینی مدارس اور ان کے مسائل (مقالات سمینار) ادارہ علمیہ، جامعہ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰
- ۶۔ ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق، پروفیسر عبدالعلیم، سرفراز پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۶
- ۷۔ تذکرہ سلیمان، غلام محمد، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
- ۸۔ ”معارف“ سلیمان نمبر، ۱۹۵۵، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
- ۹۔ ملک و ملت کی تعمیر اور دینی مدارس، ادارہ علمیہ، جامعہ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ،

۱۹۹۵

- ۱۰- ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات، مرتب: عماد الحسن آزاد فاروقی، مکتبہ جامعہ لمٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۸
- ۱۱- ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۹۳
- ۱۲- ہندوستانی مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مولانا مناظر حسن گیلانی، ندوۃ المصنفین، دہلی
- ۱۳- اللغة العربية في الهند عبر العصور، خورشید اشرف اقبال الندوی، الهيئة المصرية العلمية، القاهرة، مصر، ۲۰۰۸ء
- ۱۴- لغة العرب وكيف نهض بها، محمد عطية الابراشي، دارالكتاب العربي، مصر، ۱۹۷۴
- ۱۵- مجلة العربية للناطقين بغيرها، العدد الرابع، ۲۰۰۷، معهد اللغة العربية، جامعة أفريقية العالمية، الخرطوم، السودان
- ۱۶- رسائل تكنولوجيا التعليم مبادئها وتطبيقاتها في التعليم والتدريس، محمد زياد حمدان، دار التربية الحديثة، الاردن، ۱۹۸۲
- ۱۷- وسائل الاتصال والتكنولوجيا في التعليم، حسين احمد الطوبجي، مطبعة المعارف، القدس، ۱۹۷۹
- ۱۸- الوسائل التعليمية والمنهج، احمدى خير وجابر عبد الحميد، دار النهضة العربية، القاهرة، ۱۹۹۱
- ۱۹- التقنيات التربوية في تدريس اللغة العربية لغير الناطقين، على القاسمي ومحمد علي السيد المغرب، ۱۹۹۱

- ۲۰ - نظريات التعليم وتطبيقاتها التربوية، جودت عبد الهادي، دار الثقافة للنشر، عمان، الاردن، ۲۰۰۰
- ۲۱ - المدخل الى التقنيات الحديثة في الاتصال والتعليم، مصطفى عيسى، جامعة الملك سعود الرياض، ۱۹۹۸
- ۲۲ - الاتجاهات المعاصرة في تدريس اللغة العربية واللغات الحية الاخرى لغير الناطقين بها، ابراهيم حمادة، دار الفكر العربي، القاهرة، مصر، ۱۹۷۸
- ۲۳ - اقراص الفيديو - وصفها وكيفية استخدامها في المجال التعليمي، عبد الرحيم صالح عبد الله، جامعة الكويت، الكويت، ۱۹۸۲
- ۲۴ - تقنيات التعليم والاتصال، عبد العزيز محمد العقيلي، مكتبة دارالقلم، الرياض، ۱۹۹۳



## دینی مدارس میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کرنے کی ضرورت اور اس کی تدبیریں

مولانا محمد وثیق ندوی ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على أفصح العرب سيد المرسلين خاتم النبيين محمد بن عبد الله الأمين وعلى آله وصحبه أجمعين وبعد!

مدارس عربیہ اسلام اور اس کی بنیادی عربی زبان کے تحفظ کے قلعے اور مسلمانوں کی دینی درستی کے لئے سرچشمہ حیات ہیں، ان کا وجود ایمان و اسلام، اسلامی عقائد و احکام اور اسلامی تہذیب و تمدن کی بقا و تحفظ کا ضامن ہے، مدارس عربیہ نے امت کو ہر دور میں شرور و فتن، گمراہی و ضلالت اور الحاد و دہریت سے محفوظ رکھا اور جب بھی امت اور اس کے دین و شریعت، عقائد و مسلمات، دینی تشخص اور اسلامی شناخت کے خلاف کوئی آندھی چلی تو یہ مدارس سینہ سپر ہو گئے اور امت کو ہر قسم کی تحریف اور زلیخ و ضلال سے بچایا۔ دراصل یہ مدارس وہ سانچے ہیں جن میں ایسے افراد ڈھل کر تیار ہوتے ہیں جو مسلمانوں کی ذہنی و فکری تربیت کر کے ان کے اصلی مزاج اور حقیقی خدو خال کو باقی و برقرار رکھتے ہیں۔

یہ مدارس عربیہ مسلمانوں کی نہایت قیمتی متاع اور بیش بہا سرمایہ ہیں، جن سے وہ فقیری میں بھی امیر ہیں، ہم اس بیش بہا قیمتی متاع پر جس قدر فخر کریں بجا ہے، موجودہ دور میں قوم کی

☆ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ



واقعی خدمت اور ملک کو اچھے اور بہتر شہری مہیا کرنے کے لئے بھی مدارس کا وجود ناگزیر ہے۔

موجودہ دور میں شریعت اسلامی، دینی تشخص اور اسلامی شناخت کی حفاظت کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی حفاظت بھی اولین فریضہ بن گئی ہے، کیونکہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی سے عربی زبان کو ختم کرنے کی بڑے منصوبہ بند طریقہ سے مہم جاری ہے، اور قرآن جو مسلمانوں کا اصل سرچشمہ، قوت و حیات اور مشعل راہ ہے، اس میں تحریف اور اسے آؤٹ آف ڈیٹ کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران جب یورپ نے یہ سمجھ لیا کہ مسلمانوں کو میدان جنگ میں شکست دینا آسان نہیں اور ان میں قوت ایمانی، قربانی اور جاں نثاری کا جو جذبہ ہے اس کی اصل بنیاد قرآن ہے اور یہ عربی زبان میں ہے تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ عربی زبان ہی کو ختم کر دیا جائے اور جب مسلمان عربی زبان سے نابلد ہو جائیں گے تو قرآن سے ان کا رشتہ ٹوٹ جائے گا اور جب قرآن سے ان کا تعلق ختم ہو جائے گا تو مسلمان خود بخود کمزور ہو جائیں گے اور ان کو زیر کرنا آسان ہو جائے گا۔

برطانیہ کے سابق وزیر اعظم گلاڈسٹون نے برطانوی پارلیمنٹ میں قرآن ہاتھ میں لے کر کہا تھا کہ ”جب تک مسلمانوں کے پاس یہ قرآن موجود ہے یورپ مشرق پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔“

الجزائر کے فرانسیسی دائرے نے الجزائر پر فرانسیسی سامراج کے سو سال پورے ہونے پر کہا تھا کہ ”جب تک یہ قرآن پڑھتے رہیں گے اور عربی زبان بولتے رہیں گے ہم ان پر قبضہ نہیں کر سکتے، لہذا اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان کے درمیان سے قرآن کے وجود کو مٹا دیں اور عربی زبان کو ختم کر دیں“ (قادة الغرب يقولون: دمر الإسلام بمؤلفه: جلال العالم، ص: ۳۸، عمان دارالارقم، ۱۹۸۱ء، اور الشباب المسلم والحضارة الغربية، مؤلفه: حسن حسن سليمان، ص: ۵۰، دارالشرق جده، ۱۹۸۵ء)۔

یہیں سے عربی زبان جو نزول قرآن کریم کے عہد میں اسی عہد کے الفاظ و اسلوب کی

زبان تھی اس کے اندر خاص طور پر اس کی شاعری میں جو اس وقت عربی کی بڑی اساس تھی تشکیک کا دور شروع ہوا۔ مارگولیوٹھ Margoliouth پہلا مستشرق ہے جس نے شعر جاہلی میں شک پیدا کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جب قدیم اصل عربی زبان میں شک پیدا ہو جائے گا تو اس سے قرآن وحدیث کی زبان بھی مشکوک ہو جائے گی اور یہ ناقابل اعتبار سمجھی جائے گی اور مسلمان اس کو چھوڑ دیں گے جو ان کی حقیقی قوت کا سرچشمہ ہے، مغرب کی اس یقین کے بعد کہ عربی زبان اور مسلمانوں کا اپنے دین اسلام سے رشتہ توڑنے کا بہترین ذریعہ عربی زبان کو ختم کر دینا یا کم سے کم بے اعتبار بنا دینا ہے، اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کا تعلق قرآن سے ختم ہو جائے گا، عربی زبان کے خلاف یلغار شروع ہو گئی۔ اس یلغار میں مغربی مستشرقین کے ساتھ ساتھ عالم عربی کے جدید تعلیم یافتہ نوجوان بھی شریک ہو گئے جن کی ذہن سازی اور تربیت مغربی تعلیمی اداروں میں ہوئی تھی۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسینی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”یورپ سے تعلیم پا کر آنے والوں کی حالت یہ تھی کہ مغربی روح ان کے اندر پوری طرح سرایت کر چکی تھی، وہ اسی کے دماغ سے سوچتے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کے پھیپھڑوں سے سانس لیتے تھے، وہ اپنے مستشرق اساتذہ کی صدائے بازگشت بن کر وہی خیالات ونظریات پورے یقین و وثوق اور پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ اپنے ملک میں پھیلانے کی کوشش کرتے، دنیا کے کسی گوشہ میں اگر کوئی مستشرق کوئی نظریہ یا خیال پیش کرتا تو مصر میں نہ صرف اس کی حمایت کرنے والا بلکہ پورے خلوص اور پورے زور قلم اور انشاء پردازی کے ساتھ اس کا شارح و داعی کوئی نہ کوئی ادیب اور مفکر اسی وقت مہیا ہو جاتا“ (مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ص: ۱۳۷)۔

ان میں سرفہرست مصر کے ادباء (جن میں عیسائی اہل قلم پیش پیش رہے) تھے، مثال کے طور پر سلامہ موسیٰ، ڈاکٹر طہ حسین، لویس عوض، رفاعہ بک طہطاوی، قاسم امین، محمد حسین ہیکل،

یعقوب صروف، فرح انطون، شیلی مسلم، غالی شکری، عبدالعزیز فہمی، عیسی اسکندر معلوف اور محمد عثمان جلال وغیرہ نے عربی علوم و معارف اور اسلامی احکام کو عامی مصری زبان اور لاطینی رسم الخط میں لکھنے کی تحریک چلائی۔

۱۹۲۶ء میں ولیم ولکوکس انجینئر نے عربی زبان کو چھوڑ کر عامی زبان استعمال کرنے کی دعوت دی اور انجیل کے چار حصوں کو عامی زبان میں منتقل کیا جس کا نام ”اللغة المصرية“ رکھا، قاسم امین نے ترکی زبان کے طرز پر اعراب کو ختم کرنے اور احمد سید لطفی نے عامی زبان استعمال کرنے کی دعوت دی۔ انتاس کرملی نے انگریزی زبان کے طرز پر لفظ کے آخری حرکات کو حروف میں لکھنے کی تجویز رکھی، مثلاً: ”ضرب: کو“ ”ضاربا“ ”سعد“ ”کو“ ”ساعدون“، ”سعداً“ کو ”ساعدان“، اور سعد“ ”کو“ ”ساعدين“، ”مجد“ ”کو“ ”موحامدادون“ وغیرہ، جبران خلیل جبران اور ادباء مہجر نے عربی زبان کو چھوڑ کر مغربی زبان اختیار کرنے کی تحریک چلائی۔ سب سے زیادہ نقصان سلامہ موسیٰ، لویس عوض اور ڈاکٹر طہ حسین نے پہنچایا، لویس عوض اور طہ حسین نے عربی زبان کے ساتھ عربی تمدن کو بھی چھوڑنے کی پُر زور وکالت کی بلکہ عملی طور پر اس کے لئے مہم چلائی۔ طہ حسین نے اپنی کتاب ”مستقبل الثقافة فی مصر“ میں صاف طور پر اس کی دعوت دی ہے کہ ”ہمیں اہل یورپ کے طریقہ پر چلنا چاہئے اور ان کی سیرت و کردار اختیار کرنا چاہئے تاکہ ہم ان کے برابر ہو سکیں، اور تہذیب کے خیر و شر، تلخ و شیریں، پسندیدہ و ناپسندیدہ ہر چیز میں ان کے رفیق کار اور شریک حال ہو سکیں“ (ص: ۴۱)۔

”ہم ایک یورپین کو باور کرا دیں کہ اشیاء کو ہم اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے ایک یورپین دیکھتا ہے، ان کی وہی قدر و قیمت ہماری نظر میں ہے جو اس کی نظر میں ہے، ان کے متعلق وہی رائے قائم کرتے ہیں جو ایک مغربی قائم کرتا ہے“ (ص: ۴۴)۔

طہ حسین نے ”فی الشعر الجاہلی (فی الأدب الجاہلی) میں ڈیکارٹ کے

فلسفہ شک کو بنیاد بنا کر شعر جاہلی کو کنڈم کرنے کی کوشش کی، مغرب نے طہ حسین کو بہت سراہا بلکہ سر پر بٹھایا اور اپنا سامراجی مقصد پورا کیا۔

اسلام پسندوں نے اس تحریک کا جم کر مقابلہ کیا، اور مخالفین کو دندان شکن جواب دیا، ان میں سرفہرست مصطفیٰ صادق الراقی، محمود محمد شا کر، انور جندی، محبت الدین الخطیب، حافظ ابراہیم اور ڈاکٹر ناصر الدین اسد اور اخوانی ہیں۔

عربی زبان کی اسی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مغرب مختلف طریقوں سے اس کے خلاف اور قرآن کریم کے خلاف مہم چلاتا رہتا ہے، گزشتہ سال جرمن مستشرق رودی باریٹ کی ایک کتاب شائع ہوئی جس میں اس نے قرآن کریم، محمد ﷺ اور پیغام محمدی کو نشانہ بنایا اور قرآنی آیات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے، اس کتاب کا عربی میں ترجمہ ڈاکٹر رضوان السید نے ”محمد والقرآن، دعوة النبی العربی ورسالته“ کے نام سے کیا ہے، اسی طرح متشدد عیسائی وائلڈرز گیراٹ (ہالینڈ) نے ”فتنہ“ نامی فلم بنائی جس میں قرآن کریم کو جنگ اور تشدد کی کتاب کے طور پر پیش کیا۔ جو عربی زبان سے نابلد ہیں وہ قرآن کی تعلیمات کو صرف ترجمہ کی بنیاد پر صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے، اس کے لئے عربی زبان جاننا ضروری ہے، اس لئے مدارس عربیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ عربی زبان کی حفاظت اور اس کی تعلیم کے پختہ انتظامات کریں، اور عربی زبان میں ایسے ماہرین پیدا کریں جنہیں قرآن و حدیث میں رسوخ اور مہارت حاصل ہوتا کہ امت اسلامیہ بلکہ پوری انسانیت کی رہبری کا فریضہ انجام دیں، اس لئے کہ یہ امت اسلامیہ امت دعوت و ہدایت ہے۔

کسی بھی زبان کو سیکھنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے میں نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم دونوں کا بنیادی کردار ہوتا ہے، اس لئے ماہرین تعلیم و تربیت اس بات کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ نصاب تعلیم میں تبدیلی کے پہلو بہ پہلو طریقہ تعلیم میں بھی تبدیلی ہو اور عربی زبان ہی کو ذریعہ



تعلیم کے طور پر اختیار کیا جائے، جس طرح انگلش میڈیم اسکولوں میں انگریزی زبان ہی کو طریقہ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے، جس سے پڑھنے والوں میں ابتداء ہی سے انگریزی زبان میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مدارس عربیہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں منارہ نور یا بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی ہیں، جن کا فیضان صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان کی خیر و برکت سے پورا ملک متمتع ہو رہا ہے، اور مدارس کا جو بنیادی مقصد ہے وہ اس میں کامیاب بھی ہیں، لیکن عربی زبان جو مقدس قرآن کریم کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر بولی، سمجھی اور برتی جانے والی زبان ہے، اس میں مطلوبہ ماہرین پیدا نہیں ہو رہے ہیں، اب جبکہ حالات بدل گئے ہیں، اور عربی زبان کو سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ختم کرنے کی کوششیں جاری ہیں، فضلاء مدارس میں عربی زبان میں رسوخ، مہارت اور قدرت پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور چونکہ ملت اسلامیہ کا بنیادی سرمایہ اور شریعت اسلامیہ کے امہات مصادر عربی زبان میں ہیں اس لئے ان سے براہ راست استفادہ کے لئے بھی عربی زبان میں مہارت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح موجودہ دور میں عالم عربی میں عربی زبان میں نئی نئی علمی اور تاریخی تحقیقات، ادبی تخلیقات اور اسلامی تمدن اور مغربی تمدن کے متعلق معلومات شائع ہو رہی ہیں، ان سے واقفیت اور علماء عرب کے خیالات و افکار سے براہ راست واقفیت کے لئے بھی عربی زبان میں مہارت کی ضرورت ہے۔

مدارس عربیہ میں مروجہ نصاب کی مدت تکمیل تقریباً اٹھارہ سال ہے، جو چار مرحلوں پر مشتمل ہے، ابتدائی، ثانویہ، عالیہ اور اختصاص، لیکن ادھر دیکھا یہ جارہا ہے کہ اس مدت کی تکمیل کے بعد بھی فارغین میں عربی زبان میں وہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی جو ہوتی چاہئے، جبکہ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے والا ابتداء ہی سے انگریزی زبان میں بولتا اور سمجھتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟

ماہرین تعلیم کی نظر میں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہاں نصاب تعلیم کے ساتھ طریقہ تعلیم بھی انگریزی زبان ہے جس کی وجہ سے طالب علم کو ابتداء ہی سے سب کچھ انگریزی زبان ہی میں کرنا ہوتا ہے، اور اسی کے ساتھ استاد کا کام کم اور طالب علم کا کام زیادہ ہوتا ہے، بلکہ نئے نظام تعلیم میں استاد صرف رہنمائی کرتا ہے، استاد درجہ میں آتا ہے، کوئی موضوع دے دیتا ہے اور طلبہ سے اس پر برجستہ تحریر یا تقریراً اظہار خیال کو کہتا ہے، اس طرح طالب علم مجبور ہوتا ہے کہ وہ محنت کرے ورنہ ناکام ہو جائے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم انگلش میڈیم اسکول کی تقلید کریں، بلکہ یہ نبوی اصول ”خذ ما صفا ودع ما کدر“ کے تحت ہے۔

• لیکن یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ مدارس عربیہ کا جو دینی نصاب ہے وہ اتنی مقدار میں ہے کہ اس کے ساتھ ہر طرح کے علوم زیادہ مقدار میں شامل نہیں کئے جاسکتے، لیکن ان میں سے جو واقعی ضروری ہیں ان کا انتخاب اور ان کی ضروری مقدار میں ان کو داخل کیا جاسکتا ہے، اس اضافہ کے لئے عربی مدارس میں فکر کی جارہی ہے اور گزشتہ صدی میں ندوۃ العلماء نے اس کی طرف توجہ اور کوشش شروع کر دی تھی جس کے اچھے نتائج سامنے آئے۔

ملک کے اندر قائم نظام تعلیم دو علیحدہ علیحدہ شعبوں میں منقسم رہتے ہوئے چل رہا ہے، ایک خالص دینی دوسرا خالص دنیاوی، اس کی وجہ سے امت کے تعلیم یافتہ دو الگ الگ راستوں پر چل رہے ہیں اور ایک دوسرے سے بعد رکھتے ہیں، بہر حال دونوں مختلف الجہت طبقوں کے درمیان تعاون اور قربت کی بھی ضرورت ہے، یہ ضرورت صرف مدارس عربیہ ہی کے ذریعہ پوری نہیں ہو سکتی ہے، اس کے لئے غیر دینی نظام کو اسلامی تقاضوں کا لحاظ کر کے دین و دنیا کو باہم یکجا کرنا ہوگا اور دینی مضامین کو اپنے نظام تعلیم میں جگہ دینی ہوگی اور چونکہ وہ تعداد کے لحاظ سے بہت بڑی تعداد میں ہیں اور ان کا اثر پڑ رہا ہے اس لئے ان کی اس کی طرف توجہ زیادہ مفید اور زیادہ وسیع اثر پیدا کرے گی جس کی اس امت کو ضرورت ہے، اس کے لئے عصری مدارس اور عصری

تعلیمی درسگاہوں کو ضروری حد تک اس کی طرف توجہ کرنی ہوگی اور اپنا طریقہ فکر بدلنا ہوگا، محض مدارس دینیہ میں عیب نکالنا اور عصری دانشگاہوں کی کمزوریوں کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا، اسلامی تعلیمات سے وابستہ رکھنے کے مضامین کو اپنے نظام تعلیم میں شامل کرنا ہوگا، تاکہ ان سے تعلیم حاصل کرنے والے اسلام کے عقیدہ و خیال سے وابستہ رہیں، اور مغربی فکر و خیال میں گم ہو کر ”درکان نمک نمک شد“ نہ ہو جائیں، یہی مدارس عربیہ اپنے نصاب میں سماجی اور بشری ضرورتوں سے واقف کرانے والے مضامین بھی شامل کریں، نیز ذرائع کی حد تک تعلیم کے نظم و انتظام کے جدید تجربوں سے حاصل طریقوں سے بھی فائدہ اٹھائیں کہ ”الحکمة ضالة المؤمن فاین وجدھا فهو احق بها“۔

دینی اور عصری تعلیم کے جامع اور ماہرین کہتے ہیں کہ یہ اس طرح ہو کہ دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے مذہبی علوم میں وسعت و پختگی میں کمی نہ آئے، تاکہ دینی اور اخلاقی ضرورتوں کے لئے امت کو برابر اچھے زہر ملتے رہیں، اور نصاب میں تغیر کی دعوت کے تعلق سے دونوں باتوں کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دینی مدارس کو اپنے نصاب تعلیم میں جدت لانے کی دعوت کی ضرورت اتنی نہیں جتنی کہ جدید تعلیمی نظام میں اسلامی تعلیمات کو داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ایسا نہ کرنے پر ملت اسلامیہ کو اپنے تشخص اور ثقافت و مذہبی قدروں سے دستبردار ہونا پڑے گا، لہذا اصلاح نصاب کی ضرورت سیکولر اداروں کے لئے زیادہ ہے، کیونکہ ان کی تعداد زیادہ ہے اور وہ امت کی نئی نسل کے اکثر افراد کی ذہنی و اخلاقی تشکیل کا کام انجام دیتے ہیں اور نئی نسل کے اکثر افراد ان ہی کی تعلیم و تفہیم کے ذریعہ اپنی زندگی کا <sup>مطمح</sup> نظر بناتے ہیں، ان اداروں کے ذمہ داروں کو اس کی طرف خصوصی توجہ کرنی چاہئے تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل کا مذہبی تشخص ختم نہ ہو اور وہ اپنے مذہب سے بالکل ناواقف نہ رہیں۔

رہا مسئلہ مدارس عربیہ میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کرنے کی ضرورت کا

تو اس کے لئے ضروری ہے کہ عربی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جائے، تاکہ طلبہ میں عربی زبان میں مہارت، پختگی اور رسوخ پیدا ہو اور وہ براہ راست مصادر شریعت سے استفادہ کر سکیں اور موجودہ دور میں عالم عربی میں عربی زبان میں جو نئی نئی تحقیقات اور معلومات آرہی ہیں ان سے مستفید ہو سکیں۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتیں ملحوظ رکھی جائیں تو بہتر ہوگا۔

۱۔ عربی زبان کو طریقہ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جائے۔

۲۔ اس کے لئے تجربہ کار اساتذہ اور اچھے طلبہ فراہم کئے جائیں اور زمانہ اور عصری تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے مفید نصاب تیار کیا جائے، اس لئے کہ ماہرین تعلیم و تربیت کا کہنا ہے کہ کوئی بھی تعلیمی نظام اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب اس میں یہ تینوں چیزیں موجود ہوتی ہیں، اگر ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے تو امید کر سکتے ہیں کہ تعلیم کا مطلوبہ مقصد حاصل ہو۔

۳۔ مروجہ نصاب میں بوجھ کو کم کیا جائے، جو مضامین وقت کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں ان کو کم کر دیا جائے اور وہ مضامین شامل کئے جائیں جو دینی اصول و مبادی اور اسلامی قدروں سے متصادم نہ ہوں اور زمانہ کی ضرورت اور تقاضہ کو پورا کرتے ہوں۔

۴۔ بسہولت اگر ممکن ہو سکے تو قرآن مجید اور حدیث نبوی کے متن اور نصوص کو براہ راست پڑھایا جائے، اور طلبہ کو عربی مصادر اور مراجع کے مطالعہ کا شوق دلایا جائے بلکہ ان پر زور ڈالا جائے کہ وہ عربی مصادر اور مآخذ ہی کی طرف رجوع کریں، اور ان میں علمی مسابقت اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے ترغیبی یا تربیتی ذرائع کا اہتمام کیا جائے۔

۵۔ طلبہ پر لازم کیا جائے کہ وہ خود سبق کی تیاری کریں اور درجہ میں بھرپور تیاری کے ساتھ آئیں، استاد نے اور رہنمائی کرے، اس طریقہ سے طلبہ میں خود اعتمادی اور تفکیر کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

۶۔ سبق ہونے کے بعد استاد طلبہ سے کہے کہ وہ پڑھے ہوئے سبق کی عربی میں تلخیص



پیش کریں یا نوٹ لکھ کر دکھائیں۔ اس سے مافی الضمیر کی ادائیگی کا سلیقہ پیدا ہوگا۔

۷۔ عربی انشاء اور تہرین کے سلسلہ میں تقلیدی اور بروایتی انداز ترک کر کے عصری انداز اختیار کیا جائے جو کسی بھی زبان کو سیکھنے کے لئے ضروری ہے، عربی انشاء میں مہارت اور قدرت رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ جس زبان کو سیکھنا چاہتے ہیں براہ راست اسی میں لکھایا جائے اور ترجمہ کا انداز نہ ہو، اور عناوین متنوع اور روزمرہ کی زندگی سے متعلق ہوں۔ عربی کے ممتاز ادیب اور نقاد عباس محمود العقاد نے اپنی سوانح حیات ”انا“ میں لکھا ہے کہ ”میں نے عربی انشاء اس طرح سیکھی کہ ہمارے استاد درجہ میں داخل ہوتے ہی کوئی موضوع دے دیتے اور برجستہ اس پر لکھنے کا مطالبہ کرتے، اس سے ذہن پر زور پڑتا اور مطلوبہ موضوع کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے مضمون لکھنا پڑتا، اس کے نتیجہ میں مختلف اور متنوع موضوعات پر لکھنے اور تفکیر کی صلاحیت پیدا ہوئی۔“ اس طریقہ سے طالب علم کے اندر متنوع موضوعات پر برجستہ لکھنے اور تفکیر کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

۸۔ عربی زبان کو سیکھنے کے لئے عربی اخبارات، جرائد اور مجلات کا مطالعہ لازمی کیا جائے، اس لئے کہ عربی اخبارات و رسائل میں انسانی زندگی کے متنوع مسائل، نئے حالات و واقعات اور نئی ایجادات اور آلات سے متعلق الفاظ مل جاتے ہیں، جو لغت میں نہیں ملتے اور ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ رائج زبان سے واقفیت ہوتی ہے، اس لئے کہ اگر کوئی شخص رائج زبان نہیں جانتا تو اس کی بات قابل اعتناء نہیں سمجھی جاتی۔

۹۔ طلبہ میں عربی زبان میں لکھنے اور بولنے کے لئے ہفتہ، یا پندرہ دن یا مہینہ میں کسی علمی اور ثقافتی موضوع پر ورکشاپ کرایا جائے اس میں طلبہ متعینہ موضوع پر کسی استاد کی نگرانی میں تیاری کریں اور پھر نقاش ہو، اس سے گفتگو اور بات کہنے کا سلیقہ آئے گا۔

۱۰۔ طلبہ پر لازم کیا جائے کہ وہ آپس میں گفتگو عربی زبان ہی میں کریں۔

۱۱- عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ وہ طلبہ جو سال بھر تساہلی برتتے ہیں اور محنت نہیں کرتے، امتحان قریب آتے ہی وہ بھی محنت کرنے لگتے ہیں اور امتحان میں فیل ہو جانے کا خوف ستانے لگتا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر امتحان کے نظام کو اور منظم اور سخت کر دیا جائے تو اچھے نتائج برآمد ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ یہودیوں کے یہاں نظام تعلیم میں اس بات کا سخت التزام کیا جاتا ہے کہ یہودی طلبہ کے لئے امتحان میں پاس ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر مضمون میں 95% نمبر لائیں، بصورت دیگر انہیں آگے کی تعلیم سے روک دیا جاتا ہے، اس کی وجہ سے وہ سخت محنت کرتے ہیں اور سارا وقت مطالعہ اور تعلیم میں صرف کرتے ہیں اور غیر یہودی طلبہ کو کم مارکس لانے کے باوجود آگے بڑھا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ بغیر علمی صلاحیت کے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور فارغ ہونے کے بعد بالکل تہی دست ہوتے ہیں اور پھر زندگی میں حاشیہ پر چلے جاتے ہیں، یہ بات محتاج بیان نہیں کہ آج دنیا میں ذہانت اور علم میں سب سے ممتاز یہودی ہی ہیں۔ اور موجودہ دور میں مسلمانوں کو جس یلغار کا سامنا ہے وہ علم کے ہی راستہ سے کی جا رہی ہے۔

۱۲- اگر اساتذہ کی علمی استعداد اور ان کے اختصاص اور رجحانات کا لحاظ کرتے ہوئے اسباق ان کے ذمہ کئے جائیں تو زیادہ مفید ہوگا، اسی طرح ابتدائی تعلیم کی پختگی اور عمدگی کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے۔

۱۳- مرحلہ وار عربی زبان کا مطالعہ کرایا جائے۔ اس سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ زبان ہی ادب تک پہنچاتی ہے اور علم تک بھی، کردار و ثقافت تک بھی، اخلاق و دین تک بھی، اس لئے زبان کی تعلیم و نصاب میں اس کا اہتمام کرنا ضروری ہوتا ہے، کہ وہ صحیح سمت لئے جائے اور پسندیدہ کردار تک پہنچائے، زبان کی کتابوں کی تصنیف میں اور زبان کے نصاب کے لئے کتابوں کے انتخاب میں اس پہلو کی طرف توجہ دینا نہ صرف زبان کے موضوع کی

بات ہے بلکہ اخلاق و نفاست، دین و کردار سب کی بات ہے۔ اس سلسلہ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا عربی سلسلہ القراءۃ الراشدہ، قصص النبیین، قصص من التاريخ الاسلامی، مختارات من ادب العرب، اذہبت ریح الایمان، علی طنطاوی کی تحریریں، منفلوطی کی تحریریں، مصطفیٰ صادق الرافی کی تحریریں، جوڈۃ السحار اور عطیہ الابرار کی عربی قصے، ڈاکٹر عبد الرحمن رافت پاشا کی تحریریں، کامل کیلانی کا سلسلہ ”القصص العربیہ“ علامہ سید سلیمان ندوی کی ”لغات جدیدہ“ مولانا عبد السلام قدوائی کی تصنیف ”عربی کے دس سبق“ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی کتاب ”منشورات“ اور مولانا وحید الزماں کیرانوی کی ”نکتۃ الادب“ سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اور اسلام کو درپیش خطرات کے مقابلہ کے لئے ہمیں ایسے جامع افراد کی ضرورت ہے جو دنیا کے مختلف حصوں میں تعلیم و تربیت اور دعوت و تحریک کا کام انجام دے سکیں اور میدان میں نکل کر مقابلہ کی صلاحیت کے ساتھ اسلام کی خدمت انجام دے سکیں اور ایسا اس وقت ممکن ہے جب کہ ایک ایسا تعلیمی، تربیتی اور ثقافتی نظام مرتب کیا جائے جو قدیم و جدید کا جامع ہو، جس میں سمٹنے کے بجائے پھیلنے کی صلاحیت ہو، جس کے فارغین دعوتی جذبہ، علمی صلاحیت، عصری واقفیت اور خود اعتمادی کے ساتھ مسجد، مدرسہ ہی نہیں، بلکہ زندگی کے ہر گوشہ میں دعوت اسلام کا کام انجام دیں، اس کے لئے ہمیں اپنے تعلیمی اور تربیتی نظام کی از سر نو تنظیم کرنی ہوگی۔



پچھٹا باب  
مدارس میں ریسرچ و تحقیق





## دینی مدارس کے شعبہائے اختصاص میں ریسرچ و تحقیق

مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی ☆

نبوی نظام تعلیم میں اختصاص کی اہمیت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی و تربیتی نظام میں ”بنیادی اور عمومی مرحلہ“ کی تعلیم فرض کے درجہ میں ہے طلب العلم فریضة علی کل مسلم (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 220، باب فضل العلم والحث علی طلب العلم)۔ اسی طرح کسی خاص فن میں ”اختصاص و تخصص“ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فلولوا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیستفقہوا فی الدین (التوبہ: 122) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ”تفقہ فی الدین“ کی دعا دی ہے۔ اللہم فقہہ فی الدین (صحیح البخاری، حدیث نمبر 140 باب وضع الماء عند الخلاء)، یہی روایت مسند احمد بن حنبل میں اس اضافہ کے ساتھ نقل کی گئی ہے: وعلمہ التأویل (حدیث نمبر 2274، مسند عبداللہ بن عباس)، جس سے تفسیر اور علوم قرآن میں تخصص کی اہمیت کی طرف اشارہ ملتا ہے، منصب امامت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو زیادہ موزوں قرار دیا جو علوم قرأت سے گہری واقفیت رکھتے ہوں، یومکم اقراکم (سنن ابی داؤد حدیث نمبر 495، باب من احق بالامامة)۔

اور اسی روایت کو بعض لوگوں نے یوں بھی نقل کیا ہے فلیؤمہم اعلمہم بالسنة

☆ استاذ شعبہ حدیث وفقہ المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد، مشیر شرعی: منصف سلاویٹ T.V

(مستخرج ابی عوانہ، حدیث نمبر 1071، بیان ما يستحق به الرجل الامامة، نیز دیکھئے صحیح ابن خزیمہ، حدیث نمبر 1427، باب ذکر احق الناس بالامامة)، ان دونوں روایتوں سے حفظ، علوم قرأت اور سنن و احادیث میں اختصاص کی طرف اشارہ ملتا ہے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اہل اختصاص کو خود اپنے علم کی روشنی میں رائے قائم کرنے کی بھی تلقین کی ہے، قال انتم اعلم بامور دنیا کم (صحیح مسلم، حدیث نمبر 4358، باب وجوب امثال ما قاله شرعا دون ما ذکرہ)۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی درس گاہ و دانش گاہ سے تربیت یافتہ افراد ہر دو طرح کے تھے، بعض اصحاب فضل وہ تھے جو بنیادی یا عمومی مرحلہ کی تعلیم پر اکتفا کرتے تھے اور ایسے ہی لوگوں کی کثرت تھی، اور دوسرے وہ صحابہ بھی تھے جو کسب خاص فن کے متخصّص شمار کئے جاتے تھے، عمرو بن سلمہؓ فرماتے ہیں کہ میری قوم میں قرآن سب سے زیادہ مجھے یاد تھا و کنت اقراہم (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 495) باب فی من احق بالامامة، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: صحابہ میں سب سے زیادہ علوم قرآن سے واقفیت مجھے تھی، واللہ لقد علم اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم انی من اعلمهم بکتاب اللہ وما انا بخیرهم (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4616، باب القراء من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحیح مسلم، حدیث نمبر 4502)۔ حضرت ابو ہریرہؓ حفظ و روایت حدیث کے لیے، اور حضرت عائشہؓ روایت و درایت حدیث نیز نقد متون کے لیے، اسی طرح خود حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ خواتین سے متعلق احکام شریعت کے لیے صحابہ میں شہرت اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ عظیم و تدبیر اور سیاست شرعیہ کے لیے تمام صحابہ میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے، سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اصول و مقاصد شرع میں گہرائی و گیرائی رکھتے تھے، اور احکام شریعت کی تطبیق میں پیش پیش رہتے تھے، کان و قافا عند کتاب اللہ (صحیح البخاری،

حدیث نمبر: 4276) حضرت علی بن ابی طالبؓ امور قضاء کے مخصص شمار کئے جاتے تھے، وکان اقضاهم علی۔

اور حضرت زید بن ثابتؓ صحابہ میں علم فرائض و میراث کے لیے شہرت رکھتے تھے، عہد صحابہ اور اس کے بعد بھی یہ اختصاصی ذوق باقی رہا، بلکہ پروان چڑھتا گیا، محدثین صحابہ مستقل شمار کئے گئے، اور فقہاء اصحاب کی الگ فہرست تیار ہوئی، قراء و مفسرین ان کے علاوہ تھے، اسی طرح سیاست و امور حکومت، نیز جہاد و جنگی امور سے متعلق بھی ماہر افراد ہوا کرتے تھے، جن کی تفصیل طبقات صحابہ اور رجال و سیر کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر میدان و مجال کے لیے ماہر فن اور امتیازی صلاحیت کے حامل افراد تیار کئے تھے اور امت کو یہ درس دیا تھا کہ علوم و فنون کی مختلف شاخوں میں باصلاحیت اور مخصص افراد کار تیار کئے جائیں۔

### دینی مدارس میں شعبہائے اختصاص کا قیام

ہندوستان میں مروج دینی مدارس کا نظام کم و بیش ڈیڑھ سو سالہ قدیم ہے، مجموعی طور پر ان مدارس میں دو نصاب نظام تعلیم جاری ہیں؛ نصاب تعلیم کا ایک طرز تصور وہ ہے جو ”درس نظامی“ پر مبنی ہے، دارالعلوم دیوبند اور اس سے وابستہ مدرسے اسی طریقہ کار کے تابع ہیں اور دوسرا نظام وہ ہے جو ”ندوۃ العلماء“ کا پیش کردہ ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء، اس سے ملحق ادارے، نیز جماعت اسلامی و جماعت اہل حدیث سے وابستہ دینی تعلیمی ادارے بھی۔ جزوی ترمیم کے ساتھ۔ اسی نصاب کے تابع ہیں۔

ان دونوں نظام تعلیم میں طلبہ کی بڑھتی ہوئی ”تعداد“ اور زوال پزیر ”استعداد“ کو پیش نظر رکھتے ہوئے علوم اسلامی کی مختلف شاخوں میں تکمیل و اختصاص کے شعبے قائم کئے گئے ہیں، چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں دورہ حدیث کے بعد غالباً سب سے پہلے ”شعبہ تدریس افتاء“ کا قیام عمل میں لایا گیا، اسی طرح تکمیل تفسیر اور تکمیل ادب کے شعبے بھی قائم کئے گئے اور اب ماضی



قریب میں تخصّص فی الحدیث کی بھی ابتداء کی گئی ہے، یہاں خاص طور پر شعبہ تخصّص فی الحدیث میں علمی موضوعات پر مقالے تحریر کروائے جاتے ہیں، اسی طرح تخریج و دراسہ کا کام بھی طلباء سے لیا جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند ہی کے طرز پر جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور میں شعبہائے تخصّص کام کر رہے ہیں، اور یہاں کا شعبہ حدیث خاص طور پر قابل ذکر ہے اور اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔ ظاہر ہے اس مرحلہ تکمیل و اختصاص کی تعلیم ہر طالب علم پر ضروری نہیں ہے؛ بلکہ طالب علم کسی فن یا موضوع سے خاص رغبت و دلچسپی کی بنیاد پر ان شعبوں میں داخلہ لیتا ہے اور علمی تشنگی کو دور کرتا ہے، اور یہ بات کسی طرح مناسب بھی نہیں ہوگی کہ طالب علم کی صلاحیت و استعداد کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں شعبہائے اختصاص میں داخلہ دے دیا جائے۔

اسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم میں جو کہ مجموعی طور پر ۷ سال پر مشتمل ہے۔ فضیلت کے دو سال تخصّص کے طور پر رکھے گئے ہیں، جس میں تفسیر، حدیث، فقہ، دعوت اور ادب میں سے کسی بھی مضمون میں تخصّص کیا جاسکتا ہے، ملحوظ رہے کہ فضیلت کے اس مرحلہ کو ”دراسات علیا“ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، فضیلت کے بعد یک سالہ اور بھی تین کورس المعهد العالی للإفتاء والقضاء، المعهد العالی للدعوة والفکر الاسلامی اور کلیۃ الدعوة والإعلام کے نام سے متعارف کرائے گئے ہیں اور ان سب کی حیثیت شعبہائے اختصاص کی ہے، اور طلباء کو لازمی طور پر کسی موضوع پر مقالہ پیش کرنا ہوتا ہے، یا کسی مخطوطہ تحقیق و تعلیق کا کام کرنا ہوتا ہے۔

تصنیف و تالیف کی تربیت، باصلاحیت افراد کار کی تیاری نیز علوم اسلامی کے مختلف شعبوں میں متخصصین فراہم کرنے کے لیے ”ہندوستان میں ایک اہم اور نمایاں نام المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد کا ہے، جس کا نصاب تعلیم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنے تدریسی

تجربہ و علمی بصیرت، نیز مختلف شعبوں کے متخصص اہل علم کے مشورہ سے تیار کیا ہے، اسی طرح اس کی تدوین میں عالم اسلام کی ممتاز جامعات کے نصاب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ معہد کے شعبہائے اختصاص؛ حدیث، فقہ، دعوت، انگریزی زبان، نیز اقتصاد اسلامی پر مشتمل ہیں، دو سالہ نصاب تعلیم ہے، سال اول میں اختصاصی مضامین پڑھائے جاتے ہیں، اور سال دوم میں ان طلبہ سے ان کے اختصاص کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی موضوع پر مقالہ تحریر کروایا جاتا ہے، یا کسی مخطوطہ کی تحقیق ان کے ذمہ کی جاتی ہے۔

فقہ وقضاء میں اختصاص کے لیے پورے ملک میں ایک باوقار نام المعہد العالی للقضاء والافتاء پٹنہ بہار کا بھی ہے، جس کا نصاب تعلیم مجتہدانہ بصیرت کے حامل فقیہ اور اسلامی نظام قضاء کے شہسوار حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے ترتیب دیا تھا، جو کہ اب بھی جزوی ترمیم کے ساتھ باقی ہے، یہاں بھی دو سالہ کورس ہے، سال دوم میں طلبہ لازمی طور پر سندھی مقالہ پیش کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ کچھ نئے ادارے ملک کے مختلف حصوں میں کام کر رہے ہیں، اور یہ سب مجموعی طور پر اپنی کیفیت و نوعیت کے اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔

### شعبہائے اختصاص میں علمی و تحقیقی کام

دینی مدارس کے تعلیمی مراحل پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ”تخصصات“ کا یہ مرحلہ، عالم عربی کی جامعات، یا خود ملک کی عصری جامعات کے مرحلہ ماجستیر (ایم، اے) کے مساوی ہے، نامور عالم دین اور ولولہ انگیز خطیب مولانا سید سلمان حسینی ندوی نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

”اسی دور میں اور خاص طور پر ۱۹۸۱، ۸۲ء میں مقالات فضیلت کے

معیار کو عالم عربی کے معیار ماجستیر (ایم، اے) کے مقالات کے مساوی

کرنے کی کوشش کی گئی“ (ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو، ۱۸۶)۔

بلاشبہ ”تخصصات“ کا مقصد طالب علم میں کسی فن کے تئیں علمی تبحر، تصنیف و تالیف کی لیاقت، بحث و تحقیق کی صلاحیت، رائے قائم کرنے کی اہلیت اور خود اس فن کے مصادر و مراجع سے گہری واقفیت پیدا کرنا ہوتا ہے، اسی طرح قدیم علمی ورثہ کو نئے رنگ و آہنگ میں پیش کرنے کا سلیقہ اور جدید علمی انکشافات کو پیش کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوتا ہے، اگر تخصصات کے ان مقالوں میں یہ کیفیت نہیں پائی جاتی ہے، تو انہیں علمی و تحقیقی رسائل کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے، تصنیف و تالیف کے دائرے میں ان کا شمار تو کیا جاسکتا ہے؛ مگر بحث و تحقیق کے زمرہ میں نہیں۔

ہندوستان میں شعبہائے اختصاص کے تحت جو علمی و تحقیقی کام ہو رہا ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے، اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کی جانی چاہیے کیوں کہ یہ اس تحریک کا آغاز ہے اور ایک نئی طرح کی ابتداء ہے۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مقالوں میں معیار اور ”منہج“ دونوں پر خوب توجہ دینی جائے، اور بحث و تحقیق کے جو عصری اور عالمی اصول ہیں ان پر عمل کیا جائے۔

راقم الحروف نے اس مقالہ کی ترتیب کے دوران، ہندوستان کے مختلف اداروں کے شعبہائے تخصص کے تحت ترتیب شدہ مقالات کا جائزہ لیا ہے اور جن اہم علمی و منہجی غلطیوں پر نگاہ پڑی ہے وہ ذیل میں ذکر کی جا رہی ہیں:

(۱) عربی بلکہ خود اردو مقالوں میں بھی زبان و بیان کی غلطیوں کا پایا جاتا۔

(۲) احادیث کی تخریج اور مسائل فقہیہ کی توثیق میں اصل مصادر کے بجائے ثانوی

مصادر سے استفادہ، اور بسا اوقات غیر متعلقہ کتابوں پر اعتماد۔

(۳) موضوعیت کا فقدان۔

(۴) علمی و تحقیقی رنگ کا فقدان۔

(۵) خطۃ البحث کے بغیر ہی مقالے تحریر کرنے کا رجحان۔

(۶) محدثین و فقہاء کی بعض خاص مصطلحات کو سمجھے بغیر ہی ان کی تعبیر و تشریح کرنا۔

(۷) عربی عبارتوں کے ترجمہ میں حد درجہ تساہل اور فحش غلطیوں کا ارتکاب۔

(۸) احادیث سے استدلال میں ان کی صحت و ضعف کو نظر انداز کیا جانا۔

(۹) غیر علمی و تحقیقی موضوعات کو بحث و تحقیق کا موضوع بنانا۔

(۱۰) موضوع سے متعلق تمام جہتوں کا مقالہ میں شامل نہیں کیا جانا۔

اگر ان باتوں کو بغور دیکھا جائے اور ان کوتاہیوں کا جائزہ لیا جائے، تو بنیادی طور پر ان

کے چار اسباب نظر آتے ہیں:

(۱) ہمارے ان اداروں میں عام طور پر مناجح البحث و تحقیق کے موضوع کو نہیں پڑھایا

جاتا ہے، جس کی وجہ کر طلبہ سے اس طرح کی غلطیوں کا ارتکاب فطری ہے، راقم الحروف کی

سفارش پر المعبد العالی الاسلامی حیدرآباد میں سال دوم کے طلبہ کے لیے لازمی مضمون کی حیثیت

سے، ایک سال قبل اس مادہ کا اضافہ کیا گیا ہے، اور اس کی تدریس بھی مجھ ہی سے وابستہ کی گئی

ہے، تجربہ یہ ہے کہ طلباء بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس مضمون کو پڑھتے بھی ہیں اور اس سے

مقالہ نویسی میں فائدہ بھی محسوس کرتے ہیں۔

(۲) ایسے علمی نگراں اور مشرفین کی کمی یا فقدان؛ جو ان مقررہ مضامین کے مختص

ہوں۔ اور اگر کہیں مشرفین موجود بھی ہوتے ہیں تو وہ محض رسمی اشراف انجام دیتے ہیں، مکمل علمی

اشراف کا فقدان ہوتا ہے، جب کہ ”علمی رسائل“ دراصل مشترکہ طور پر بحث اور مشرف کے علمی

و تحقیقی ذوق کا مظہر اور مشترک محنت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

(۳) ہمارے تعلیمی نظام میں تخصصات سے پہلے عام طور پر علمی موضوعات پر لکھنے کی



مشق نہیں کرائی جاتی ہے، تخصصات میں آکر ہی طالب علم پہلی مرتبہ ان موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے، جس کا راست اثر اس مقالہ کی علمی حیثیت و کیفیت پر پڑتا ہے۔

(۴) اسی طرح بسا اوقات نا اہل طلباء کو تخصصات میں داخلہ دینے کی وجہ سے بھی ان مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تجاویز و اقتراحات:

(۱) منہج البحث و تحقیق کو بحیثیت مضمون خصوصی شعبہائے اختصاص میں داخل کیا جائے۔

(۲) مختص مشرفین کے تحت مقالے لکھوائے جائیں۔

(۳) مشرف کی تدریسی مصروفیات اور علمی انہماک کو ملحوظ رکھتے ہوئے اتنے ہی طلبہ کا

اشراف سپرد کیا جائے جن کی واقعی نگرانی ممکن ہو۔

(۴) مشرفین کے لیے ”بدل اشراف“ مقرر کیا جائے؛ تاکہ دلجمعی اور توجہ کے ساتھ

یہ ذمہ داری انجام دی جاسکے۔

(۵) باصلاحیت طلبہ ہی سے مقالے تحریر کروائے جائیں اور جو طلبہ لکھنے پڑھنے میں کمزور

ہوں ان سے تخصص کے مقالوں کے بجائے بحث تکمیلی لکھوا کر ڈپلوما وغیرہ کی سند دے دی جائے۔

(۶) موضوعات کے انتخاب سے پہلے مختلف جامعات سے رابطہ کیا جائے، تاکہ کام کا

تکرار اور محنت کا ضیاع نہ ہو۔

(۷) مقالوں کا علمی مناقشہ بھی ہونا چاہیے اور اس میں جو مقالے علمی و تحقیقی معیار پر

اترتے ہوں، ان کی طباعت کا نظم خود ادارہ کرے، تاکہ طلبہ و باحثین کی حوصلہ افزائی ہو۔

(۸) مخطوطات کی تحقیق کا کام نہایت نازک ہے، اس کے لیے نو تربیت یافتہ طلبہ کے

بجائے باصلاحیت اور علمی تجربہ رکھنے والے افراد ہی سے کام لیا جائے۔

هذا وصلى الله على نبينا محمد وبارك وسلم

☆☆☆

ساتواں باب

مدارس کی اسناد اور مقابلہ جاتی امتحانات



## یونیورسٹی میں مدارس کی اسناد کا معاملہ

☆ پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی ☆

ایک زمانہ تھا جب مدارس کے فضلاء اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں کا رخ کرتے تھے تو ان کو از سر نو ہائی اسکول سے لیکر اعلیٰ درجات کی تعلیم اور امتحان کے مراحل سے گزرنا پڑتا تھا، تعلیم کے یہ دونوں دھارے مشرقی اور عصری دوستوں میں بہتے اور طلباء کو دونوں دھاروں سے استفادہ کرنے کے لیے وقت اور مصارف خرچ کرنا پڑتا اور مشکلات سے گزرنا پڑتا تھا، مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ یونیورسٹیوں نے اپنے ضابطہ تعلیم میں نرمی کی اور عصری تعلیم کا دروازہ روایتی دینی درسگاہوں کے فارغین کے لیے کھولا، اور آج یہ وقت آیا ہے کہ یونیورسٹیوں میں بالخصوص مسلمانوں سے تعلق رکھنے والی یونیورسٹیوں میں ایک معقول تعداد مدارس کے فضلاء کی پائی جاتی ہے، بعض یونیورسٹی میں عربی، دینیات اور اسلامیات کے شعبے مدارس کے فضلاء سے بھرے ہوئے ہیں بلکہ ان شعبوں کی سربراہی جو اساتذہ کر رہے ہیں ان میں بہت سے فضلاء مدارس ہیں یونیورسٹیوں کی اس پالیسی کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ سرکاری ملازمتوں کے دروازے بھی مدارس کے فضلاء کے لیے کھلے ہیں، غالباً اسی وجہ سے مدارس سے یونیورسٹی کی طرف رخ کرنے والے فضلاء کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے، مدارس کی بڑی تعداد یونیورسٹیوں کو اپنی تعلیمی اسناد کے معاملہ کی درخواست دے رہی ہے اور یونیورسٹیاں اپنی تعلیمی پالیسی، گنجائش اور سہولت کے لحاظ سے ان کو منظوری بھی عطا کر رہی ہیں، ان میں کشمیر یونیورسٹی، کالی کٹ یونیورسٹی، ☆ سابق ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔



ہمدرد یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ یونیورسٹیوں میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے زیادہ سے زیادہ مدارس کو منظوری دی ہے اور مدارس کے زیادہ سے زیادہ فضلاء کو تعلیمی، تدریسی اور ملازمت کی مراعات فراہم کی ہیں۔ اب تک تقریباً پچاس مدارس کی اسناد کو یونیورسٹی نے منظوری دی ہے اور اتنی ہی تعداد میں معادلہ کی درخواستیں مدارس کی طرف سے یونیورسٹی کو موصول ہوئی ہیں جو زیر غور ہیں۔ تدریسی اور غیر تدریسی ملازمین میں ایک بڑی تعداد مدارس کے فضلاء کی موجود ہے۔ اب سے کوئی ۳۵ سال پہلے یعنی ۱۹۷۷ء میں جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو درخواست دی کہ اس کی عالمیت اور فضیلت کی ڈگری کو یونیورسٹی کے مختلف کورسوں میں داخلہ کے لیے منظوری عطا کی جائے، درخواست کے ساتھ مدرسہ کا نصاب تعلیم اور ضروری معلومات بھی ارسال کی گئی تھیں۔ یونیورسٹی نے اس درخواست کو اپنی اعلیٰ تعلیمی باڈی اکیڈمک کونسل کے سامنے پیش کیا، اکیڈمک کونسل نے جامعۃ الفلاح کے نصاب و نظام تعلیم معیار تعلیم اور طریقہ امتحانات وغیرہ کو سامنے رکھ کر حسب ذیل فیصلہ صادر کیا۔

”جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کے امتحان عالمیت کو پری یونیورسٹی (انٹرمیڈیٹ) کے مساوی تسلیم کرتے ہوئے بی اے آنرز فرسٹ سمسٹر میں داخلہ دیا جائے۔ سوائے انگلش مضمون خاص کے۔ اس ڈگری کے حامل امیدواروں کو بی یو ایم ایس کے داخلہ امتحان میں بھی بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔“

غالباً مدارس کے ذمہ داروں کی طرف سے یہ پہلی درخواست تھی جو اے ایم یو کو موصول ہوئی اور یونیورسٹی نے کشادگی اور ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو منظوری عطا کی، اس کے بعد یونیورسٹی میں مدارس کی اسناد کے معادلہ کا دروازہ کھل گیا۔ دوسری درخواست اعظم گڑھ ہی سے مدرسۃ الاصلاح سرانے میر کی موصول ہوئی اور یونیورسٹی نے اس مدرسہ کی فضیلت کی سند کو پری یونیورسٹی (انٹر) کے مساوی تسلیم کرتے ہوئے بی اے میں داخلہ کا مجاز قرار دیا۔ چونکہ یہ مدرسہ

عالمیت کی سند نہیں دیتا تھا اس لیے اس کی فضیلت کی سند کو بی اے میں داخلہ کے لیے منظور کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے مرکزی اداروں نے معادلہ کی درخواست نہیں دی، لیکن ۸۱-۸۲ء میں جب مدارس کی اسناد پر معادلہ کے لئے غور ہوا تو اس وقت کے وائس چانسلر جناب سید حامد نے ان مدارس کی فضیلت کی سند کو بھی ایم اے عربی اور ایم ٹی ایچ، وپری طب کے لیے منظوری دی اور یہ کہا کہ یہ معروف مدارس ہیں ان کی دینی خدمات اور تعلیمی معیار سے لوگ واقف ہیں لہذا ان کو درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے بشرطیکہ وہ فضلاء انگلش کا امتحان ساتھ ہی پاس کریں۔ سید صاحب نے مدارس کی اسناد کو منظور کرنے کے لیے فراخ دلانہ پالیسی اپنائی، ان کا کہنا تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹی میں فضلاء مدارس کے لئے دروازہ کھولنا نہ صرف ان فضلاء کے لیے مفید ہوگا بلکہ یونیورسٹی کا عمومی ماحول بھی بہتر ہوگا کیونکہ یہ حضرات ریاضت اور محنت کے عادی ہوتے ہیں اور اچھی تربیت و سیرت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وائس چانسلر موصوف نے ایک معادلہ کمیٹی بھی تشکیل دی۔

اسی تعلیمی پالیسی کے تحت راقم نے ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی کے شعبہ سنی دینیات سے ایم ٹی ایچ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا، پھر پی ایچ ڈی میں داخلہ ملا اور پھر اسی شعبہ میں ملازمت دی گئی۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مدارس نے اپنی اسناد یونیورسٹی کو معادلہ اور منظوری کے لیے ارسال کرنی شروع کر دیں۔ ان کی درخواستیں معادلہ کمیٹی کے سپرد کر دی جاتیں جو ان کے نصاب تعلیم، میعاد تعلیم اور طریقہ امتحان وغیرہ پر غور کر کے اپنی سفارش وائس چانسلر صاحب کو پیش کرتی۔

۶ فروری ۱۹۸۵ء میں معادلہ کمیٹی کی باضابطہ میٹنگ منعقد ہوئی جس کی صدارت خود وائس چانسلر صاحب نے فرمائی۔ معادلہ کمیٹی کی اس میٹنگ میں یونیورسٹی کے علوم شرقیہ کے شعبوں کے صدور کے علاوہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے مولانا محمد رابع ندوی، اعظم گڑھ سے مولانا ابو

الحسن فاروقی، مولانا مظفر احسن اصلاحی، اور مولانا عبد الحسیب اصلاحی نے شرکت فرمائی۔ یہ حضرات مدعوئے خصوصی کے طور پر بلائے گئے تھے۔

اس کمیٹی نے مدارس کے نظام و نصاب، میعاد اور طریقہ امتحان وغیرہ کو سامنے رکھ کر ان کورسوں کا تعین کیا جن میں ان مدارس کے فضلاء کو داخلہ دیا جاسکتا تھا۔ نیز ان کی اسناد کا درجہ بھی متعین کیا گیا، کمیٹی نے حسب ذیل سفارشات پیش کیں۔

۱- مدرسۃ الاصلاح کی سند فضیلت کو پری یونیورسٹی کے مساوی تسلیم کر کے بی اے میں داخلہ کی جواز ت دی گئی تھی، اسے منسوخ کیا جاتا ہے، اب یہ سند بی اے کے مساوی تسلیم کی جائے گی اور ایم اے میں داخلہ دیا جائے گا۔

۲- فضیلت کی جملہ اسناد کو بی اے کے مساوی تسلیم کر کے ان کے حاملین کو ایم اے عربی اور ایم ٹی ایچ، میں داخلہ دیا جائے گا۔

۳- فضیلت کی سند کے حاملین کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ایم اے یا ایم ٹی ایچ کے ساتھ سینئر سکندری سطح کا صرف انگلش کا امتحان پاس کریں۔

۴- معادلہ کے لیے مدارس سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور کرنے کے لیے وائس چانسلر صاحب کو اختیار دیا گیا کہ وہ ممتاز علماء کرام، شعبہ عربی و شعبہ دینیات اور پروفیسر محمد تقی امینی پر مشتمل ذیلی کمیٹی بنادیں جو ان مدارس کی اسناد اور تعلیمی نظام کو دیکھ کر ان کورسوں کی نشاندہی کریں جن میں ان کو داخلہ دیا جاسکتا ہے۔

واضح رہے کہ یونیورسٹی کے اندر دو درجن سے زائد مساجد میں امام اور مؤذن کی تقرری کے لیے مدارس کی فضیلت کی اسناد کو منظوری پہلے سے حاصل تھی، نئے ضابطہ سے یہ خطرہ ہوا کہ اب یہ اسناد امامت کی ملازمت کے لیے غیر مقبول ہو جائے گی، اس لیے وائس چانسلر صاحب نے وضاحت کی کہ اس ضابطہ کا امامت وغیرہ کی ملازمت پر اثر نہیں ہوگا۔

یونیورسٹی اکیڈمک کونسل نے مدارس کے نصاب و امتحان وغیرہ کا جائزہ لیکر یونیورسٹی کے مختلف کورسوں میں داخلہ کے لیے جوذیلی کمیٹی بنائی، اس کی میٹنگ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ہوئی اور حسب ذیل سفارشات کی گئیں۔

مختلف مدارس کی درخواستوں پر یونیورسٹی کے مختلف کورسوں میں داخلہ دینے کے لیے غور و خوض کیا گیا، اور طے کیا گیا کہ مدارس کی عالمیت کی سند کو سینٹر سکندری کے مساوی تسلیم کر کے بی اے میں داخلہ دیا جائے بشرطیکہ عالمیت کا کورس کم از کم بارہ سالوں پر مشتمل ہو۔

مدارس کی فضیلت کی سند کو بی اے کے مساوی تسلیم کر کے ایم اے عربی اور ایم ٹی ایچ میں داخلہ دیا جائے بشرطیکہ داخلہ لینے والے طلباء کے ساتھ ہی صرف انگلش کا امتحان سینٹر سکندری سطح کا پاس کر لیں۔ عالمیت کا انٹر کے مساوی ہونا اور فضیلت کا بی اے کے مساوی ہونا متفقہ اصول بن گیا۔ جن مدارس کی فضیلت کی سند کو ایم اے اور ایم ٹی ایچ کے لیے منظوری دی گئی وہ حسب ذیل ہیں:

۱- جامعہ سلفیہ بنارس

۲- دارالعلوم تاج المساجد بھوپال

۳- دارالعلوم دیوبند

۴- مدرسہ عالیہ کلکتہ

اس کے بعد مدارس کی درخواستیں موصول ہوتی رہیں اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد ان کو منظوری دی جاتی رہی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر قاضی مجاہد الاسلام علیہ الرحمہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے ایک مرتبہ علی گڑھ تشریف لائے اور راقم کو بلایا اور فرمایا کہ مدارس سے فارغ ہونے والے بعض طلباء بہت ذہین ہوتے ہیں اور بحث و تحقیق کا ذوق رکھتے ہیں۔ بعض تصنیف و تالیف



بھی کرتے ہیں، ان کی صلاحیت کے پیش نظر یونیورسٹی میں ان کو پی ایچ ڈی میں داخلہ ملنا چاہئے۔ راقم نے عرض کیا کہ یونیورسٹی کے ضابطہ کے مطابق ایک ہی سند ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں کورس کے لیے منظور نہیں کی جاسکتی۔ فضیلت کی سند کو یونیورسٹی نے بی اے کے مساوی تسلیم کر کے ایم اے میں داخلہ کا مجاز قرار دیا ہے۔ لہذا پی ایچ ڈی میں فضیلت کی سند پر داخلہ دینا خلاف ضابطہ ہوگا۔ راقم نے مزید عرض کیا کہ ایک شکل ہو سکتی ہے کہ جو طلباء فضیلت کے بعد تخصص کر کے آئیں ان کو مدارس فضیلت اور تخصص کی سند عطا کرے اور یونیورسٹی تخصص کی سند کو ایم اے کے مساوی تسلیم کر کے ایم فل میں داخلہ کے لیے منظور کرے۔ ایم فل، پی ایچ ڈی کی پہلی منزل ہوتی ہے، کہیں دونوں میں ایک ساتھ داخلہ ہوتا ہے اور کہیں پہلے ایم فل میں اور اس کی تکمیل کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ قاضی صاحب کو یہ تجویز پسند آئی مگر اہل مدارس کی طرف سے کوئی پہل نہ ہوئی اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔

۲۰۰۶ء میں شعبہ سنی دینیات میں مدارس اسلامیہ اور عصری تقاضے کے عنوان سے ایک قومی سمینار منعقد کیا گیا۔ جس میں مختلف مکاتب فکر کے اہل مدارس نے شرکت فرمائی۔ بالخصوص مولانا سعید الرحمان اعظمی (مہتمم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، مولانا عبد اللہ مغیشی اجراہ، مولانا لقمان سلفی (جامعہ ابن تیمیہ، چمپارن، حال مقیم ریاض)، مولانا پروفیسر اجتہا ندوی، راقم اس سمینار کا داعی اور منتظم تھا۔

راقم نے اس کانفرنس میں جہاں اہل مدارس کو اپنے نصاب و نظام تعلیم پر نظر ثانی کرنے اور عصری چیلنج کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی وہاں یونیورسٹی انتظامیہ کو متوجہ کیا کہ وہ دینیات کی اسناد کو بی ایڈ، بی لیب اور دیگر پیشہ ورانہ کورسوں میں داخلہ کے لیے منظوری دے۔ کیونکہ آج کل مسلم اسکولوں میں دینیات پڑھانے کے لیے ٹرینڈ ٹیچر نہیں ملتے، اسی طرح لائبریریوں، عربی و فارسی کتابوں اور مخطوطات کی نگہداشت کے لیے، عربی و فارسی کے لیب نہیں ملتے۔ دینیات کے فضلاء

اس کی کو دور کر سکتے ہیں مگر ان کو بی ایڈ اور بی لب کرنے کی اجازت نہیں۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ ۲۰۰۸ء میں راقم کی تجویز منظوری سے ہم کنار ہوئی اور اب دینیات کی ڈگری کے حامل طلبا کو نہ صرف بی ایڈ اور بی لب میں داخلہ لینے کی اجازت ہے بلکہ وہ ایم بی اے بھی کر سکتے ہیں۔

یونیورسٹی نے مذکورہ مطالبات کو سامنے رکھ کر جامع اور مربوط لائحہ عمل بنانے پر غور کیا ۲۵/اپریل ۲۰۰۶ء میں وائس چانسلر صاحب جناب نسیم احمد صاحب نے راقم کو بلایا اور مدارس کی فائل حوالہ کر کے اپنی سفارشات ارسال کرنے کا حکم دیا۔

راقم نے ۲۶/اپریل ۲۰۰۶ء کو ایک بارہ نکاتی رپورٹ وائس چانسلر صاحب کے سپرد کی۔ مگر چونکہ نسیم صاحب یونیورسٹی کے حالات سے بد دل ہو کر قبل از وقت واپس چلے گئے اس لئے ان تجاویز پر جزوی عمل ہوا کلی عمل نہیں ہوا۔

جناب نسیم صاحب کے زمانہ میں مدارس ایسے تھے جن کو رجسٹرار نے بغیر معادلہ کمیٹی کے سامنے پیش کیے ان کے معائنہ کے منظوری دلا دی تھی۔ وائس چانسلر صاحب نے صدر شعبہ سنی دینیات یعنی راقم اور صدر شعبہ شیعہ دینیات پروفیسر فرمان حسین اور شعبہ عربی کے پروفیسر صلاح الدین عمری اور پروفیسر کفیل احمد قاسمی کی کمیٹی بنائی کہ وہ ان مدارس کا معائنہ کر کے اپنی رپورٹ پیش کریں چنانچہ اس کمیٹی نے ۲۰۰۸ء میں ان مدارس کا دورہ کیا اور اپنی معائنہ رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کی روشنی میں وائس چانسلر صاحب نے جنوری ۲۰۱۰ء میں معادلہ کمیٹی کی ایک ذیلی کمیٹی ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی یعنی راقم الحروف کی سربراہی میں تشکیل دی۔ اس کمیٹی میں حسب ذیل افراد تھے:

۱- ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنس

۲- ڈین فیکلٹی آف آرٹس

۳- صدر شعبہ سنی دینیات

۴- صدر شعبہ شیعہ دینیات

۵- صدر شعبہ عربی

۶- صدر شعبہ فارسی

۷- صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز

اس کمیٹی نے جو تجاویز مرتب کیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- انہی مدارس کی اسناد کو منظوری دی جائے جو عالم یا فاضل کی ڈگری دیتے ہیں۔

۲- صرف مرکزی مدارس کو منظوری دی جائے ان کی شاخوں کو نہیں۔

۳- مدارس کی درخواست برائے معادلہ متعلقہ شعبوں کو بھیجی جائے اور ان کے بورڈ

آف اسٹڈیز کی سفارش کے بعد ہی منظوری دی جائے۔

۴- بورڈ آف اسٹڈیز کی منظوری کے بعد ماہرین کو روانہ کی جائے جو موقع پر پہنچ کر

اپنی رپورٹ دیں۔

۵- مذکورہ ماہرین کمیٹی میں ایک شخص لازماً اس مضمون کا ہو جس کے لیے درخواست

دی گئی ہے۔

۶- اگر مدرسہ لڑکیوں کی تعلیم کا ہے تو ایک خاتون استاذ کو بھی معائنہ کے لیے بھیجنا چاہئے۔

۷- معائنہ کمیٹی درخواست گزار مدرسہ کی وزٹ کے بعد اپنی رپورٹ رجسٹرار کو

تفویض کرے۔

۸- معائنہ کمیٹی کی رپورٹ کو معادلہ کمیٹی فائنل منظوری دے۔

۹- وائس چانسلر اس رپورٹ کو اکیڈمک کاؤنسل کی طرف سے منظوری دے سکتے ہیں۔

۱۰- معائنہ کمیٹی کے اخراجات سفر درخواست گزار مدرسہ برداشت کرے۔

۱۱- ہر پانچ سال کے بعد معادلہ کمیٹی منظور شدہ مدارس کے تعلیمی احوال پر غور کر کے فیصلہ کرے۔

۱۲- جن مدارس میں انگلش نہیں پڑھائی جاتی ہے وہاں کے طلباء کے لئے انگلش کالج کورس بنایا جائے۔

۱۳- مدارس کی فائلوں کو ہر وقت دیکھنے کے لئے رجسٹرار آفس میں ایک علیحدہ ٹیبل اور ذمہ دار ہونا چاہئے۔

۱۴- مستقبل میں مدارس کو منظوری دینے کے لئے کمیٹی نے ایسے سونما سندہ مدارس کی فہرست مرتب کی اور وائس چانسلر کو پیش کی۔

یونیورسٹی وقتاً فوقتاً یہ کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ اپنا فیض مدارس کے احاطوں تک پہنچائے، اس کے لیے وہ مدارس کی اسناد پر غور کرنے کے ساتھ ان کے فضلاء کے لیے مفید کورسوں میں داخلہ کی سہولت فراہم کرنے کے طریقہ ڈھونڈتی ہے۔ اگر ذمہ داران مدارس کا کوئی نمائندہ اجلاس ہو اور یونیورسٹیوں، سربراہان کی بھی شرکت ہو تو مدارس کے فضلاء کے لیے بہتر اور مربوط تعلیمی لائحہ عمل مرتب کیا جاسکتا ہے۔

## معادلہ کے بعض مسائل

مدارس میں نہ معیار امتحان میں یکسانیت ہے اور نہ نمبر دینے میں یکسانیت ہے۔ اس کے نتیجے میں جن مدارس کا یونیورسٹی سے معادلہ ہوا ہے ان کے فارغین کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے بیشتر مدارس سالانہ امتحان کے نمبرات فی صد میں دیتے ہیں اور اس وقت دنیا بھر میں تعلیمی اداروں کا تسلیم شدہ معیار ہے یہاں اول نمبر ۶۰ فی صد ہے اور ۳۳ فی صد سے کم میں فیل ہے۔ مگر دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور آج بھی پچاس میں نمبر دیتے ہیں۔ جب یہاں کے فارغین یونیورسٹی میں آتے ہیں تو اپنی مارک شیٹ کو یونیورسٹی



کے معیار سے ہمکنار کرنے کے لیے نمبرات کو دو گنا کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے ان مدارس کے تھرڈ ڈویژن کے طلباء بھی دوسرے مدارس کے فرسٹ ڈویژن کے مساوی ہو جاتے ہیں۔ ماضی میں اس پر دیگر مدارس کے فضلاء نے اعتراض کیا تو یونیورسٹی نے شعبہ فزکس کے پروفیسر اسرار احمد مرحوم کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنادی جو دارالعلوم دیوبند کے عطا کردہ نمبرات میں تناسب پیدا کرنے کا فارمولہ تیار کرے، کمیٹی کے اس فارمولہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ دارالعلوم کے فضلاء کے نمبر کم ہو گئے اور داخلہ میں ان کی تعداد کم ہو گئی۔

راقم الحروف، پروفیسر کفیل احمد قاسمی اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے دارالعلوم کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمان صاحب کو صورت حال سے مطلع کیا اور سو میں نمبر دینے کی گزارش کی۔ بلکہ اس مقصد کے لیے راقم نے دارالعلوم دیوبند کا سفر کر کے مہتمم اور نائب دونوں بزرگوں کو صورت حال بتائی، ان حضرات نے اگلی مجلس شوریٰ میں اس مسئلہ کو حل کرنے کا وعدہ فرمایا۔ مگر آج تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوا۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ بہت سے مدارس فیاضی سے نمبر دیتے ہیں اور بہت سے معتدل رویہ اختیار کرتے ہیں بلکہ بعض مدارس کا تعلیمی نظام اتنا ناقص ہے کہ کچھ نا اہل لوگ وہاں کی ڈگریاں حاصل کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لینے آ جاتے ہیں اور ناقص کارکردگی کے باعث جب ناکام ہوتے ہیں تو سفارشات وغیرہ کی تلاش میں رہتے ہیں اور ماحول خراب کرتے ہیں۔ چنانچہ اب یونیورسٹی نے ماسٹر ڈگری کورس میں داخلہ امتحان رکھ دیا ہے جس سے مذکورہ مسائل پر کسی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ روایتی دینی مدارس میں سماجی علوم، جغرافیہ، ریاضی اور انگریزی وغیرہ نہیں پڑھائے جاتے اس لیے یہاں کے فضلاء یونیورسٹی کے وسیع تعلیمی نظام میں بہتر کارکردگی نہیں کر پاتے اور صرف عربی یا دینیات تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اس لیے اب یہ فکر

عام ہو رہی ہے کہ مدارس کے فضلا کو ایم اے میں داخلہ دینے کے بجائے بی اے میں داخلہ دیا جائے جہاں وہ چھ مضامین پڑھ کر اپنے لیے ایم اے میں بہتر میدان کا انتخاب کر سکیں اور ان کی تعلیمی لیاقت بھی دوسرے طلباء کے مساوی ہو جائے۔ اور معلومات کا دائرہ بھی وسیع ہو جائے۔ چنانچہ گزشتہ دنوں علی گڑھ میں پروفیسر محسن عثمانی ندوی، ڈین فیکلٹی آف لنگویجز حیدر آباد، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس مسلم یونیورسٹی، پروفیسر کفیل احمد قاسمی سابق صدر شعبہ عربی اے ایم ایو اور راقم کی غیر رسمی نشست ہوئی اور ان سب کا متفقہ خیال تھا کہ مدارس کے فضلا کے لیے وسیع تعلیمی امکانات کی فراہمی کے لحاظ سے اور ان کی ذہنی وسعت کے لحاظ سے یہی مناسب ہے کہ ان کو ایم اے کے بجائے بی اے میں داخلہ دیا جائے۔

جن مدارس میں انگریزی بالکل نہیں پڑھائی جاتی ان کے فارغین کے لیے راقم نے یونیورسٹی کے سامنے یہ تجویز رکھی ہے کہ ان کے لیے انگلش کا ایک برج کورس بنایا جائے جو چھ ماہ کی میعاد پر مشتمل ہو۔ اس کا امتحان میں علی گڑھ میں لینے کے ساتھ، یونیورسٹی کے فاصلاتی تعلیم کے مراکز مشہور دینی درسگاہوں میں یا ان کے آس پاس بنایا جائے اور وہاں اس امتحان کی سہولت فراہم کی جائے۔ صرف یونیورسٹی میں داخلہ لینا مدارس کے طلباء کے لیے مفید نہ ہوگا جب تک کہ ان کو وسیع اور مربوط تعلیم نہ دی جائے اور ان میں اتنی صلاحیت نہ پیدا کی جائے کہ وہ پیشہ ورانہ تعلیم کو حاصل کرنے کے اہل ہو جائیں۔ ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے زیر انتظام جو اسکول کھل رہے ہیں ان میں دینیات پڑھانے کا عام رجحان ہے مگر ان اسکولوں کو دینیات کے ٹرینڈ ٹیچرس نہیں ملتے۔ مدارس کے جو فضلا دینیات کی تعلیم دیتے ہیں وہ بی ایڈ نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو موثر تعلیم کو یقینی بنا پاتے ہیں اور نہ ان کو بہتر گریڈ ملتا ہے۔ اگر یونیورسٹی اردو میں بی ایڈ کا نصاب تیار کر کے مدارس کے فضلا کو علی گڑھ میں یا فاصلاتی تعلیم کے لیے ان کے قریبی مراکز میں استفادہ کا موقع دے تو اسکولوں کی ضرورت بھی پوری ہو سکتی ہے اور مدارس کے

فضلاء کی ایک تعداد اسکولوں میں بھپ سکتی ہے، اور بہتر تدریسی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔  
اسی طرح ایک اور اہم مسئلہ شعبہ قانون میں ایل ایل بی کے لیے پانچ سالہ انگریڈ  
کورس جاری ہے جس میں سینئر سکندری اسکولوں کے بعد داخلہ دیا جاتا ہے، اگر مدارس کے ان  
فارغین کو جو عالمیت کی سند کے حامل ہیں داخلہ دیا جائے تو نہ صرف ان طلباء کو نیا تعلیمی افق فراہم  
ہوگا بلکہ عدالتوں میں جج صاحبان اسلامی قوانین سے ناواقفیت کی بنا پر جو خلاف شرع فیصلے صادر  
کرتے ہیں ان کو صحیح اسلامی موقف سے واقف کرانے کے لیے مدارس کا پس منظر رکھنے والے یہ  
ایل ایل بی کے سند یافتہ طلباء موثر رول ادا کر سکیں گے، راقم نے مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبہ  
قانون کو اس طرف متوجہ کیا ہے ضرورت ہے کہ یونیورسٹی اس سلسلہ میں مثبت اقدام کرے۔



## مدارس کے فارغین اور مقابلہ جاتی امتحانات

مولانا ابوالکلام قاسمی شمس ☆

ہندوستان میں مدرسہ ایجوکیشن سسٹم بہت مقبول ہے۔ مسلم سماج کا ایک بڑا طبقہ مدارس سے منسلک ہے۔ ان کے بچے/بچیاں مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور مدارس میں تعلیم دلانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک ہندوستان میں مدارس کا جال بچھا ہوا ہے۔ ان میں تعلیم حاصل کرنے والے اور فارغین کی تعداد بھی بہت ہے۔ جب ہم ملک ہندوستان کا جائزہ لیتے ہیں تو دو طرح کے مدارس سامنے آتے ہیں۔

(۱) مدارس نظامیہ، (۲) مدارس ملحقہ

۱- مدارس نظامیہ ایسے مدارس ہیں جن میں درس نظامی کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ حکومت سے امداد نہیں لیتے ہیں۔ یہ آزاد مدارس ہیں۔ ان کا نصاب تعلیم درس نظامی کے مطابق ہے۔ اس میں صرف دینی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان میں سے کچھ مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ اکثر مدارس میں عصری مضامین کی تعلیم کے لئے انتظام نہیں ہے۔ ان مدارس کا نصاب تعلیم حکومت سے منظور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی سرٹیفکیٹ رڈگری کو حکومت سے ملازمت اور عصری تعلیمی اداروں میں داخلہ کے لئے منظوری حاصل نہیں ہے۔ ویسے ان مدارس کے طلبہ اچھی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان مدارس کے اسناد کو حکومت کے ذریعہ منظور نہ ہونے کی وجہ سے ان مدارس سے طلبہ و فارغین کسی مقابلہ جاتی امتحان میں

☆ پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ



شریک ہونے کے اہل نہیں ہیں۔

۲۔ مدارس ملحقہ وہ مدارس ہیں جو کسی سرکاری بورڈ سے منظور ملحق ہیں۔ ان میں حکومت کے ذریعہ منظور نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ ان میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری مضامین کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ جیسے بہار مدرسہ بورڈ، اڑیسہ مدرسہ بورڈ، بنگال مدرسہ بورڈ، الہ آباد بورڈ، بھوپال بورڈ وغیرہ۔ ان کی سند کو حکومت کے ذریعہ منظوری حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے ان مدارس کے فارغین طلبہ رطالبات مقابلہ جاتی امتحانات میں شرکت کر سکتے ہیں۔ لیکن نہایت ہی افسوس کی بات ہے کہ ان میں تعلیم کا معیار بہت ہی کمزور ہے۔ جس کی وجہ سے بورڈ کے مدارس کے فارغین اپنی سند پر مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ نہیں لے پاتے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں مدارس کے فارغین ہمارے سامنے ہیں۔ نظامیہ مدارس کے فارغین صاحب صلاحیت ہوتے ہیں۔ اگر ان کی تربیت کی جائے اور کوچنگ وغیرہ کے ذریعہ عصری مضامین کی تعلیم کو مضبوط کر دیا جائے تو مقابلہ جاتی امتحانات کو نکال لیں گے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان کی سند و ڈگری ہی اس قابل نہیں کہ یہ کسی مقابلہ جاتی امتحان میں حصہ لے سکیں۔ جب کہ بورڈ سے ملحق مدارس کی سند اس قابل ہے کہ وہ مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لے سکیں لیکن یہ اس مقام پر پیچھے رہ جاتے ہیں کہ ان کے اندر پختہ صلاحیت نہیں ہوتی ہے کہ یہ مقابلہ جاتی امتحان کو نکال سکیں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ نظامیہ مدارس کے فارغین کی سند پر اور بورڈ سے ملحق مدارس کے فارغین کی صلاحیت پر بحث و گفتگو کی ضرورت ہے۔

مدارس نظامیہ کی سند کو مساوات کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ اس لئے ان مدارس کے فارغین مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہیں۔ لیکن یہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ مدارس نظامیہ کے اکثر فارغین کسی بورڈ سے امتحانات میں شریک ہو کر سرٹیفکٹ و سند حاصل کر چکے ہیں۔ یا پھر وہ کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر کے ڈگری حاصل

کر چکے ہیں۔ اس طرح مدارس نظامیہ کے اکثر فارغین مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے کے قابل ہیں۔ چونکہ بورڈ کی سند کو مساوات کا درجہ حاصل ہے۔ بقیہ ایسے فارغین جنہوں نے بورڈ سے امتحانات پاس نہیں کئے ہیں، وہ بھی کسی بورڈ یا نیشنل اوپن اسکول ایجوکیشن سسٹم سے امتحانات روئے کر سند حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے چند سال مزید درکار ہوں گے۔ اسناد کی Equivalency (مساوات) اور معادلہ پر اہل مدارس کو غور و خوض کی سخت ضرورت ہے۔

مدارس ملحقہ کے فارغین کی سرٹیفکیٹ کو مساوات کا درجہ حاصل ہے۔ اس لئے وہ کسی بھی مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لے سکتے ہیں۔ البتہ اس کے لئے انہیں تعلیم میں پختگی کی ضرورت ہے، تو وقت مدارس نظامیہ کے فارغین کے لئے بھی ہے اور مدارس ملحقہ کے فارغین کے لئے بھی۔ مقابلہ جاتی امتحانات سخت ہوتے ہیں۔ ان کے مضامین مدارس کے مضامین سے الگ اور وسیع ہوتے ہیں۔ مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیاب ہونے کے لئے کالج و یونیورسٹی کے فارغین کو بھی ۱۸ گھنٹہ پڑھنا پڑتا ہے۔ تب وہ اس طرح کے امتحانات میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ چونکہ اس طرح کے امتحانات میں لاکھوں طلبہ شریک ہوتے ہیں اور ان میں کامیاب ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے لئے طلبہ کو سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے یہ سمجھ لینا غلط ہے کہ مدارس کے فارغین اس امتحان کو نہیں نکال سکیں گے۔ مجھے تو مدارس کے فارغین کی محنت کا پورا اندازہ ہے، اس لئے توقع ہے کہ مدارس کے فارغین مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لیں گے تو زیادہ اچھا کر دکھائیں گے۔

مقابلہ جاتی امتحانات میں B.P.S.C (بہار پبلک سروس کمیشن) کا نصاب تعلیم

میرے سامنے ہے۔ اس امتحان میں کامیابی کے بعد صوبہ بہار میں District Education

Excise Inspector, S.D.O, D.S.P, Officer, Registrar وغیرہ درجہ کے آفیسر بننے

ہیں۔ B.P.S.C کے امتحانات دو مرحلہ میں ہوتے ہیں۔ ایک P.T (پرائمری ٹسٹ) اور دوسرا

Mains (فائل امتحان) کہلاتا ہے۔

P.T (پرائمری ٹسٹ) میں صرف ایک پرچہ ہوتا ہے۔ اس میں دو طرح کے مضامین ہوتے ہیں۔ ایک G.K. جنرل ناچ (معلومات عامہ) جبکہ دوسرا G.S. جنرل اسٹڈیز (مطالعہ عامہ) ہے۔ دونوں ملا کر ۱۵۰ سوالات ہوتے ہیں۔ یہ سوالات Objective (معروضی) ہوتے ہیں اور ۱۵۰ نمبرات کے ہوتے ہیں، یہ امتحان دو گھنٹہ کا ہوتا ہے۔ یہ امتحان سب کے لئے لازمی ہے۔ جو اس امتحان میں پاس ہوگا وہی Mains (فائل) امتحان میں شریک ہونے کا اہل ہوگا۔ P.T میں تاریخ، جغرافیہ، جنرل ناچ، حساب، سائنس وغیرہ مضامین کے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

Mains (فائل امتحان) میں کل ۶ پرچے ہوتے ہیں۔ جو ۱۲۰۰ نمبرات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

(الف) لازمی پرچہ (Compulsory Paper)، دو پرچے (2 papers)، G.S. (جنرل اسٹڈیز) سے۔

G.S (۱) (جنرل اسٹڈیز) ۱.....۲۰۰ نمبرات

G.S (۲) (جنرل اسٹڈیز) ۲.....۲۰۰ نمبرات

ان میں تمام سبجیکٹ مثلاً تاریخ، جغرافیہ، حساب، سائنس، سوشل سائنس وغیرہ سے مشترکہ طور پر سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

(ب) اختیاری پرچہ (Optional paper) دو پرچے لنگوئج ولٹریچر سے

(۱) اختیاری ۱.....۲۰۰ نمبرات

(۲) اختیاری ۲.....۲۰۰ نمبرات

مدارس کے فارغین اردو، فارسی، عربی میں سے کوئی ایک زبان لے سکتے ہیں۔

(ج) اختیاری مضمون (Optional Paper) دو پرچے..... تاریخ، جغرافیہ،

معاشیات، اقتصادیات وغیرہ میں سے کسی ایک سے۔

(۱) اختیاری ۱..... ۲۰۰ نمبرات

(۲) اختیاری ۲..... ۲۰۰ نمبرات

اس طرح کل ۶ پرچے ہوئے۔ اور ہر ایک ۲۰۰ نمبرات کے، اس طرح مجموعی

نمبرات ۱۲۰۰ ہوئے۔ یہ ایک نمونہ ہے۔ اسی سے ملتا جلتا امتحان ہر صوبہ میں ہوتا ہے۔

مقابلہ جاتی امتحان U.P.S.C (Union Public Service Commission) کا

خاکہ حسب ذیل ہے۔

یہ مقابلہ جاتی امتحان دو مرحلہ میں لیا جاتا ہے۔ پہلا P.T (پرائمری ٹسٹ) اور دوسرا

Mains (فائنل امتحان)۔

P.T میں دو پرچے ہوتے ہیں۔ ایک پرچہ جنرل اسٹڈیز دو گھنٹہ اور ۲۰۰ نمبرات کا، اس

میں معروضی (Objective) سوالات اور Negative Marking ہوتا ہے۔ جنرل اسٹڈیز میں

مشترکہ سوالات معاشیات، سماجیات، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، حساب وغیرہ سے پوچھے جاتے

ہیں۔ اس میں ہر سبجیکٹ کے سوالات ہوتے ہیں۔

دوسرا پرچہ Common Attitude کا ہے۔ یہ بھی دو گھنٹہ اور ۲۰۰ نمبرات کا ہوتا ہے۔

اس میں Comprehensive Passage سے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ یعنی کئی صفحات پر

مشتمل ایک عبارت دے دی جاتی ہے اور اسی عبارت کی بنیاد پر نیچے سوالات دیئے جاتے ہیں

جس کو پڑھ کر نیچے کے سوالات کے جوابات دینے ہوتے ہیں۔

P.T (پرائمری ٹسٹ) میں کامیاب ہونے کے بعد ہی کوئی امیدوار Mains (فائنل

امتحان) میں شرکت کر سکتا ہے۔



## Mains (فائنل امتحان):

اس میں مندرجہ ذیل سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

(A) پرچہ ۱..... دستور ہند کی ۸ ویں شیڈول میں سے کسی ایک ہندوستانی زبان سے متعلق سوالات ۳۰۰ نمبرات

(B) پرچہ ۲..... انگریزی ۳۰۰ نمبرات

(C) پرچہ ۳..... مضمون نگاری ۲۰۰ نمبرات

(D) پرچہ ۴، ۵..... مطالعہ سماج، اس میں دو پرچے ہر ایک ۳۰۰+۳۰۰ نمبرات کے ہوتے ہیں۔

(E) اختیاری (Optional) ۱، ۲

Optional 1: پرچہ ۶، ۷..... ہر ایک کے دو دھسے ہوتے ہیں اور ہر ایک ۳۰۰+۳۰۰ نمبرات کے ہوتے ہیں۔

Optional 2: پرچہ ۸، ۹..... ہر ایک کے دو دھسے اور ہر ایک ۳۰۰+۳۰۰ نمبرات کے ہوتے ہیں۔ یعنی Optional Paper کل ۱۲۰۰ نمبرات کے ہوتے ہیں۔

یہ History, Geography, Political Science وغیرہ کے سوالات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

Mains امتحان میں پاس کرنے کے بعد Viva (تقریری) ہوتا ہے جس کے ۳۰۰ نمبرات ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں مقابلہ جاتی امتحانات میں اردو زبان میں بھی پرچہ لکھنے کی اجازت ہے۔ مقابلہ جاتی امتحانات پاس کرنے کے لئے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی امتحان کو پاس کرنے کے لئے تجربہ کار استاذ سے مدد لینے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مقابلہ جاتی

امتحانات کو پاس کرنے کے لئے ہر بڑے شہر میں کوچنگ انسٹی ٹیوٹ کھلے ہوئے ہیں جن میں داخلہ لے کر طلبہ ماہر اساتذہ کی نگرانی میں امتحان کی تیاری کرتے ہیں۔ مقابلہ جاتی امتحان بی پی ایس سی یو پی ایس سی میں P.T کا پاس کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی امیدوار Mains امتحان میں شریک ہو سکتا ہے۔ پھر Mains امتحان پاس کرنے کے بعد Viva ہوتا ہے۔ اس طرح دو تحریری امتحان اور Viva پاس کرنے کے بعد ہی امیدوار منتخب قرار دیا جاتا ہے۔

مدارس کے فارغین کو مقابلہ جاتی امتحانات کے لائق بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ لیکن یہ کام صرف کہنے سے پورا نہیں ہوگا، بلکہ اس اہم کام کے لئے ملی تنظیموں کو آگے آنا ہوگا۔ چونکہ مقابلہ جاتی امتحانات کے لئے تیاری ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ اس کے لئے باضابطہ کوچنگ اور امیدوار کی تربیت کی ضرورت ہے۔ مدارس کے فارغین عام طور پر غریب فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے جب تک انہیں سہولت فراہم نہیں کرائی جائے گی، وہ مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیاب ہونے کے لائق نہیں بن سکیں گے۔ اس لئے سہولت کے مسئلے پر بھی بحث ضروری ہے۔

امیدواروں کی تربیت کے سلسلہ میں تین اداروں کا تجربہ میرے سامنے ہے۔ امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کی جانب سے افتاء اور قضا میں طلبہ کی تربیت کی جاتی ہے۔ مرکز المعارف کی جانب سے فارغین مدارس کی تربیت کا انتظام ہے۔ اس ادارہ میں انگریزی بول چال کے ساتھ دیگر زبانوں میں بھی تقریر و تحریر کے لئے طلبہ کی تربیت کی جاتی ہے۔ اسی طرح رحمانی ۳۰ نمونہ کے طور پر موجود ہے۔ اس ادارہ میں IIT کے لئے طلبہ کو تیار کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ریلوے کے لئے بھی کوچنگ کرائی جاتی ہے۔ ان اداروں میں داخلہ ٹسٹ لے کر طلبہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ طلبہ کا انتخاب اور ان کے قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ان کی تعلیم کے لئے ماہر اساتذہ کی خدمت حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح طلبہ کی تعلیم و تربیت اور ان کی نگرانی پوری طرح کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ سامنے ہے۔ یہ تینوں ادارے کامیابی کے ساتھ خدمت انجام دے

رہے ہیں۔ مدارس کے فارغین کو مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیاب بنانے کے لئے اسی انداز پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی تنظیم اس کے لئے تیار ہو تو تجربہ کے طور پر ملک کے ایک دوصوبہ میں مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری کے لئے کوچنگ کا انتظام کرے اور مدارس کے فارغین کو مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے لئے کوشش کی جائے۔ مجھے پوری امید ہے کہ مدارس کے فارغین دیگر شعبہ میں بھی اپنی کامیابی کا جوہر دکھا کر ملک و ملت کی صحیح اور پر خلوص خدمت کریں گے اور مدارس کے نام و وقار کو بلند کریں گے۔

☆☆☆

آٹھواں باب  
مدارس کے مسائل





## دینی مدارس اور طلبہ کے طعام اور رہائش کا معیار

ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی ☆

دینی مدارس کا سلسلہ اصحاب صفہ سے جا کر ملتا ہے۔ دور نبوت سے لے کر آج تک ان مدارس نے نامساعد حالات کے باوجود اپنا وجود برقرار رکھا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے آنے سے پہلے ہزاروں مدارس موجود تھے، جو دینی و دنیوی ہر طرح کی تعلیم طلبہ کو دیتے تھے اور جن کے پاس اوقاف کی شکل میں مضبوط ذرائع آمدنی ہوا کرتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں میں تعلیم کی کوئی شنویت اور دوئی نہ تھی۔ اور اسی نظام تعلیم سے جہاں ان کو علماء دین، قاضی شرع اور محدث و فقیہ ملتے تھے وہیں اسی سے اعلیٰ درجہ کے منتظم، وزراء اور سرکاری اہل کار ملتے تھے۔ 1857 کے بعد انگریز کی مشق ستم کا کل نشانہ مسلمانان ہند بن گئے اور ان کا پورا نظام تعلیم مختلف مرحلوں میں برباد کر کے رکھ دیا گیا۔

بہر حال انگریزی دور اور آزادی کے بعد مدارس نے اپنا وجود برقرار رکھا۔ اپنی خدمات جاری رکھیں جو آج بھی جاری ہیں۔ دینی مدارس کی خدمات اور ان کے نظام و نصاب تعلیم میں اصلاحات کے سلسلہ میں راقم متعدد مضامین لکھ چکا ہے جو ملک کے موقر رسائل و جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ (۱۔ ملاحظہ ہو درج ذیل مضامین: (الف) مدارس اسلامیہ مطلوبہ نظام تعلیم کے خدو خال، دعوت، دہلی، جون ۲۰۰۷)، (ب) مدارس اسلامیہ - اصلاح و تبدیلی ناگزیر، افکار ملی اگست ۲۰۰۶، (ج) ماضی قریب کے برصغیر میں احیاء اسلام کی کوششوں کا جائزہ - تعلیم و تحقیق

☆ ڈاکٹر فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی

کے تناظر میں، زندگی نو، جولائی ۲۰۰۶ء، (د) ہندوستان کے مدارس اسلامیہ میں تدریس فقہ: ایک جائزہ مطالعات جلد ۱۵، ۱۴، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء) ان میں راقم نے زور دے کر یہ بات کہی ہے کہ مدارس اسلامیہ عربیہ مسلمانوں کے NGO کا وسیع سلسلہ ہیں۔ بہر حال یہاں مجھے مدارس کی خدمات یا ان کے نظام تعلیم پر روشنی ڈالنی نہیں ہے بلکہ مدارس کے طلبہ سے متعلق ایک مخصوص جہت پر گفتگو کرنی ہے وہ ہے۔ ”مدارس اسلامیہ کے طلبہ کے طعام اور رہائش کا معیار“۔

ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کی ایک بہت بڑی تعداد وہ ہے جو ام المدارس، از ہر ہند دارالعلوم دیوبند اور اس کے توئم مظاہر العلوم سہارنپور کی شاخیں اور فروعیات ہیں، یا اگر رسمی طور پر ان کے تابع نہیں بھی ہیں تو اپنے نظام تعلیم و نصاب میں انہیں کی پیروی کرتے ہیں۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ بریلوی مکتب فکر کے دارالعلوم اشرفیہ اور اس کی شاخیں بھی اسی درس نظامی کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ دوسرے وہ مدارس ہیں جو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تابع ہیں، ان کے بعد وہ مدارس آتے ہیں جو جامعہ سلفیہ بنارس دارالسلام عمر آباد، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اور مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الہدایہ جے پور جیسے مدارس ہیں یا ان کی شاخیں ہیں۔ نصاب تعلیم کے سلسلہ میں تو دارالعلوم ندوۃ العلماء اور ملحقیات ندوہ اور دوسری کٹیگری کے مدارس کے بارے میں بحث و گفتگو کی پوری گنجائش موجود ہے۔ لیکن طلبہ کے قیام و طعام کے سلسلہ میں انہوں نے نسبت بہتر معیار Maintain کیا ہوا ہے۔ اس لیے ہماری گفتگو کے دائرہ میں وہ کم ہی آئیں گے۔

دارالعلوم دیوبند کے تابع مدارس، دوسرے لفظوں میں درس نظامی کے پیروکار مدارس جو تعداد میں ہزاروں سے بھی متجاوز ہیں۔ بلاشبہ ان کی خدمات عظیم الشان ہیں اور اسلامیان ہند پر بالعموم انہیں کے اثرات زیادہ ہیں۔ وہ جس طرح اپنے نصابیات اور طریقہ تعلیم و تربیت کے باب میں صدیوں پرانے نصاب و نظام کو مقدس سمجھ کر اس سے چمٹے ہوئے ہیں اور اس میں ادنیٰ بھی تبدیلی گوارا نہیں کرتے، اسی طرح طلبہ کے طرز رہائش رہن سہن اور کھانے پینے وغیرہ

کے لیے جدید سہولیات دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مثلاً بڑے بڑے مدارس میں طلبہ کو بجلی کے پکھے فراہم نہیں کیے جاتے۔ کھانا لانے کے لیے طلبہ لائنوں میں لگتے ہیں۔ البتہ بعض مدارس میں کھانا طلبہ کے کمروں میں پہنچایا جاتا ہے اور بعض میں ڈانگ ہال میں اجتماعی طور پر طلبہ کھانا کھاتے ہیں۔ لائن میں لگنے کے بجائے یہ دونوں طریقے ترجیحی طور پر اختیار کیے جانے چاہئیں۔ جو کھانا ہوتا ہے، خاص کر غیر مستطیع طلبہ کے لیے، وہ غیر صحت مندانہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مہینوں بلکہ سالوں تک دال چاول یا بڑے کا گوشت دینا کوئی بہت اچھا کھانا نہیں ہے۔ کھانے میں تھوڑا بہت تنوع تو ہو اور اس کو وٹامن و پروٹین مناسب انداز میں فراہم کرنے والے اجزاء طعام اور اشیاء پر مشتمل ہونا چاہیے۔ رہائش کے لیے چارپائی نہیں فراہم کی جاتیں۔ اکثر مدارس میں ایک ایک کمرہ میں کئی کئی طالب علموں کو رکھ دیا جاتا ہے اور اس میں عمروں کے تفاوت کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا اور بعض مدارس میں بڑے سے ہال میں 50، 60 لڑکوں کو ایک ساتھ رکھ دیا جاتا ہے۔ طلبہ بالعموم زمین پر سوتے ہیں اور نیچے ہی تپائی وغیرہ پر اپنی کتابیں رکھتے ہیں۔ ریک اور الماری جیسی سہولیات ان کو حاصل نہیں ہیں۔ دیوبند اور مظاہر علوم جیسے بڑے اداروں میں بھی طلبہ کا یہی برا حال ہے۔ البتہ دیوبند نے نئے ہاسٹلوں میں یہ سہولیات مہیا کرانے کا آغاز کر دیا ہے۔

اسی طرح صحت وغیرہ کو برقرار رکھنے کی کوئی سہولت طلبہ کو نہیں دی جاتی، طلبہ کی اپنی انجمن، اور لائبریری کا معیاری نظم نہیں ہوتا، دیوبند میں مسجد رشید جیسی عمارت کھربوں روپے خرچ کر کے بنادی گئی مگر طلبہ کے لیے اچھے ہاسٹل، کمروں میں چارپائیاں، تپائیاں اور میز و کرسی وغیرہ جیسی ضروری سہولیات طلبہ کو فراہم کرنے کی توفیق خداوندان دیوبند کو نہیں ہو سکی۔ بڑی بڑی اور شاندار عمارتیں مدارس میں خوب بنتی ہیں، مگر ان عمارتوں کے مکینوں یعنی طلبہ اور اساتذہ کے ویلفیئر اور بہبود کا کسی کو خیال نہیں آتا۔ شاندار عمارتیں بنانے کے بجائے یہی فنڈ طلبہ کے اوپر خرچ



کیے جائیں تو ان کی تعلیم و تربیت کا بہتر نظم کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں نئے نئے کھلنے والے مدارس کے مہتمم حضرات اور ان کی ذریت کے تعیش کی داستانیں بھی گا ہے بگا ہے میڈیا میں آتی رہتی ہیں۔ (اس کی تھوڑی سی تفصیل مولانا ندیم الواجدی کے مضمون مشمولہ حسن تدبیر، مدارس نمبر، ایڈیٹر اعجاز عرفی قاسمی فروری 2011 میں دیکھی جاسکتی ہے۔)

اس سلسلہ میں غالباً شمالی ہند اور جنوبی ہند کے ذوق و مزاج کا فرق بھی ہے۔ کیونکہ شمال کے لوگ سیاست سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں مثبت اور تعمیری کاموں سے کم۔ چنانچہ یہاں کے مدارس اور علماء پر بھی اس کی چھاپ ہے اسی لیے جمعیت علماء ہند کے دونوں دھڑے اپنے تابع مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو اپنے پروگراموں کا تختہ مشق بناتے رہتے ہیں۔ جنوب میں یہ وبا ذرا کم ہے۔ اس لیے اس کے اثرات مدارس میں بھی نظر آتے ہیں۔ اب سے کئی سال پہلے راقم نے شمال و جنوب کے بعض بڑے مدارس کا سفر کیا جن میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، (قدیم و جدید) دارالعلوم دیوبند وقف، جامعہ اشرفیہ مبارکپور، بریلی کا منظر اسلام، مراد آباد کا مدرسہ شاہی، جامعہ نعیمیہ تو شمالی ہند کے تھے۔ اور جنوبی ہند کے مدارس میں جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل، دارالعلوم ماٹلی والا بھروچ، ترکیسر اور سورت اور حیدر آباد کے مدارس تھے۔ اس سفر میں اس نے مشاہدہ کیا کہ جنوبی ہند کے ان مدارس میں بھی معمولی سے فرق کے ساتھ درس نظامی ہی پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔ مگر ان میں وسیع و عریض کیمپس، خوبصورت پارکنگ، لان، اور طلبہ کی رہائش کے اچھے انتظامات فراہم کیے گئے ہیں، اسی طرح طلبہ کے لیے لائبریریوں کا بھی اچھا نظم ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اس سلسلہ میں جنوب و شمال کے ذوق کا بھی بہت کچھ فرق ہے۔

مدارس کے طلبہ پر لباس اور داڑھی وغیرہ جیسے مسائل کو لے کر سختی تو کی جاتی ہے مگر ڈسپلن کی کوئی پابندی نہیں کرائی جاتی۔ مدارس میں عمومی طور پر لنگی کلچر کا رواج ہے، طلبہ کو اس بات کا پابند بنایا جانا ضروری ہے کہ لنگی کا استعمال وہ صرف سونے کے لیے کریں گے، دن کے اوقات

میں اس کا استعمال ممنوع اور کلاسوں میں لنگی پہن کر جانے پر تو پابندی ہونی چاہئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ لنگی کا لباس سنت میں داخل ہے اور اس کو ممنوع قرار دینے سے سنت کی توہین ہوتی ہے مگر یہ بات درست نہیں کیونکہ لنگی خود پورا لباس نہیں ہے، اس کا ایک حصہ ہے اگر اس کو سنت مانا جاتا ہے تو اس کے ساتھ عہد نبوی میں ایک چادر جسم کے اوپر کے حصے پر ڈالی جاتی تھی لہذا اس کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔

طلبہ کو دی جانے والی سہولیات کے سلسلہ میں اکثر اہل مدارس یہ عذر لنگ کرتے ہیں کہ ان کے پاس وسائل کم ہیں۔ لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات موجود ہے کہ زیادہ آزادیاں اور سہولتیں دینے سے طلبہ کا دماغ خراب ہو جائے گا، وہ اساتذہ و ذمہ داران کا احترام نہ کریں گے ان کے مزاج میں آوارگی آ جائے گی وغیرہ۔ یہ عذر پیش کرتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جدید فن تعلیم و تربیت اور طریقہ تعلیم کی رو سے یہ سہولیات طلبہ کو دینا ضروری ہیں ورنہ ان کی شخصیت کا ارتقاء رک جائے گا اور Personality Development کے اصول کے مطابق وہ فطری طور پر آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مستطیع طلبہ تو اپنے پیسہ کے بل بوتے پر اپنے لیے زندگی کی آسائشیں اور سہولیات خود سے فراہم کر لیتے ہیں مگر غیر مستطیع طلبہ تو بے چارے ”کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہے“ کی عملی تصویر بنے رہتے ہیں۔

یہ صورت حال صرف سنی مکاتب فکر کے مدرسوں کی ہی نہیں بلکہ شیعہ مدارس کا بھی یہی حال ہے۔ کئی سال پہلے لکھنؤ میں حضرات اہل تشیع کے دو بڑے مدارس ناظم المدارس اور سلطان المدارس کا مشاہدہ کیا۔ نظام و نصاب تعلیم سے قطع نظر طلبہ کے معیار رہائش اور قیام و طعام کے سلسلہ میں ان کے حالات بھی بہت زیادہ حوصلہ افزاء نہیں پائے۔ حالانکہ فنڈز کی ان کے پاس بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مذہبی تعلیم پر عمومی مردنی چھائی ہوئی ہے۔

البتہ ایران کے سفر میں وہاں کے علمی و ثقافتی شہر قم جانے کا موقع ملا اور ایک پورا دن قم

کے بڑے مدارس کو دیکھنے میں گزرا، جس میں امام خمینی اکیڈمی (مجمع امام خمینی) جامعہ المصطفیٰ تہران کے ماتحت ہے کو خصوصی طور پر دیکھا۔ یہ مذہبی و دینی ادارہ ہے، مگر انتہائی اعلیٰ اور جدید ترین طرز پر بنایا گیا ہے، اس کا معیار طرز رہائش لائبریری، دارالاقامہ، اسپورٹس فیلڈ، مطبخ، کلاس روم اور رہائشی کمروں میں طلبہ کو دی جانے والی سہولیات ہمارے ہاں کی کسی بھی جدید ترین یونیورسٹی سے کم نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ حکومت ایران ان اداروں کا خاص خیال رکھتی ہے، ہم اپنے مدارس سے اتنے اعلیٰ معیار کی توقع نہیں کر سکتے مگر اس کا کم از کم درجہ کی تو ان سے امید رکھنے میں ہم حق بجانب ہوں گے۔

مدارس اسلامیہ میں نصاب درس اور طلبہ کی سہولتوں کے لحاظ سے کمی صرف ہندوستان کے مدارس کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کم و بیش پاکستان کے مدارس کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے، یہ سنی سنائی نہیں بلکہ اپنے مشاہدہ کی بات ہے۔ چنانچہ حال ہی میں (مارچ ۲۰۱۱) پاکستان کا سفر ہوا، اسلام آباد میں ۵ دن قیام رہا، جہاں جامعہ فریدیہ (جو جامعہ حفصہ (لال مسجد) کی اصل ہے۔ اس کو تفصیل سے دیکھا۔ اسلام آباد کے سب سے خاص اور مہنگے علاقہ میں واقع اس مدرسہ میں طلبہ کا معیار اور طرز رہائش یوپی کے کسی دور افتادہ گاؤں کے مدرسہ سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے۔ البتہ مدرسہ میں ایک خوبصورت لان ضرور بنایا گیا ہے۔

تاہم مزید معلومات کرنے سے پتہ چلا کہ پاکستان میں کم از کم تین ادارے ایسے ہیں جنہوں نے اس سمت میں دوسرے مدارس کی بہ نسبت اچھی ترقی کی ہے، اور یہ ہمارے مدارس کے لیے اچھا نمونہ ہیں۔ یہ تینوں مدارس کراچی میں ہیں یہاں ان کی تھوڑی سی معلومات اس لیے درج کی جا رہی ہیں کہ ہمارے ہندوستانی اہل مدارس ان سے کچھ سبق لیں۔

۱۔ جامعہ بنوریہ کراچی

یہ مدرسہ علامہ محمد یوسف بنوریؒ کی یاد میں قائم کیا گیا ہے، کافی طلبہ (۳۰۰۰)

یہاں پڑھنے آتے ہیں واضح رہے کہ برصغیر میں رائج درس نظامی کے بڑے ناقدوں میں ایک مولانا بنوریؒ بھی تھے جنہوں نے اس میں دور رس تبدیلیوں کی وکالت کی ہے، اور اس کے لئے تجاویز بھی دی تھیں۔ (ملاحظہ ہو: ہندوستان کے مدارس اسلامیہ میں تدریس فقہ: ایک جائزہ مطالعات جلد ۱۵، ۱۴، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰) جامعہ بنوریہ میں علوم اسلامیہ کی تدریس کے ساتھ ہی خدمت خلق کا بھی ایک اہم شعبہ ہے، اس کی ایک اہم غرض یہ بھی ہے کہ خدمت خلق کے ذریعہ لوگوں کو مدارس سے جوڑنا اور پروپگنڈوں کا مثبت جواب دینا۔ چنانچہ اس کے لئے ”ملک کے مختلف علاقوں میں اسپتال قائم کرنا اور ان کی وساطت سے مریضوں کو ایسبولینس اور دوسری ضروریات فراہم کرنا“ (حسن تدبیر، مدارس نمبر، ایڈیٹر اعجاز عرفی قاسمی صفحہ ۱۵۳ فروری ۲۰۱۱، ۲۵/ق) اس مدرسہ میں عام طلبہ کو بھی عام مدارس کے مقابلہ میں زیادہ سہولیات فراہم کی جاتی ہیں لیکن اس کے شعبہ بیرونی میں جس میں یورپی ممالک سے طلبہ آتے ہیں ان کی نفسیات کا خاص خیال رکھنے کے لیے ان کے لیے اعلیٰ معیار کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے بنوائے گئے ہیں۔ اس شعبہ میں اس وقت درجہ حفظ میں ۱۵ کلاسیں اور درجہ کتب میں ۶ کلاسیں ہیں۔ اور زیر تعلیم طلبہ کی تعداد ۵۰۰ ہے۔ شعبہ بیرونی کے طلبہ کو جو سہولیات فراہم کی گئی ہیں وہ یوں ہیں:

- ۱۔ طلبہ کی رہائش کے لیے ایر کنڈیشنڈ کمرے
- ۲۔ کلاسوں میں بیٹھنے کے لیے قالینوں کا انتظام
- ۳۔ طلبہ کو ناشتہ اور کھانا حسب مینو فراہم کرنا
- ۴۔ طلبہ کو ایئر پورٹ آنے جانے کی سہولت
- ۵۔ طلبہ کے کپڑے دھونے کے لیے لائڈری کا نظم
- ۶۔ ٹھنڈے اور گرم پانی کی سہولت



۷۔ طلبہ کے علاج کے لیے اچھے اسپتال کا نظم

۸۔ ویزے اور ایئر ٹکٹ کے تمام معاملات کی سہولیات (ایضاً صفحہ ۱۵۵)۔

جامعہ بنوریہ میں لڑکیوں کی تعلیم کا بھی اعلیٰ نظم ہے، جن میں غیر ملکی لڑکیاں بھی کافی تعداد میں پڑھتی ہیں۔ اس جامعہ میں اردو اور انگریزی میں ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ وہ اپنی ویب سائٹ پر فتویٰ سروس مفت فراہم کرائی ہوئی ہے۔ نیز بنوریہ ویلفیئر ٹرسٹ کے نام سے خدمت خلق کا جو شعبہ ہے اس کے تحت فری ایمو لینس اور دو باقاعدہ کلینک قائم ہیں۔ ضرورت مندوں کو مفت راشن بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ نے ۵۰ بیڈ کا اسپتال بھی قائم کیا ہے، جس میں طلبہ کے علاوہ علاقہ کے نادار و غریب لوگوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ اس میں آپریشن، ایکس رے، الٹرا سائونڈ، ای سی جی رپورٹ وغیرہ کی سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔ (۴) خدمت خلق کے ذریعہ یہ ادارہ عوام سے بھی جڑا ہوا ہے اور یہ اس کا بڑا کارنامہ ہے، جس سے ہندوستانی مدارس بھی سبق سیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان اداروں کو بھی سرکاری گرانٹ نہیں ملتی ہے۔ ان کی ذرائع آمدنی بالکل وہی ہیں جو ہندوستانی مدارس کے ہیں، اصل مسئلہ وژن کی وسعت کا ہے۔

## دارالعلوم کراچی

یہ جامعہ برصغیر کے معروف مفتی و فقیہ مولانا مفتی محمد شفیع کا قائم کردہ ہے، ۱۹۵۱ میں اس کی تاسیس ہوئی۔ اب ان کے بڑے صاحبزادے مفتی محمد رفیع عثمانی اس کے ناظم اعلیٰ ہیں دارالعلوم کراچی میں اقامت پذیر طلبہ کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے جن کی تمام ضرورتوں کا یہ کفیل ہے۔ مفتی محمد تقی عثمانی یہاں کی معروف علمی شخصیت ہیں جن کی بین الاقوامی شہرت اس کے لیے باعث فخر ہے۔ آج مفتی تقی عثمانی حدیث و فقہ کے میدان میں علمی دنیا کا ایک معروف نام ہیں، ہندوستان رقبہ میں بھی پاکستان سے کافی بڑا ہے۔ اور مسلمانوں کی تعداد بھی یہاں پاکستان کے مقابل کہیں زیادہ ہے، مگر پورے ہندوستان میں اس وقت کوئی بھی علمی شخصیت، کسی بھی مکتب فکر

میں ایسی نہیں جو مفتی تقی عثمانی کے آس پاس بھی پہنچتی ہو۔ دارالعلوم کراچی میں پاکستانی طلبہ کے علاوہ، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، افغانستان، بنگلہ دیش، برما، تھائی لینڈ، کناڈا، جرمنی، امریکہ، ویسٹ انڈیز اور ترکی وغیرہ مختلف ممالک کے طلبہ بھی یہاں پڑھنے آتے ہیں۔ دارالعلوم نے طلبہ کی سہولتوں پر خاص طور پر دھیان دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی رہائش اور قیام و طعام پر ایک بڑا صرفہ آتا ہے۔ ”اگر رہائشی کمروں کی بات کی جائے تو عصری تعلیم گاہوں کے طرز پر ہر طالب علم کے لیے الگ چارپائی، میز، الماری، ریک، بلب اور پنکھا مختص کیا گیا ہے، ہر دو کمروں کے فاصلے پر گیس کا ایک چولہا نصب کر دیا گیا ہے۔ ٹھنڈے پانی کے لیے ہر عمارت میں واٹر کولر دست یاب کرائے گئے ہیں“ (ایضاً صفحہ ۱۵۷) یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں کا معروف مجلہ ”البلاغ“ گزشتہ چھ سالوں سے انگریزی میں بھی شائع ہو رہا ہے اور بڑے پیمانے پر جدید تعلیم یافتہ طبقوں میں خاصا مقبول ہے۔ ہندوستان میں مدارس تو دور اسلامی تحریکیں اور تحقیقی ادارے بھی آج تک کوئی ڈھنگ کا پرچہ انگریزی میں نہیں نکال سکے۔

دارالعلوم کراچی میں پرائمری اور سیکنڈری اسکول بھی ہیں جن میں عصری علوم کی مقبول تعلیم کا نظم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دارالعلوم کا کتب خانہ بھی ملک کے مشہور کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے جس میں تنظیم کتب کا طریقہ اعلیٰ ترین، جدید اور کمپیوٹرائزڈ ہے۔ اور بھی باتیں ہیں، مگر ان کی تفصیل سے گفتگو موضوع سے ہٹ جائے گی۔

### جامعہ علوم اسلامیہ کراچی

یہ بھی بنوری ٹاؤن کراچی میں ہے اس کی بنیاد مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے ڈالی تھی جن کا مختصر سا تذکرہ اوپر گزرا۔ اس جامعہ کا بجٹ چھ کروڑ سالانہ سے بھی زیادہ ہے اور یہاں ۶۰ سے زیادہ ممالک کے طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس جامعہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عمر دراز افراد کی تعلیم کا باضابطہ نظم ہے ”بلکہ جامعہ کے خدام اور متعلقین جامعہ کے لیے بھی اس میں

شرکت کو لازمی کر دیا گیا ہے۔ اس شعبہ میں قرب و جوار میں رہنے والے اور دکانوں میں کام کرنے والے افراد کے لیے قرآن کریم کو تجوید کے ساتھ پڑھانے کے معیاری نظم کے ساتھ ان کو دین کی بنیادی باتوں سے واقفیت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ مغرب کے بعد اس قسم کی کلاسز لگتی ہیں۔ ان کا باقاعدہ امتحان ہوتا ہے اور اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہونے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے“ (ایضاً صفحہ 163)۔

### جامعۃ الرشید کراچی

اس جامعہ نے اپنے نصاب و نظام تعلیم کو جدید و قدیم کے امتزاج سے زمانہ حاضر سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی ہے، اس کا نظام شورائی ہے۔ عام طور پر مدارس میں سیکورٹی کا کوئی نظم نہیں ہوتا مگر اس جامعہ میں حفاظتی انتظامات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ سیکورٹی کا پورا عملہ ہے، ویڈیو واج کے لیے کنٹرول روم بنائے گئے ہیں، زائرین اور مہمانوں کی فوٹیج بھی رکھی جاتی ہے، ان کے سامانوں کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ برصغیر کے مدارس میں موبائل، لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر کے استعمال کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا ہے، انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس دور میں کیا یہ قابل تعجب نہیں کہ مظاہر علوم سہارنپور میں طلبہ کے لیے موبائل رکھنا ممنوع ہے، طلبہ سے اس بارے میں نہ صرف باز پرس ہوتی ہے بلکہ ان کا اخراج بھی کر دیا جاتا ہے (ایضاً صفحہ 165) جامعۃ الرشید کراچی میں اس بارے میں زبردست فراخ دلی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”جامعہ میں وائرلیس روٹر (Router) کی سروس دستیاب ہے، جس سے موبائل یا لیپ ٹاپ پر بغیر تاروں کے انٹرنیٹ خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جامعہ کے تمام دفاتر کو کمپیوٹرنیٹ ورکنگ کے ذریعہ مربوط کر دیا گیا ہے۔ جامعہ میں کمپیوٹر استعمال کرنے والے تیز رفتار انٹرنیٹ کی سہولت فراہم کی گئی ہے، جامعہ میں تعلیمی اور پروفیشنل کاموں کے لئے انٹرنیٹ کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

طلبہ کی سہولتوں کا خیال رکھتے ہوئے جہاں مطبخ کے علاوہ جامعہ کے احاطہ میں ہی کینٹین کا انتظام ہے، جہاں طلبہ قیمتاً اپنی پسند کے کھانے کھا سکتے ہیں۔ وہیں جدید ترین ٹکنالوجی سے طلبہ کو واقف کرانے اور اس کے دور رس اور پائے دار نتائج سے آگاہ اور واقف کرانے کے لیے ۳ کمپیوٹر لیب ہیں جن میں ۶۰ سے زیادہ فل لوڈڈ کمپیوٹروں کی خدمات حاصل ہیں اور یہ ہمارے مدارس کے ذمہ داران کے لیے باعث حیرت ہوگا کہ جامعہ کے احاطہ میں آج کل کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے بین الاقوامی معیار کا سوئمنگ پول بھی بنایا گیا ہے، جس میں طلبہ اور اساتذہ طے شدہ نظام الاوقات کے مطابق تیراکی سیکھتے ہیں۔ طلبہ میں کھیل کے ذوق کو پروان چڑھانے اور ان کو صحت مند اور چاق و چوبند بنانے کے لیے کھیل کا میدان بھی بنایا گیا ہے۔ جہاں وہ والی بال، ریس، پٹھو گرم، فریسی اور کرائے میں حصہ لیتے ہیں“ (ایضاً صفحہ ۱۶۵)۔

باوجود اس کے کہ پاکستانی مدارس کو بالخصوص طالبان کا گڑھ اور دہشت گردی کا مرکز اور نہ جانے کیا کیا کیا جاتا ہے، جس میں لال مسجد کے سانحہ نے اور زیادہ شدت پیدا کر دی ہے، ہم نے ان چند مدارس کے احوال ذرا تفصیل سے اس لیے بیان کیے ہیں کہ ان اداروں نے اپنے ذہن و دماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھی ہیں۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں ان تمام عصری تقاضوں پر لبیک کہنا ضروری ہے جو مدارس کے منشور اور ان کے دائرہ کار سے متضاد و متصادم نہ ہوں، یہ ساری سہولیات اس لیے بھی بیان کی گئی ہیں کہ آج معیاری طعام و رہائش کا تصور ان جدید لوازمات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یونیورسٹی و کالجز کے ہاسٹلوں میں طلبہ کا جو معیار رہائش اور کھانے پینے کا جو نظم ہے، وہاں طلبہ کو جو آزادیاں دی جاتی ہیں ان کا ڈائریکٹ اثر ان کی عملی زندگی پر پڑتا ہے۔ یقیناً اس کے بہت سے مضر اور منفی اثرات بھی ہیں، لیکن مفید و مثبت اثرات زیادہ ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں دینی مدارس میں آنے والے طلبہ کے پس منظر کی کھوج بالکل غیر ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اعلیٰ اور خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ



مدارس میں کم آتے ہیں، مجموعی طور پر اہل مدارس کے تنزل میں یہ بھی ایک عامل ہے، مگر طلبہ کے سامنے اونچا نصب العین ہو، انہیں اچھی سہولیات دی جائیں تو نسبتاً نادار اور مفلوک الحال گھرانوں سے آنیوالے طلبہ بھی کما حقہ ترقی کر سکتے ہیں اور زندگی کے میدانوں میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔

بعض مدارس کی یہ تفصیلات اس لیے بھی بیان کی گئی ہیں کہ اہل مدارس کے پاس بالعموم یہ عذر لنگھتا ہے کہ ”ہم اپنے مختصر سے بجٹ سے اتنی ساری سہولیات کہاں سے دے سکتے ہیں“ لیکن جو مدارس یہ کر رہے ہیں وہ بھی بغیر کسی سرکاری گرانٹ کے عوامی چندوں سے حاصل ہوئے فنڈز سے ہی کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ہمارے مدارس مذکورہ پاکستانی مدارس کے معیار کو قائم نہیں کر سکتے ہیں تو اس سے کچھ کم معیار تک تو پہنچ ہی سکتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ عام مدارس یہ نہیں کر سکتے تو یقیناً دیوبند، مظاہر علوم، ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الفلاح، جامعہ سلفیہ بنارس اور جامعہ دارالسلام عمر آباد وغیرہ تو یہ چیزیں فراہم کر سکتے ہیں۔ اگر ”کواں (مہاراشٹر) کا مدرسہ آئی آئی ٹی کالج اور میڈیکل کالج چلا سکتا ہے تو یہ بڑے مدارس کیوں نہیں چلا سکتے۔“

بات گھوم پھر کر وہی اہل مدارس کی فکری پس ماندگی، معلومات کی کمی، ایمانداری اور شفافیت کے نہ ہونے اور سیاست بازیوں تک پہنچے گی۔ مسلمان عام طور پر سازشی تھیوری میں جیتے ہیں۔ ان کی باریش و بے ریش قیادت ان کو غالباً انہی اوہام و خرافات میں مبتلا رکھنا چاہتی ہے تاکہ اس کی اپنی دکان چلتی رہے۔ جب تک یہ چیز ختم نہیں ہوتی، فکری رویے درست نہیں ہوتے اور مسلمان عموماً اور علماء و اہل مدارس خصوصاً مثبت و ایجابی انداز نظر پیدا نہیں کرتے۔ وہ مدارس کی اصلاح کے لیے عملی اقدامات کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں گے۔



## دینی مدارس و مکاتب میں تنبیہ و تادیب

☆ مولانا نور الحق رحمانی ☆

انسان کا انسان بننا، مہذب اور شائستہ ہونا اور انسانی صفات سے آراستہ ہو کر اللہ کی بندگی اور انسانیت کی خدمت کا فریضہ انجام دینا اس کی صحیح تعلیم و تربیت پر موقوف ہے۔ اس مقصد کے لئے اللہ رب العزت نے ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، اور انہوں نے ہر دور میں یہ مقدس فریضہ انجام دیا۔ بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے بعد جب ضلالت و گمراہی زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلی تو انسانیت کو جہالت و ضلالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لئے اللہ رب العزت نے سلسلہ نبوت و رسالت کی آخری کڑی سید الانبیاء اور نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے اپنی مثالی تعلیم و تربیت کے ذریعہ عرب کی وحشی اور بد و قوم کی کاپاپلٹ دی، اور انہیں انسانیت کا معلم بنایا۔ نبی آخر الزماں کی بعثت کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: **هو الذي بعث في الاميين رسولا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة** (الجمعة ۲) وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

کتاب اللہ کی آیات کی تلاوت، تزکیہ نفس، اور تعلیم کتاب و حکمت نبی رحمت کے فرائض منصبی میں داخل ہیں۔ خود پیغمبر علیہ السلام نے اپنا تعارف معلم کی حیثیت سے کرایا، فرمایا:

☆ استاذ المعبد العالی، پھلواڑی شریف، پٹنہ

إنما بعثت معلما، اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو قیامت تک کے انسانوں کیلئے اسوہ اور نمونہ قرار دیا گیا: لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوة حسنة (الأحزاب ۲۱) یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی نظام تعلیم و تربیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اور آپ کے پاکیزہ طریقہ تعلیم و تربیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلم ہیں اور سارے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کے شاگرد ہیں، استاذ کا شاگردوں سے کیا رشتہ ہوتا ہے اور دونوں کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمان کے ذریعہ کی ہے: إنما انا لکم مثل الوالد للولد أعلمکم (سنن الدارمی ۱۸۲) یعنی میں تمہارے لئے ایسا ہوں جیسا باپ اپنی اولاد کے لئے ہوتا ہے۔ ہر انسان کی نظر میں اس کی اولاد سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے، وہ دل سے اس کی ترقی کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ لاکھ جتن کر کے اسے آگے بڑھانا چاہتا ہے اور اسے اپنے سے زیادہ بہتر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے، گویا اولاد انسان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتی ہے؛ اس لئے ہر استاذ کو اپنے شاگردوں کے تئیں اسی کردار اور ایسے ہی پاکیزہ جذبات کا حامل ہونا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی تعلیم و تربیت جس پیارے طریقے پر فرمائی ہے اس کی بہت سی مثالیں سیرت نبوی اور احادیث کے ذخیرے میں ملتی ہیں، نمونہ کے طور پر ہم دو تین واقعات ذیل میں نقل کر رہے ہیں:

۱ - عن معاوية بن الحكم السلمي قال: بینا أنا أصلي مع رسول الله صلی الله عليه وسلم إذ عطس رجل من القوم فقلت: یرحمک الله، فرماني القوم بأبصارهم فقلت: واثكل أمیاء ما شأنکم تنظرون إلیّ فجعلوا یضربون بأیدیهم علی أفخاذهم فلما رأیتهم یصمتونی لکنی سکت، فلما صلی رسول الله صلی الله عليه وسلم فبأبی هو وأمی ما رأیت معلما قبله ولا بعده أحسن

تعلیماً منه فوالله ما قهرنی ولا ضربنی ولا شتمنی ثم قال: إن هذه الصلوة لا یصح فیها شیء من کلام الناس إنما هو التسمیح والتکبیر وقراءة القرآن (مسلم، کتاب المساجد: باب تحریم الکلام فی الصلاة)۔

حضرت معاویہ بن حکم سلمی سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ ہم میں سے ایک شخص کو چھینک آگئی، میں نے کہا: یرحمک اللہ، تو لوگوں نے مجھے گھورنا شروع کر دیا، میں نے کہا کہ کاش مجھ پر میری ماں رو چکتی (یعنی میں مرجاتا) تم کیوں مجھ کو گھورتے ہو، یہ سن کر وہ لوگ اپنے ہاتھ رانوں پر مارنے لگے، جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھ کو پیپ کرانا چاہتے ہیں تو میں چپ ہو رہا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے۔ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں کہ میں نے آپ سے پہلے اور آپ کے بعد آپ سے بہتر معلم نہیں دیکھا۔ تو اللہ کی قسم نہ آپ نے مجھ کو جھڑکا، نہ مارا، نہ برا بھلا کہا، صرف یہ فرمایا کہ نماز میں دنیا کی باتیں کرنا درست نہیں ہے، اس میں تو تسبیح، تکبیر اور قرآن کریم کی تلاوت ہے۔

۲۔ اور سیرت نبوی کا یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے کہ اتنے میں ایک اعرابی آیا اور مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا، صحابہ نے دیکھا تو مشتعل ہو کر اس کی طرف لپکے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اسے پیشاب کرنے سے مت روکو، جب وہ پیشاب کر چکا تو آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اس جگہ ایک ڈول پانی مار کر اسے بہا دو، پھر اسے قریب بلا کر نہایت شفقت و محبت کے انداز میں سمجھایا کہ مسجد عبادت اور تلاوت کی جگہ ہے، پیشاب اور قضائے حاجت کی جگہ نہیں (ابوداؤد)۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالی تعلیم و تربیت سے متعلق ایک واقعہ اور قابل

ذکر ہے:

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ قریش کا ایک نوجوان دربار نبوی



میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے زنا کی اجازت دیجئے۔ پس لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور سب نے اس کو ڈانٹا اور چپ چپ کہنا شروع کیا۔ بعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ تم میرے قریب آ جاؤ، چنانچہ وہ آپ کے قریب آ گیا، آپ نے اس سے فرمایا: کیا تم اس کو پسند کرو گے کہ کوئی تمہاری ماں کے ساتھ زنا کرے؟ اس نے کہا: نہیں یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر قربان کرے۔ آپ نے فرمایا: ایسا ہی تمام لوگ اپنی ماؤں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند نہیں کریں گے، پھر فرمایا: کیا تم اپنی بیٹی کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند کرو گے؟ اس نے کہا: نہیں یا رسول اللہ! اللہ مجھ کو آپ پر قربان کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح لوگ اپنی بیٹیوں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند نہیں کریں گے، پھر آپ نے فرمایا: کیا تم اپنی بہنوں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند کرو گے؟ اس نے کہا: نہیں یا رسول اللہ، اللہ مجھ کو آپ پر قربان کرے، آپ نے فرمایا: اسی طرح لوگ اپنی بہنوں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند نہیں کریں گے، پھر آپ نے فرمایا: کیا تم اپنی پھوپھی کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند کرو گے، اس نے کہا: نہیں یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر قربان کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح لوگ اپنی پھوپھیوں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند نہیں کریں گے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اپنی خالہ کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند کرو گے؟ اس نے کہا: نہیں یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر قربان کرے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح لوگ اپنی خالائوں کے ساتھ کسی کے زنا کرنے کو پسند نہیں کریں گے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ اس پر رکھا اور یہ دعا فرمائی: اے اللہ اس کے گناہ کو بخش دے، اس کے دل کو پاک کر دے اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت کر (کہ حرام میں مبتلا نہ ہو)۔ راوی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہ نوجوان کسی چیز کی طرف التفات نہیں کرتا تھا (یعنی اسے اس گناہ سے نفرت ہو گئی اور کبھی اس نے اس کی طرف توجہ نہ کی)۔

ہمارے معلم اول نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور اصلاحی طریقے کے چند نمونے گزرے، ان کا آج کے حالات، ہمارے تعلیمی اداروں اور دینی درسگاہوں سے موازنہ کیا جائے تو پتہ چلے گا دونوں کے درمیان اس معاملے میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے، سرکاری اسکولوں اور عصری تعلیمی اداروں میں تو اب حالات بڑی حد تک بدل چکے ہیں کہ وہاں جسمانی سزا کی قانوناً اجازت نہیں ہے، اس لئے بڑی حد تک اس کا رواج ختم ہو چکا ہے لیکن دینی مدارس کی حالت اب بھی قابل رحم ہے۔ اور حفظ خانوں میں تو واقعی مار پیٹ کے بغیر تعلیم کا تصور ہی نہیں ہے، اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ بہت سے بچے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں بلکہ بہت سے لوگ تو دینی تعلیم بلکہ دین ہی سے متنفر اور بیزار ہو جاتے ہیں۔ ماہرین تعلیم فرماتے ہیں کہ استاذ کی پیشانی پر محبت کی تحریر ہونی چاہئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند جن کا شمار ملک کے ممتاز ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے اور جن کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تربیت میں گزرا، انہوں نے استاذ کے بارے میں لکھا ہے کہ ”اس کی کتاب زندگی کے سرورق پر محبت لکھا ہو“۔ یہ گویا اسی حقیقت کی ترجمانی ہے جس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں فرمائی ہے کہ استاذ طالب علم کے لئے بمنزلہ باپ کے ہے، نیاز فتح پوری نے ایک دینی مدرسہ اور حفظ خانہ کے بارے میں لکھا ہے:

دوسری چیز جس نے مجھے مذہنیت کی طرف سے بد دل کیا اس مدرسے کا حفظ خانہ تھا۔ یہ بڑا قدیم ادارہ تھا جس میں طلبہ کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا۔ حافظ قادر بخش..... اس ادارے کے تنہا ذمہ دار تھے۔ اور جس بے دردی سے قرآن حفظ کراتے تھے اس کے خیال ہی سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس حافظ خانہ میں جو واقعی عذاب خانہ تھا مجھے واسطہ نہیں پڑا، لیکن یہاں جو عذاب بچوں پر نازل ہوتا تھا اس سے میں کیا شہر کا ہر شخص واقف تھا۔ صبح سے دوپہر تک حافظ خانہ کی چیخ و پکار، حافظ قادر بخش کی ستم رانیاں اور بچوں کی آہ و بکا ہر وقت

کانوں میں پڑتی رہتی تھی۔ بچوں کے جسم بید کے ضربات سے لہولہان اور دیواروں سے ٹکرائے کر ان کے سروں کو زخمی کرنا اس ظالم و بے رحم حافظ کا دستور تھا۔ مجھے اس سے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ کبھی کبھی میں والد صاحب سے کہہ دیا کرتا تھا کہ اگر قرآن کا حفظ کرانا اس حد تک ضروری ہے کہ بچے کا جسم و دماغ دونوں کو مجروح و بے کار کر دیا جائے تو قرآن سے انکار ہی بہتر ہے۔ بہر حال، مدرسہ اسلامیہ میں (عربی کے استاذ) مولانا نور محمد صاحب کی سخت گیری اور حد سے بڑھے ہوئے تقشف اور حافظ خانہ کے وجود نے جو بالکل ایک مذبح کی حیثیت رکھتا تھا میرے اندر مذہب کی طرف سے احترام کی ایک خاص کیفیت پیدا کر دی تھی اور میں سوچا کرتا تھا کہ اگر اسلام یہی ذہنیت پیدا کرتا ہے تو یہ کوئی معقول مذہب نہیں (شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا)۔

اس دور کے ممتاز عالم دین ڈاکٹر یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

”بعض لوگ تعلیم کے سلسلے میں خاص طور پر چھوٹے بچوں کے لئے مار پیٹ کا طریقہ اپناتے ہیں۔ آج کے ماہرین تربیت اس طریقے کو بالکل مسترد کرتے ہیں۔“ حقیقت بھی یہی ہے کہ مار پیٹ بنیادی طور پر ممنوع ہونی چاہئے؛ کیونکہ وہ نرمی کے اصول کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے لئے نمونہ ہمارے معلم اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ آپ کے خاص خادم حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے کبھی کسی کو نہیں مارا، نہ کسی عورت کو نہ کسی خادم کو نہ کسی جانور کو (بخاری)۔

اسلام میں بچوں پر ہاتھ اٹھانے کی بات صرف ایک جگہ ملتی ہے، وہ ہے بالغ ہونے سے پہلے نماز کی عادت ڈالنے کے سلسلے میں؛ تاکہ وہ بالغ ہونے کے بعد نماز کے عادی و پابند رہیں۔ حدیث میں آتا ہے: بچے جب سات برس کے ہو جائیں تو انہیں نماز کا حکم دو اور دس برس کے ہو جائیں (اور نماز نہ پڑھیں) تو مارو (ابوداؤد)۔ یہاں بالکل بچپن میں مارنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ اس کی اجازت دس برس کی عمر ہو جانے کے بعد اور وہ بھی تین برسوں تک نماز کا شوق

دلانے اور اس کی عادت ڈالنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کے بعد ہی ہے۔ ایسی حالت میں مارنے کی اجازت کا مقصد اولاد کو یہ احساس دلانا ہے کہ باپ اس معاملے میں کتنا زیادہ سنجیدہ اور خواہشمند ہے اور خود نماز کی کتنی اہمیت ہے جس سے غفلت نہیں برتی جاسکتی (تعلیم کی اہمیت سنت نبوی کی روشنی میں، مولفہ علامہ یوسف قرضاوی، ص: ۱۴۱)۔

دین اسلام کی تعلیم سراسر سیر، سہولت، نرمی اور نصیح و خیر خواہی پر مبنی ہے۔ ظلم و تشدد اور سختی کو ناپسند کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ارحم الراحمین ہے، اپنے آخری پیغمبر کو اللہ نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ بڑے رحیم اور شفیق تھے، ان کی معمولی سی تکلیف اور پریشانی بھی آپ کو گوارہ نہ تھی۔ ارشاد باری ہے: لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ (التوبہ: ۱۲۷) تمہارے پاس ایک ایسے رسول تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں، ایمان والوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔

اور دوسری جگہ آپ کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا:

فِيمَا رَحِمَهُ مِنَ اللَّهِ لَنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران، ۱۵۹) اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں، اور اگر آپ بد زبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔

عرب کی ناخواندہ اور جہالت اور گمراہی میں ڈوبی ہوئی قوم کی اصلاح و ہدایت اور تعلیم و تربیت کے میدان میں آپ کو یہ زبردست کامیابی اسی لئے حاصل ہوئی کہ اللہ کی توفیق اور اس کے فضل و کرم سے آپ ان کے لئے بالکل نرم ہو گئے تھے کہ لوگوں کا آپ سے دین و اخلاق سیکھنا آسان ہو گیا۔ ورنہ اگر آپ سنگ دل، تند مزاج اور بداخلاق ہوتے تو لوگوں کا سارا مجمع



منتشر ہو جاتا اور فیضیاب نہ ہو سکتا۔ یہی شان ہر استاذ کی ہونی چاہئے کہ طلبہ ان کے نرم رویے، حسن سلوک اور بلند اخلاق کے گرویدہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو بھی نرمی ہی کی تعلیم دی: علموا ویسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا (مسند احمد) علم سکھاؤ، آسانی کا معاملہ کرو، دشواری پیدا نہ کرو، بشارت سناؤ اور لوگوں کو متنفر نہ کرو۔

یہ حدیث تعلیم ہی سے متعلق ہے۔ اس میں تعلیم کی راہ میں نرمی برتنے اور دل آزاری و اہانت کا سلوک کرنے سے منع فرمایا گیا ہے؛ لیکن اس سے زندگی کے دیگر امور میں بھی یہی ہدایت ملتی ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

یا عائشة۔ إن الله رفيق يحب الرفق، ويعطي على الرفق ما لا يعطي على العنف (مسلم) اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نرم خو ہے، نرم خوئی کو پسند کرتا ہے، اور نرم خوئی پر وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو سختی اور درشتی پر نہیں عطا کرتا۔ (پتہ چلا کہ نرمی سے وہ کام بن جاتا ہے جو سختی سے نہیں بنتا)۔

اب اگر ہمارے مدارس میں طلبہ کے ساتھ توہین آمیز سلوک، ظالمانہ برتاؤ، حد سے زیادہ زد و کوب ہوتا ہے اور ہمیشہ چھڑی اور ڈنڈے کا استعمال ہوتا ہے تو یہ چیز شریعت کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ قرآن کریم میں جہاں نافرمان بیوی کی تادیب کے شرعی اصول بیان کئے گئے ہیں وہاں ترتیب وار تین تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، زبانی فہمائش اور پند و نصیحت، وقتی طور پر ترک تعلق اور آخری مرحلے میں جبکہ پہلی دونوں تدبیریں ناکام ہو جائیں، ہلکی سرزنش اور جسمانی سزا کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن اس کی حد بندی کر دی گئی ہے۔ مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ مار مسواک یا رو مال وغیرہ سیہو محض سے ہو کے واسطے، توہین اور ایذا رسانی مقصود نہ ہو، ضرب مبرح جس کی وجہ سے جسم پر نشانات ابھر آئیں اس کی اجازت کسی

حال میں نہیں ہے۔ چہرہ پر مارنے کو سختی سے منع کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ تم میں سے شریف لوگ ایسا نہیں کریں گے یعنی وہ مار کی سزا سے بچیں گے۔

ان واضح ہدایات اور نبوی تعلیمات کی روشنی میں بچوں کے ساتھ اس ظلم و تشدد، ذلت آمیز سلوک اور بے رحمانہ زد و کوب کا کوئی شرعی، قانونی اور اخلاقی جواز نہیں نکلتا جس کا تذکرہ نیاز فتح پوری نے کیا ہے۔ اور یہ کوئی فرضی داستان نہیں ہے، اس میں کچھ مبالغہ آرائی ہو سکتی ہے لیکن بڑی حد تک حقیقت کی ترجمانی ہے۔ بچپن سے مدارس ہی کے ماحول میں زندگی گزر رہی ہے، اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھا ہے اور تجربہ کیا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے مدارس میں جسمانی سزا کے سلسلے میں حد درجہ غلو پایا جاتا ہے۔ پہلے سرکاری اسکولوں میں بھی مار پیٹ کا رواج تھا؛ لیکن جب سے اسے قانوناً ممنوع قرار دیا گیا اس وقت سے آج تک اس میں بڑی کمی واقع ہو چکی ہے، لیکن ہمارے دینی مدارس و مکاتب کا حال زیادہ نہیں بدلا ہے۔ اور درجہ حفظ میں تو واقعی بغیر زد و کوب کے تعلیم کا تصور ہی نہیں ہے۔ طالب علمی ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ درجہ حفظ کے ایک نہایت ذہین طالب علم کی ایسی سخت پٹائی ہوئی کہ بد دل ہو کر وہ بھاگ گیا اور مدرسے کی تعلیم چھوڑ کر اسکول میں نام لکھا لیا۔ ایک طالب کو استاذ نے اتنی زور سے کان پر طمانچہ مارا کہ اس کی قوت شنوائی متاثر ہو گئی، وہ کہتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ کان میں ہمیشہ ڈھول بج رہا ہے۔ سال گذشتہ ایک سفر کے دوران متعدد مدارس میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، ایک حفظ خانے میں دیکھا کہ استاذ طالب علم کو بری طرح چہرے پر بار بار مار رہے ہیں جبکہ چہرے پر مارنے کی صریح ممانعت موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نمونہ کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ نماز میں بولنا، نوک جھونک کرنا، مسجد میں پیشاب کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زنا جیسی بے حیائی کی اجازت چاہنا کتنے سنگین جرائم ہیں۔ اگر آج کوئی نوجوان ایسی غلطی کا ارتکاب کرے تو نہ صرف یہ کہ لوگ اسے ڈانٹ ڈپٹ کریں بلکہ مار پیٹ کر مجلس سے نکال دیں گے۔ لیکن رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر نہ غیظ و غضب کا اظہار کیا، نہ ڈانٹ ڈپٹ کیا بلکہ قریب بلا کر نرمی اور خیر خواہی کے ساتھ انہیں سمجھایا بچھایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اصلاح ہو گئی، وہ نہ صرف اپنی غلطی سے باز آئے بلکہ انہیں ان گناہوں سے نفرت ہو گئی اور پھر انہوں نے کبھی اس کی طرف رخ نہیں کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے عاشق اور گرویدہ ہوئے کہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ جیسا معلم نہ آپ سے پہلے دیکھا نہ آپ کے بعد۔ غزوہ احد کے موقع پر کھائی پر مقرر اصحاب کی غلطی کی بنا پر جیتی ہوئی لڑائی شکست میں تبدیل ہو گئی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے، دندان مبارک شہید ہوا؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کوئی سرزنش نہیں فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے بھی وحی کے ذریعہ آپ کو عفو و درگزر کی تلقین فرمائی، فاعف عنہم واستغفر لہم وشاورہم فی الامر (آل عمران/۱۵۹)۔

طالب علم اگر تعلیم کے سلسلے میں غفلت اور لاپرواہی برتے یا کسی سخت جرم کا مرتکب ہو تو زبانی فہمائش سے کام لینا چاہئے، تنہائی میں بلا کر اگر اسے سمجھایا جائے تو یہ طریقہ زیادہ مفید اور کارگر ہے، اور اصلاح کی زیادہ توقع ہے۔ اگر اس سے کام نہ چلے تو ہلکی سرزنش کی اجازت ہو سکتی ہے لیکن اس سلسلے میں درج ذیل ہدایات ملحوظ رکھی جائیں:

۱۔ جسم کے نازک مقامات چہرہ اور سر وغیرہ پر نہ مارا جائے کہ سر اکثر حواس کا مرکز ہے، اور اس سے حواس کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔

۲۔ مار پیٹ ایسی سخت نہ ہو جو ضرب مبرح کے دائرہ میں آتی ہے یعنی جسم پر نشانات کا ابھر آنا، بچے کا لہو لہان ہو جانا یا کسی عضو کا معطل ہو جانا وغیرہ۔

۳۔ مار پیٹ غصے اور اشتعال کی حالت میں نہ ہو کہ یہ ایک غیر معتدل حالت سے ہوتی ہے اور اس میں زیادتی کا سرزد ہونا امر غالب ہے۔

۴۔ سزا انتقامی جذبے سے نہ ہو۔ اس سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو

پیش نظر رکھا جائے۔

۵۔ کسی سامان کے تلف ہو جانے کے نتیجے میں سزا نہ دی جائے کہ برتن کے ٹوٹنے اور سامان ضائع ہو جانے پر عورتوں کو اور خادموں کو زد و کوب کرنے کی ممانعت وارد ہے: لا تضربوا إماء الله على كسر الأواني فإن لها آجالا كآجالكم۔

۶۔ سزا کے سلسلے میں ہمیں دوسرے تعلیمی اداروں سے زیادہ محتاط ہونا چاہئے تاکہ دین اور علماء دین سے بدگمانی نہ ہو اور دین سے نفرت اور دوری پیدا نہ ہو۔

۷۔ سزا کے اصول مرتب کرنے میں خود طلبہ سے مشورہ کیا جائے اور رائے لی جائے تاکہ سزا کا تحمل آسان ہو ورنہ بغاوت کا خطرہ ہے۔

۸۔ سزا کے ساتھ طلبہ کی ہمت افزائی کے لئے انعامات بھی ہوں، ورنہ صرف سزا سے بگاڑ کا پیدا ہونا یقینی ہے۔





# عصری اور علوم اسلامیہ کو ایک نئے تعلیمی انقلاب سے ہمکنار کرنے کی فوری ضرورت

پروفیسر احمد سجاد ☆

ایک ایسے عہد میں جب اضافہ آبادی کے ساتھ سائنس و ٹکنالوجی، میڈیا اور ابلاغی ذرائع نے تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کے میدانوں میں بھی ایک انقلاب برپا کر دیا ہے اور ہر قسم کے دینی و دنیوی علوم و فنون کے حصول کو سہل ترین بنا کر علمی معاشرہ کی تشکیل شروع کر دی ہے۔ امت مسلمہ کی روایتی سوچ اور اپنی تعلیمی و تہذیبی اور معاشی پسماندگی کا ماتم و مرثیہ انتہائی حیرت انگیز اور المناک ہے۔

بیسویں صدی کے آخر سے علمی دھماکے (Knowledge Explosion) کے نتیجے میں موجودہ عالمی معاشرہ تیزی سے مندرجہ ذیل چار خصوصیات کا حامل بنتا جا رہا ہے۔

۱۔ علمی معاشرہ (Knowledge Based Society)

۲۔ تعلیمی عالمگیریت (Internationalization of Education)

۳۔ تعلیم سب کے لیے (Education for all)

۴۔ تا حیات حصول تعلیم کی سہولیات (Life long Education)

اس صورت حال نے درس و تدریس کے میدان میں ذیل کے تین مزید انقلاب انگیز

☆ راجھی، جھارکھنڈ

اقدامات کیے ہیں:

۱- فاصلاتی تعلیم (Distance Education)

۲- آن لائن تعلیم (Online Education)

۳- پیشہ ورانہ و ہنرمندانہ تعلیم و تربیت (Professional & Vocational

Education)

چنانچہ اب علم نہ صرف ہمارے دروازوں پر دستک (Knowledge at our door step) دے رہا ہے۔ بلکہ معلومات کا خزانہ ہماری انگلیوں کے اشاروں پر (Information at our finger tips) ہمارے سامنے ڈھیر ہونے کو تیار ہے۔ اس لیے ملک گیر ہی نہیں عالمی کلاس روم (World wide Class Room) کے وجود نے حقیقی یونیورسٹی (Virtual University) کو عملاً قائم کر دیا ہے۔ آج عالمی پیمانے پر تقریباً بیس کروڑ سے زائد طلبہ ان جدید طریقہ ہائے تعلیم سے جڑ کے ہر قسم کے تکنیکی و غیرہ تکنیکی علوم و فنون کو اپنی ضروریات و خواہشات اور حسب موقع وسہولت حاصل کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں تقریباً تین کروڑ طلبہ ان جدید طریقوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔

اس تعلیمی مناظر میں امت مسلمہ کے مندرجہ ذیل تعلیمی مسائل پر از سر نو غور و فکر اور لائحہ عمل کے ترکیب و تشکیل کی ضرورت ہے۔

(الف) امت مسلمہ کو صد فی صد خواندہ و باروزگار بنانا۔

(ب) علوم اسلامیہ کو فاصلاتی اور آن لائن نظام تعلیم سے جوڑ کر عالمی بنانا۔

(ج) علوم و فنون کو اسلامیانہ (Islamization of knowledge)

(الف) امت مسلمہ کو صد فی صد خواندہ اور باروزگار بنانا۔

بیشتر مغربی ممالک اس نشانہ کو پورا کر کے دیگر ممالک تک اپنی خواندگی اور اقتصادی

مشن کو آؤٹ سورسنگ وغیرہ کے ذریعے اپنے دست و بازو مضبوط کرتے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں سروچھابھیان (تعلیم سب کے لیے-SSA) پر حکومت ہندارہوں کھربوں خرچ کر رہی ہے جس سے ملت اسلامیہ کو بھی مستفید ہونے کی ضرورت ہے نیز اپنے تشکیل کردہ درسیات و نصابیات کو فوقانیہ / مڈل / میٹرک / انٹر تک سی بی ایس ای معیار کے لحاظ سے مرتب کر کے نافذ العمل کرنا چاہئے۔ فوری طور پر مدارس اسلامیہ اور مسلم اسکولوں میں NIOS (National Institute of Open Schooling) کے اسٹڈی سنٹر کے اکیڈمک اور فنی درسیات کو لاگو کرنا چاہئے تاکہ صد فیصد خواندگی کے ساتھ امت مسلمہ کی نئی نسل باروزگار بھی ہو سکے۔ اس سے آگے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU)، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU) اور پنجاب ٹیکنیکل یونیورسٹی (PTU) وغیرہ سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

(ب) علوم اسلامیہ کو فاصلاتی اور آن لائن نظام تعلیم سے جوڑ کر ملکی و عالمی بنانا ان دنوں دشمنان اسلام نے قرآن، سیرت، علوم اسلامیہ، اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کے خلاف جو عالمی جنگ چھیڑ رکھی ہے اس کا عین تقاضا یہ ہے کہ امت مسلمہ دینی اور دنیوی دونوں طرح کے علوم و فنون کے حصول اور ان کی توسیع میں تینوں طریقہ ہائے تعلیم یعنی روایتی، فاصلاتی اور آن لائن تعلیمی نظام کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں۔

تیزی سے بڑھتی ہوئی دنیا کی آبادی اور وسعت پذیر علوم و فنون کی وجہ سے یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ ہر جگہ کروڑوں کی عمارتیں کھڑی کر کے حال و مستقبل کی تمام نسلوں کو تعلیم یافتہ اور ہنرمند بنایا جاسکے۔ اسلام اور قرآن پاک صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ہدی اللناس کی حیثیت سے پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے لہذا مختلف ممالک کے مسلم ماہرین تعلیم پہلے اپنے اپنے ملکوں کے احوال و ظروف کے پیش نظر دینی علوم کو فاصلاتی اور آن لائن نظام تعلیم سے جوڑیں

پھر ایک مشترکہ عالمی اسلامی علوم کے درسیات کی ترتیب بھی آسان ہو جائے گی اس سلسلے میں ماہ دو ماہ کے شارٹ کورس سے لے کر سال دو سال سے چار سال تک کے تفصیلی نصابیات کا بھی خاکہ بنایا جاسکتا ہے اس ضمن میں ذیل کے چاروں مسائل پر ورک شاپ سمینار میں ماہرین کو اس خاکے میں عملی رنگ بھرنا ہوگا۔

(۱) اغراض و مقاصد کی تشکیل (Policy Formation)

(۲) نظم و انصرام (Administration)

(۳) ساز و سامان کی فراہمی (Infrastructure Development)

(۴) نصاب سازی (Formulation of different courses)

ان مسائل کے حل کے ساتھ ہی ذیل کے اسلامی کورسز کی تشکیل کا مرحلہ آسان

ہوسکتا ہے۔

(۱) قرآن فہمی کے لیے عربی زبان دانی کا آسان کورس

(۲) عربی بول چال (Functional Arabic)

(۳) درسیات حدیث مختصر المیعاد/طویل المیعاد (سالانہ یا دو سالہ)

(۴) درسیات فقہ۔ مختصر/طویل المیعاد (سالانہ یا دو سالہ)

(۵) درسیات دعوت اسلامی۔ مختصر/طویل المیعاد (سالانہ یا دو سالہ)

(۶) درسیات سیرت پاک۔ مختصر/طویل المیعاد (سالانہ یا دو سالہ)

(۷) اردو زبان دانی۔ ششماہی درسیات

(۸) تاریخ اسلام۔ ششماہی درسیات

(۹) تاریخ و تہذیب ہند۔ ششماہی درسیات

(۱۰) بطرز (SSA) صد فیصد خواندگی کا آسان ششماہی یا سالانہ کورس



(۱۱) ترک تعلیم کرنے والوں کے لیے نڈل اور میٹرک کا نصاب بطرز NIOS اور ان کے اسٹڈی سنٹرز کا قیام

(۱۲) تعلیم بالغان کی اسلامی بنیادوں کے ساتھ اردو اور ہندی کی ششماہی درسیات وغیرہ وغیرہ۔

فاصلاتی تعلیم کی درسیات چونکہ خود آموزی (Self Learning) کی بنیاد پر ترتیب دی جاتی ہے اس لیے اس کے تکنیکی اور دیگر مسائل پر غور و فکر سے پہلے مندرجہ ذیل اقدامات برائے مشاورت اور ذہن سازی بے حد ضروری ہیں۔

(۱) ہم خیال وہم فکر علماء، دانشوران اور ذمہ داران مدارس کے ساتھ اس سلسلے کے مختلف مسائل پر غور و خوض کے لیے سمینار و سیمپوزیم اور ورک شاپ کا انعقاد۔

(۲) مذکورہ بالا چاروں تکنیکی مسائل پر غور اور لائحہ عمل کی تیاری کے لیے ان مسائل کے ماہرین کے درمیان تبادلہ خیال کی نشستوں کا انعقاد۔

(۳) بعض قائم شدہ مدارس اور مسلم اسکولوں میں NIOS کے اکیڈمک + ووکیشنل اسٹڈی سنٹر کے قیام پر غور و خوض۔

بعض مسلم ملکوں میں اور ہندوستان میں بھی اس جانب جزوی اقدامات کیے گئے ہیں مگر انہیں علوم اسلامیہ کو فاصلاتی تعلیم سے جوڑنے کے لیے ابھی میلوں آگے جانا ہوگا۔ اس جانب عملی اقدامات کرنے میں ہندوستان دیگر مسلم ممالک سے نسبتاً بہتر مواقع کا حامل ہے جس کے دو اسباب بالکل واضح ہیں۔ اولاً یہ کہ ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی نشوونما اور فروغ و ارتقا کی ایک عظیم روایت اور تاریخ ہے۔ دوم تقریباً تمام مسلم ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان نے انفارمیشن ٹکنالوجی اور ان جدید طریقہ ہائے تعلیم کا زیادہ عملی تجربہ کیا ہے اس سلسلے کی تکنیکی سہولتیں مسلم ملکوں سے زیادہ یہاں ہندوستان میں دستیاب ہیں۔ یہاں ویڈیو آن ڈیمانڈ کے علاوہ گیان

ورٹن (G.D.) کے ۴-۴ ٹی وی چینل ۲۴ گھنٹے تعلیمی نشریات پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان پر مستزاد ایف، ایم ریڈیو کی تعلیمی نشریات کا سلسلہ بھی قائم ہے۔ لہذا ”مانو“ اگنو، ان آئی، او، ایس۔ ہمدرد اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے مسلم ماہرین فاصلاتی و آن لائن تعلیمی نظام سے استفادہ کر کے مدارس اسلامیہ ہند ساری دنیا کے مدارس اسلامیہ کے سامنے ایک عمدہ اور عملی نمونہ پیش کر سکتے ہیں شرط صرف منصوبہ سازی اور عمل آوری کا ہے۔

### (ج) علوم و فنون کو اسلامیانہ (Islamization of Knowledge)

اس ضمن میں پوری امت مسلمہ پر پوری تین سو سالہ سائنسی پسماندگی کا قرض اتار کر دنیا کی ترقی یافتہ قوموں سے بھی آگے بڑھنے کا عمل ہے۔ دوم جملہ الحادی علوم و فنون کو قرآن و سنت کی بنیاد پر ”مسلمان“ بنانا ہے۔ آخر کیا بات ہے کہ چند صدیوں پیشتر انہیں مدارس اسلامیہ سے الجبرا کا موجد محمد بن خوارزمی ابھرا، نصیر الدین نے سب سے پہلے علم مثلث (Trigonometry) ایجاد کی۔ یہیں سے بصریات کا امام ابوالہشتم نکلا ابوبکر رازی نے مادہ، حرکت، مکان و زمان اور مناظر و مریا پر کتابیں لکھیں، ابو یوسف یعقوب الکندی نے موجوں (Tides) کی جانکاری فراہم کی۔ جابر بن حیان کو دنیا کے سائنس میں بابائے کیمیا (Father of Chemistry) کہا گیا۔ ابن بیطار کو سولہویں صدی میں امام علم نباتات قرار دیا گیا۔ الدمیری نے ”حیاء الحیوان“ لکھنے کا کارنامہ انجام دیا۔ الفرغانی نے فلکیات کے قیمتی مشاہدات پیش کیے، البتانی نے سورج کے گرد مدار ارضی (Orbit) کو گول نہیں بیضاوی ثابت کیا۔ البیرونی ۱۸ قیمتی دھاتوں کے اوزان مخصوصہ (Specific Gravity) دریافت کیے۔ ابن سینا کی تاریخ ساز کتاب ”القانون فی الطب“ کو طب کا بائبل کہا گیا ہے۔ رازی نے سب سے پہلے چیچک اور خسرے پر نہایت گراں قدر تحقیق پیش کی۔ ابوالقاسم الزہراوی کو بابائے سرجن کہا گیا۔ ابو عبد اللہ محمد اور یسی جغرافیائی علم اور نقشہ نویسی میں عہد وسطیٰ کا امام قرار دیا گیا۔ ابو جعفر محمد نے کیمیاوی ترازو (Chemical Balance) ابوالحسن

نے دور بین اور فرغانی نے دریا کی طغیانی ناپنے کا آلہ اور دھوپ گھڑی ایجاد کی۔ یوں ہنری پرمنے (Henry Pirmne) کے لفظوں میں ”اسلام نے کرۂ ارض کی صورت ہی بدل ڈالی“ قرآنی بصیرت نے مسلم سائنسدانوں کو اس عظیم ترین سائنسی صداقت کا شعور بخشا کہ قدیم کلاسیکی سائنس جو لنگڑی اور محض استقراری (Inductive) منطق کے ایک پاؤں پر اچک اچک کے بمشکل چل رہی تھی مسلمانوں نے استخراجی (Deductive) منطق کے ساتھ ہی ساتھ سائنس کو اقراً باسم رب الذی کی ہدایت کے مطابق خدا پرست بنا کر اسے دو پاؤں اور چھوؤں سمتوں کی تجرباتی باریک بینی بھی عطا کر دی۔

یہ تو پدرم سلطان بود والی باتیں تھیں آج کی تقابلی صورت حال میں اپنی پستی کا حد سے گزرنے پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے کل ۵۷ مسلم ممالک میں یونیورسٹیوں کی جملہ تعداد ۵۰۰ ہے جب کہ صرف ایک ملک امریکہ میں ۵۸۵۷ یونیورسٹیاں ہیں۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کی رینٹنگ کے مطابق دنیا کی ۵۰۰ سرفہرست یونیورسٹیوں میں مسلم ممالک کی ایک بھی یونیورسٹی نہیں ہے جو انتہائی مایوس کن اور شرمناک ہے UNDP کی طرف سے اکٹھا کیے گئے اعداد و شمار کے مطابق عیسائی ممالک کی شرح خواندگی ۹۰٪ ہے ان میں سے ۱۵ ممالک میں ۱۰۰ فی صد شرح خواندگی ہے اس کے برعکس مسلم ممالک کی اوسط شرح خواندگی ۴۰٪ ہے۔ دنیا بھر کے ایک بھی مسلم ملک میں ۱۰۰٪ شرح خواندگی نہیں۔ یورپی ممالک کی ۴۰٪ آبادی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہے مسلم ممالک میں یہ تعداد ۲٪ سے زائد نہیں۔ مسلم ممالک کے ہر دس لاکھ میں سے ۲۳۰ سائنسداں بنتے ہیں اس کے برعکس امریکہ کے ہر دس لاکھ میں سے ۴۰۰۰ اور جاپان میں ۵۰۰۰ سائنسداں بنتے ہیں۔

تحقیق کے میدان میں بھی یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے کوسوں آگے ہیں۔ پوری عرب دنیا میں کل وقتی عرب محققوں کی تعداد صرف ۳۵۰۰۰ ہے یعنی دس لاکھ عربوں میں ۵۰ ٹکنیشن، اس کے برعکس ہر دس لاکھ یہودی عیسائی افراد میں ۱۰۰۰ ٹکنیشن ہیں۔ مسلم ملکوں کے پاس بحیثیت مجموعی انسانی اور مادی وسائل کی کوئی کمی نہیں پھر بھی مسلم ممالک میں (GDP)

کل آمدنی کا صرف 0.2% تحقیق و ترقی پر خرچ ہوتا ہے مگر مغربی ممالک ۵% خرچ کرتے ہیں۔  
برطانیہ کے ہر دس لاکھ افراد پر ۲۰۰۰ کی تعداد میں کتب کی اشاعت ہوتی ہے۔ مصر میں صرف  
۲۰ کتب۔ یوں زندگی کے ہر میدان میں مسلمان عیسائیوں سے پیچھے ہیں۔ تمام ۵۷ مسلم  
ممالک کی GDP تین کھرب ڈالر ہے جبکہ صرف امریکہ کی GDP ۱۲ کھرب، جاپان کی ۳  
کھرب ۸۰ ارب ڈالر، جرمنی کی ۲ کھرب ۴۰ ارب ڈالر ہے۔

آبادی اور وسائل کے اعتبار سے یہودی مسلمان سے ۱۰۰ درجے کم ہیں اس کے  
باوجود یہودی مسلمانوں سے ۱۰۰ گنا زیادہ طاقتور ہیں اور دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا شاید  
مبالغہ نہ ہوگا کہ بیسویں صدی یہودی صدی تھی، ایٹم بم کا موجود آئن اسٹائن بابائے نفسیات سگمنڈ  
فرائڈ اور بانٹی کمیونزم کارل مارکس تینوں یہودی تھے۔ پولیو ویکسین پنٹا ٹائس ویکسین کے موجد  
جنسی مرض آتشک، اعصابی عدم توازن، ہر قسم کے فوبیا اور ڈپریشن (برناڈ کیٹر)، انسانی  
آنکھوں کا محقق (نوبل یافتہ شانلے کوبن) گردوں کی صفائی کی مشین ڈائلاس کا موجد (ولیم  
کولف) سب کے سب یہودی تھے۔ ان کے علاوہ پہلی مائیکرو پروسیسنگ چپس کا موجد نیوکلیر  
چین ری ایکٹر آپٹیکل، فائبر کیبل ٹریک سگنل، اسٹین لیس اسٹیل (Stainless steel)  
ٹیلیفون، مائکروفون، ویڈیو ٹیپ ریکارڈ، ساؤنڈ موویز وغیرہ کے موجود بھی یہودی تھے۔ حد تو یہ ہے  
کہ اولمپک گیمز میں سونے کے سات تمغوں کی جیت کا ورلڈ ریکارڈ بنانے والا مارک پٹنر اور مسلسل  
تین بار سونے کے تمغے جیتنے والے بھی یہودی (لینی کرلیز یلبرگ اور بورس بیکر) تھے۔ پچھلے ایک  
سو پانچ برسوں میں یہودیوں نے ۱۸۰ نوبل پرائز انعام جیتے جبکہ ایک ارب سے زائد آبادی والی  
مسلم قوم نے کل ۴ نوبل پرائز جیتے (ڈاکٹر عبدالسلام، مسٹر عبادی، نجیب محفوظ، محمد یونس)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی دنیا نے پچھلی کئی صدیوں میں علمی و سائنسی انقلاب برپا  
کر دیا ہے مگر اس علمی دھماکے نے جس بے لگام انداز میں نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کے نام پر  
پوری انسانیت کو بے سمت کر کے بیابان مرگ میں پہونچا دیا ہے۔ اس نے پوری انسانیت بلکہ



پورے کرۂ ارض کو شدید ترین خطرات سے دوچار کر دیا ہے کیونکہ مغرب کی الحاد زدہ اور مادہ پرست سائنس نے انسانی اور کائناتی صلاح و فلاح کے لیے اسلام کی عطا سائنس کی غایتی (Purpose) بنیاد کو یکسر نظر انداز کر کے صرف علت (Cause) اور معلول (Effect) کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا ہے جبکہ کائنات کی ہر شے کی بقا کے لیے تینوں بنیادیں لازمی ہیں لہذا انسانی و کائناتی تحفظ و ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ امت مسلمہ سارے جہان میں اقرا باسم ربک الذی کی وجہ سے نظریاتی سپر پاور تو ضرور ہے اسے سائنسی اور مادی اعتبار سے بھی سائنسی سپر پاور بننا ہوگا۔ اسی پر خود مسلمانوں اور سارے انسانوں کے محفوظ مستقبل کا انحصار ہے واعدوا لہم ما استعظمت کا بھی تقاضا ہے اور تسخیر کائنات کی ۵۶ آیات قرآنی کا بھی یہی مطالبہ ہے۔ ورنہ افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض کا طعنہ ہم پر بھی صادق آئے گا۔

اس لیے امت مسلمہ کو الحادی علوم و فنون کو مسلمان بنانے کے حالیہ عمل کو تیز تر کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں اسماعیل راجعی الفاروقی شہید، ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم، مولانا شہاب الدین ندوی، ضیاء الدین سردار، حسین نصر، پروفیسر سید محمد سلیم کی کاوشوں کو جدید سائنسی و تعلیمی چیلنجوں کے پیش نظر انہیں مربوط و مدلل بنا کے آگے بڑھانا ہوگا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد اقبال، ابوالاعلیٰ مودودی، علامہ شبلی، مولانا علی میاں اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ نے بھی اپنی بعض و قیع تصانیف میں جو اشارے کیے ہیں ان کی توضیح و توسیع کی بھی ضرورت ہے تمام مسلم ملکوں کی اہم یونیورسٹیوں اور دارالعلوم میں حسب استطاعت ایک شعبہ نظری و علمی و سائنسی تحقیق و ترقی کو جدید ترین معیار کے مطابق متشکل و مستحکم کیے بغیر ان الحادی علوم کو نہ تو مسلمان بنایا جاسکتا ہے نہ ہمارے مدارس اسلامیہ اور امت مسلمہ کو اصلی چیلنجوں کا جواب بنایا جاسکتا ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے کہ ۔

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود

کے سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

☆☆☆

## مدارس اسلامیہ اور میڈیکل سائنس

ڈاکٹر فخر عالم (ریسرچ آفیسر) ☆

صحت و مرض کا مسئلہ براہ راست انسانی بدن سے جڑا ہونے کے باعث ہر دور میں بنیادی اور ترجیحی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مگر گزشتہ کچھ دہائیوں سے اس مسئلہ نے عالمی اہمیت اختیار کر لی ہے اور عالمگیر نوعیت کا حامل بن گیا ہے۔ اس کے تدارک اور حل کی عالمی سطح پر کوششیں ہو رہی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن، ریڈ کراس اور یونیسف جیسے بین الاقوامی ادارے وجود میں آئے ہیں۔ ان اداروں کے قیام کا اصل مقصد ایک صحت مند عالمی سماج کی تشکیل ہے۔

دراصل عالمی سطح پر یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ صحت کا مطلوب حاصل کئے بغیر نہ تو انسان دنیاوی لذتوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اور نہ وہ کلیدی کردار ادا کرنے کا اہل ہو سکتا ہے، جو کائنات کی اہم ترین مخلوق ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔

حسن صحت کی سوچ محض انسانی داعیہ نہیں بلکہ یہ خالق کائنات کے تخلیقی مطلوب کا بھی حصہ ہے۔ متعدد قرآنی آیات سے انسان اور کائنات کی تخلیق کے سلسلہ میں غایت اہتمام، کمال تزئین اور آرائش و زیبائش کے اشارے ملتے ہیں<sup>۱</sup>۔ چونکہ انسان اس کائنات کا مرکزی کردار ہے اور اس کی خوبصورتی کا راز اس حسن صحت میں پنہاں ہے۔ اس لئے انسانوں کی صحت کے

☆ ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ

بغیر نہ تو خوبصورت دنیا آباد کرنے کے منصوبہ کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی صحت مند سماج کا وجود عمل میں آ سکتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام ادیان میں صحت و مرض کا بیان مذہبی تعلیمات کے حصہ کے طور پر ملتا ہے۔ اور علوم کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میڈیکل سائنس کا وجود مذہب کے بطن سے ہوا ہے اور تاریخ کے ابتدائی دور میں مذہبی پیشوا ہی طبی علوم کے علمبردار رہے ہیں<sup>۲</sup>۔ یونانی طب اور آیوروید کا شمار دنیا کی قدیم طبوں میں ہوتا ہے حضرت اور لیس اور برہما جی کو ان طبوں کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ سے قطع نظر انسانوں کے ذہنی اور فکری ارتقاء کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کرۂ ارض پر اپنے وجود کے ابتدائی ایام میں اس عہد کا انسان غذا اور پانی کی تلاش کے ساتھ ازالہ مرض اور قیام صحت کے اسباب کی جستجو میں مصروف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طبی علوم کا شمار، اولین سائنسی بازیافتوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ یہ شعبہ علم، انسان کی بنیادی ضرورتوں سے تعلق رکھتا ہے اس لئے آج تک اس کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ امتداد وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوا ہے۔

امراض و علاج کے باب میں طویل تحقیقی تگ و دو کے بعد یہ بات محسوس کی گئی کہ صحت و مرض کی جنگ ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ ان تحقیقی تجربوں سے محققین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ صحت کا مطلوب حاصل کرنے کے لئے تحفظی تدابیر اور Prevention کے ضابطے زیادہ موثر ہیں، اس احساس کے بعد حفظان صحت کے پہلوؤں پر خاص توجہ مرکوز کی جا رہی ہے۔ اور عوام میں اس کا شعور بیدار کرنے کے لئے تشہیر کے تمام وسائل بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ اس ضمن میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور ان کوششوں کے بڑے خوشگوار نتائج سامنے آرہے ہیں۔ مگر چونکہ ذرائع ابلاغ کی تشہیر کے نتائج، عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ لہذا یہ محسوس کیا گیا کہ سماج کے ہر طبقہ میں صحتی بیداری کی عام لہر پیدا کرنے اور صحت کے تئیں پائیدار عوامی شعور بیدار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سماج کے افراد کی اس طرح ذہنی اور فکری تربیت کی جائے کہ یہ شعور ایک راسخ عقیدہ بن جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے

اسکولوں کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ اسکولوں کی تربیت کے ذہنوں پر بہت گہرے نقوش مرتب ہوئے ہیں۔ یہاں کی جانے والی تربیت کا فائدہ یہ ہے کہ آج جو بچے اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں وہی ہمارے سماج کا مستقبل بنیں گے۔ لہذا ان کی ذہنی اور فکری تربیت سے حال اور مستقبل دونوں کی تربیت کا مطلوب حاصل ہونے کی امید ہے۔

اس وقت ہندوستان کی تمام عصری تعلیم گاہوں میں ہیلتھ ایجوکیشن کا انتظام ہے اور صحت کے موضوعات ان کے نصاب تعلیم کا لازمی حصہ ہیں۔ اور ابتدائی درجات ہی سے صحت و مرض کے مختلف عناوین کی تعلیم شروع کر دی جاتی ہے اور یہ سلسلہ ہائی اسکول اور سینئر سیکنڈری تک قائم رہتا ہے۔ عصری اسکولوں میں زیر تعلیم طلبہ کو بارہویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے صحت و مرض اور ان کے اسباب و تدارک سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچادی جاتی ہیں اور حفظان صحت اور قیام صحت سے متعلق بیشتر ضروری امور سے انہیں واقف کرادیا جاتا ہے۔ مثلاً ماحولیات سے بدن انسانی کا رشتہ، آلودگیوں کی مختلف اقسام اور ان کے اسباب و عوامل، تعدیہ کے ذرائع، متعدی امراض، ان کے روک تھام کی تدابیر، صحت بخش غذائیں، نقص تغذیہ سے پیدا ہونے والی بیماریاں، جنسی امراض اور حیاتیاتی سائنس کی نئی دریافتوں وغیرہ کے بارے میں انہیں اس قدر تعلیم دی جاتی ہے جو صحت کے تئیں ان کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے ضروری ہے۔

اس جدید تعلیمی نظام سے صحت کے تئیں عوامی شعور بیدار کرنے میں بڑی مدد ملی ہے اور صحتی منظر نامہ میں اس کے بہت ہی مثبت اثرات محسوس کئے جا رہے ہیں اور بیداری صحت کے تعلق سے اہم تبدیلیاں دیکھنے میں آرہی ہیں۔ مگر ہمارے ملک کی مسلم آبادی ان تبدیلیوں کے عمل سے بہت دور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے ہم وطنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں میں خواندگی کی شرح بہت کم ہے۔ تعلیم اور صحت کے درمیان گہرے رشتہ کے باعث، مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے اثرات، مسلمانوں کی صحت پر بھی پڑے ہیں۔ اور مسلمان زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح صحتی معاملہ میں بھی کچھڑے پن کا شکار ہے۔



مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب کم ہونے کے ساتھ ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے میں عصری درسگاہوں کے بجائے مدرسوں کی تعلیم کا رواج ہے، جہاں تعلیم کا تمام زور عقائد اور مذہبیات پر ہوتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد تعلیم کے باب میں صرف مدرسوں پر منحصر ہے جہاں تعلیم کے محدود تصور کے باعث ایسے فارغین نہیں پیدا ہو رہے ہیں، جو زمانے کے اسلوب اور قدروں سے بھی واقف ہوتے۔

مدارس کی وجہ سے مسلمانوں میں تعلیم تو آئی اور خواندگی کی شرح میں اضافہ بھی ہوا مگر تعلیم کا دائرہ صرف مذہب تک محدود رہنے کے باعث تعلیم کے باوجود مسلم معاشرہ زمانہ کی مثبت تبدیلیوں کے اثرات سے دور رہا۔ اور مسلمانوں کی سماجی پسماندگی کے ازالہ میں یہ تعلیم مفید ثابت نہیں ہو سکی اور تعلیم کے زیر اثر صحت کے میدان میں ان تبدیلیوں سے بھی مسلم معاشرہ دور رہا جن کا مشاہدہ دوسرے تعلیم یافتہ طبقوں میں ہوتا ہے۔

ان سچائیوں کے ساتھ یہ بھی ایک اہم واقعہ ہے کہ یہ دینی مدارس اسلامی ورثہ کے تحفظ و بقا اور نشر و اشاعت نیز لسانی تشخص اور تہذیبی اقتدار کے احیاء اور فروغ میں اہم کردار ادا کرنے کے علاوہ قومی خواندگی مشن جیسے اہم ہدف کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ ان مدرسوں کا ایک اہم پہلو اور بھی ہے جس کا اعتراف بہت کم کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لاکھوں ہندوستانیوں کو روزگار کے مواقع فراہم کر کے یہ مدارس ملک کو اقتصادی تعاون پیش کر رہے ہیں۔

ایک متوازن اور متبادل نظام تعلیم کے طور پر مدارس کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے، صوبائی اور مرکزی حکومتیں ان کی طرف متوجہ ہو رہی ہیں اور معاصر ہندوستان میں ایک مستقل تعلیمی نظام کی حیثیت سے فروغ دینے کے لئے مدرسوں کی تجدید کاری کا منصوبہ وضع کیا جا رہا ہے۔ مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم کی اصلاح کی ضرورت محسوس کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ مدارس کی تعلیم کا دائرہ صرف اسلامیات تک محدود رہنے کے سبب بہت سے سماجی اور عصری

داعیے نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ علوم ہماری سماجی ضرورتوں کا اہم حصہ ہیں اور چونکہ مذہب کا موضوع بھی انسانی سماج ہے۔ بایں ہمہ سماجی اور عصری علوم، دراصل مذہب کا توسیعی گوشہ ہیں۔ لہذا یہ محسوس کیا گیا کہ مدارس کے دائرے سے سماجی اور عصری رشتوں کو مربوط کر کے، ان کے کردار کو زیادہ وسیع بنایا جاسکتا ہے۔ اس طرح مدارس اسلامیہ مذہبی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ دیگر قومی اور ملی تقاضوں کے پورا کرنے کے اہل ہو جائیں گے اور یہاں کے فارغین اسلامی تعلیمات کے ساتھ معاصر علوم سے بھی بہرہ مند ہوں گے۔ اور مذہبی فرائض کے ساتھ شہری اور سماجی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں عصری درسگاہوں کے فضلاء کے شانہ بہ شانہ ہوں گے۔

حکومت کے علاوہ بہت سے مسلم حلقوں کی طرف سے بھی مدرسوں کی تعلیم کو عصری اسلوب سے ہم آہنگ بنانے کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ اور ارباب مدارس بھی اس پہلو پر غور کر رہے ہیں<sup>۳، ۴</sup>۔ مگر اب تک یہ مسئلہ غور و فکر کے دائرہ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اور چند متفرق مثالوں کے علاوہ اب تک کوئی ایسی نظیر سامنے نہیں آسکی ہے، جس سے مدرسوں کے نصاب تعلیم میں بدلاؤ کا اشارہ ملتا ہو۔ چاہے مسئلہ مدرسوں کے فارغین میں صحیحی بیداری کا ہوا یا پھر مدارس کے فضلاء کو عام قومی، سماجی اور سیاسی دھارے سے جوڑنے اور انہیں اقتصادی اور معاشی اعتبار سے مستحکم کرنے کا۔ یہ سارے داعیے مدارس کے روایتی نصاب میں تبدیلیوں کے متقاضی ہیں۔ اس وقت مدرسوں میں رائج نصاب تعلیم سے کسی حد تک قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم کا مقصود تو حاصل ہو رہا ہے۔ مگر مکمل طور پر اسلامی تعلیم کی ضرورتیں پوری کرنے سے یہ نصاب قاصر ہے۔ بلاشبہ یہ مضامین اسلامی تعلیمات کی اساس اور دینی تعلیم کا مقصود ہیں۔ اور ان مضامین کی تعلیم کے بغیر اسلامی تعلیم کا تصور ناقص ہے، مگر اسلام جو کہ ایک مکمل نظام حیات ہے، اس کا دائرہ عقائد کی اصلاح اور اخلاقی تعمیر کے ساتھ قومی و عصری داعیوں اور مسائل پر بھی محیط ہے۔ لہذا ذمہ داران مدارس کو یہ طے کرنا ہوگا کہ کیا مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت، صرف مذہبی علوم

تک محدود ہے؟ کیا مدارس کی موجودہ تعلیم سے زندگی کے سارے شعبوں میں مذہبی رہنمائی کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں؟ اور یہ سوال بھی بے حد اہم ہے کہ اس وقت ہمارے مدرسوں میں جس ڈھنگ کا نصاب رائج ہے کیا درسیات کا یہی اسلوب ماضی کے مدرسوں کا بھی تھا۔

ماضی میں رائج مدرسوں کے نصاب تعلیم کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے مدارس نے اسلامی علوم کے علاوہ اپنے عہد کی سماجی اور معاشرتی ضرورتوں کی تکمیل میں بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ مثلاً عباسی حکومت کے زمانہ میں جب یونانی علوم و فنون کی یلغار کے نتیجہ میں الحاد اور بے دینی کا سیلاب امنڈ پڑا تھا اور مذہب میں شکوک اور اوہام کی وباء پھیل گئی تھی تو اسلامی علوم و آداب میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی گئی اور مسلمانوں کے ایک گروہ نے یونانی علوم و فنون میں مہارت اور دسترس پیدا کر کے اپنے کارڈ کیا تھا۔ امام غزالی نے ان علوم کو اپنے زمانہ کے نصاب میں اسی لئے داخل کیا تھا کہ علماء اسلام ان سے واقف ہو کر ان کے اثرات کا خاتمہ اور الحاد و بے دینی کا سد باب کر سکیں۔<sup>۵</sup>

عصری داعیوں کے تناظر میں عہد سلطنت اور مغلیہ دور کے تعلیمی نصاب کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے مدرسوں میں منقولات کی تعلیم کا متوازی انتظام تھا۔ موجودہ دور کی اصطلاح میں یہ نصاب تعلیم، اسلامی اور عصری دونوں قسم کے علوم کا جامع تھا۔ عہد سلطنت کے مدرسوں میں مدرسہ فیروز شاہی (قیام ۱۳۵۲ء) اپنے عہد کی ایک ممتاز تعلیمی درس گاہ تھا۔ اس مدرسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے نصاب یا درسیات میں عقلی اور نقلی، دونوں علوم کے مضامین شامل تھے۔ یہاں اسلامی علوم مثلاً قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ ادبیات، علم معانی و بلاغت، منطق و فلسفہ، علم کلام، علم تصوف، علم ہیئت و ریاضی، علم نظر، علم طبعی، علم الہیات، علم طب و خطاطی کی تعلیم دی جاتی تھی۔<sup>۶</sup>

عہد فیروز شاہی کے حوالہ سے، نصاب تعلیم کی جو تفصیل ہم نے بیان کی ہے، اس میں

وہ تمام علوم شامل ہیں جو اس زمانہ تک منصہ شہود پر آچکے تھے اور اس عہد کا شاید ہی کوئی ایسا عصری علم ہو جو مدرسوں کے نصاب تعلیم میں شامل نہ ہو۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے الجزء اللطیف میں اپنی درسیات کی جو تفصیل لکھی ہے اس میں طب کی ایک اہم کتاب 'موجز القانون' کا بھی تذکرہ ہے۔<sup>۷</sup>

ملا نظام الدین کے مرتب کردہ نصاب کو ہندوستانی مدرسوں میں بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اور کسی قدر تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی ہندوستان کی بہت سی اسلامی درسگاہوں میں یہ نصاب تعلیم رائج ہے۔ اصل درس نظامی میں اسلامیات کے ساتھ طب کی کتابیں بھی شامل تھیں، مگر بعد میں یہ نصاب سے خارج ہو گئیں۔

طبی تعلیم کے حوالہ سے یہ واقعہ بھی بے حد اہم ہے کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بہشتی زیور جوڑ کیوں کی تعلیم و تربیت کے مقصد سے لکھی گئی ہے اور اس کا شمار مسلم گھروں میں بکثرت پڑھی جانے والی کتابوں میں ہوتا ہے۔ تھانوی صاحب نے اس کتاب میں نسوانی زندگی سے متعلق تقریباً تمام ضروری شعبوں کا احاطہ کیا ہے۔ اس کتاب میں طب کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے عہد کے برعکس ماضی کی اسلامی درسگاہوں کے پیش نظر تعلیم کا وسیع تصور تھا، اس عہد کے نصاب تعلیم میں اسلامیات کو ترجیحی مضمون کی حیثیت بہر کیف حاصل تھی، مگر حسب ضرورت عصری علوم کی تعلیم کا انتظام تھا اور اس عہد کے جتنے علوم تھے تقریباً ہر مضمون کی بنیادی معلومات بقدر ضرورت طلبہ کو فراہم کر دی جاتی تھیں۔ حالانکہ بیسیوں صدی سے پہلے علوم کی اس قدر شاخیں نہیں تھیں لیکن اس عہد کے مروجہ علوم مثلاً طب، ریاضی وغیرہ نصاب تعلیم کا ضروری حصہ تھے۔ اس عہد کے اسلامی اداروں میں ان مضامین کی تعلیم کے دو مقاصد تھے۔ ایک مقصد یہ تھا کہ یہ مضامین سماجی ضرورتوں کا حصہ تھے، ان علوم کی تدریس کی ایک غایت یہ بھی تھی کہ یہ علوم اسلامی مضامین کی تفہیم میں معاون تھے، اور ان سے سماج کی مذہبی



رہنمائی کی بہت سے داعیے وابستہ تھے۔ مگر رفتہ رفتہ مدرسوں کے نصاب تعلیم اور درسیات کے باب میں ارباب مدارس کے نظریہ میں بدلاؤ آیا اور بیسویں صدی کے نصف کے بعد مدرسوں کے نصاب سے ضروری معاصر علوم مثلاً طب وغیرہ خارج کر دیئے گئے۔ اور مدرسوں کی تعلیم کے دائرے کو صرف بنیادی مضامین تک محدود کر دیا گیا۔ جب کہ مدرسوں سے طب کی تعلیم کا کتنا گہرا تعلق رہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول کے فضلاء طبابت سے عملی رشتہ بھلے نہ رکھتے ہوں۔ مگر طبی مبادیات کا علم انہیں ضرور رہتا تھا۔

مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں اہل نظر کے خیالات مختلف ہو سکتے ہیں۔ اور اسلامی درسگاہوں میں کس قسم کا نصاب رائج ہو اور مدرسوں کا منہج تعلیم کیا ہو۔ اس باب میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے، مگر اس واقعہ سے انکار ممکن نہیں کہ مدارس اسلامیہ آنحضور ﷺ کے لائے ہوئے دین کے علمبردار اور مبلغ ہیں لہذا اسلامی تعلیمات کے باب میں آنحضور ﷺ کے طرز عمل کو مثالی رہنما اور قابل تقلید نمونہ ہونا چاہئے۔

تعلیمات نبوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقائد کی اصلاح، ذہنی، روحانی اور اخلاقی تربیت کے علاوہ جسمانی صحت کی اہمیت پر اسلام کی خاص توجہ رہی ہے۔ اس لئے کہ اسلام کو ایک ایسا معاشرہ مطلوب ہے جو صالح عقائد کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی اقدار سے متصف ہو اور اس کے افراد جسمانی طور پر صحت مند اور توانا ہوں۔ چنانچہ اسلامی تعلیمات میں افراد کی جسمانی صحت کو فضیلت و برتری کے معیار کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں آنحضور ﷺ کا بیان بے حد اہم ہے المومن القوی خیر و احب الی من المومن الضعیف و فی کل خیر<sup>۸</sup> یہ بیان صحت کی ترغیب اور صحیحی شعور کی بیداری کے حوالہ سے ایک اعلیٰ مثال ہے۔

احادیث کی کتب صحیحہ، تعلیمات نبوی کا اہم باخذ ہیں۔ ان احادیث کا ایک قابل شمار حصہ طبی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ جس میں حفظان صحت، علاج بالتدبیر، علاج بالغذاء اور علاج

لدواء کا تذکرہ ہے۔ ان بیانونوں سے طبی سائنس کے بہت سے ایسے سنہرے اصول برآمد ہوتے ہیں جن کی روشنی میں ایک مکمل نظام طب قائم کیا جاسکتا ہے۔

علماء نے طبی موضوعات سے متعلق ان احادیث کو علاحدہ کتابی صورت میں جمع کر دیا ہے، اور یہ کتابیں طب نبوی کے نام سے اہل علم کے مطالعہ کا حصہ ہیں۔ طب نبوی پر کام کرنے والوں میں شمس الدین ذہبی، جلال الدین سیوطی، ابوالعباس جعفر مستغفری، ابوالحسن علی بن موسیٰ رضا، ابوالقاسم نیشاپوری، محمد بن ابوبکر بن السنی، عبدالملک بن حبیب اندلسی، محمد بن عمر چغمنی، امین الدولہ بن تلمیذ شمس الدین محمد بن طولون القسبی اور علماء الدین کمال صفدی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔<sup>۹</sup>

طب نبوی کو ہندوپاک کے مصنفین نے بھی تحقیق و مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ حکیم اکبر ارزانی، حکیم غلام امام اکبر آبادی، ڈاکٹر افتد ار فاروقی اور ڈاکٹر خالد غزنوی اس سلسلہ کے اہم نام ہیں۔

نبوی تعلیمات کے متنوع موضوعات کے تجزیہ اور طب نبوی کے تعلق سے درج، مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوی درسگاہ کے نصاب تعلیم میں صحت و مرض اور میڈیکل سائنس گواہیت کا درجہ حاصل تھا، مگر موجودہ عہد کے اسلامی مدارس، جو کہ تعلیمات نبوی کی اشاعت کے عظیم بردار ہیں اور نبوی تعلیم ان کا اصل مطمح نظر ہے، ان کے نصاب اور درسیات سے طبی تعلیم جیسے اہم موضوع کا حذف ہو جانا یقیناً باعث حیرت ہے۔

اسلامی مدرسوں کی درسیات میں قرآن، حدیث اور فقہ کے غلبہ کی تاہید تو کی جاسکتی ہے لیکن معاصر علوم خصوصاً میڈیکل سائنس کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر نبوی درسگاہ اور ماضی کے مدرسوں کی طرح موجودہ مدارس کے نصاب میں طبی تعلیم کو شامل کر لیا جائے تو یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ صحت و مرض کی اہمیت سے واقف ہوں گے۔ اور اس

طرز تعلیم سے مسلمانوں میں حفظانِ صحت کا شعور بیدار کرنے میں مدد ملے گی۔ اور مسلمان سماجی دھارے کا حصہ بن سکیں گے۔

طبی تعلیم کی ضرورت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے سماج میں علماء اور مدارس فضلاء کو مذہبی رہنما اور ملی قائد سمجھا جاتا ہے۔ اور زندگی کے تمام شعبوں میں ان سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ لہذا مسئلوں کی اصل نوعیت اور ان سے صحیح آگہی کے بغیر قیادت کا فریضہ انجام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اس وقت امت کے سامنے مذہبی ارکان اور عقائد کے علاوہ بہت سے ایسے مسائل ہیں جو میڈیکل سائنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حیاتیاتی اور طبی ٹکنالوجی کی ترقی نے بہت سے ایسے مسئلوں کو جنم دیا ہے جو اسلامی فقہ کے لئے بالکل نئے ہیں۔ ان مسائل کے سلسلہ میں اسلام کے موقف کی وضاحت کے لئے فقہ کے ساتھ حیاتیاتی ٹکنالوجی اور طبی سائنس سے واقفیت ضرور ہے۔ مثلاً ضبط تولید، اسقاط حمل، اعضاء کی پیوند کاری، تبدیلی جنس کے آپریشن، جینیٹک اسکریننگ مصنوعی تخم ریزی، بار آوری اور ٹسٹ ٹیوب بے بی وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کے فقہی حل کے لئے طبی سائنس سے واقفیت لازمی ہے۔ لہذا موجودہ مدارس کے نصاب میں طبی مضامین کی شمولیت کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس سے ہمارے مدرسوں کے کردار میں وسعت و جامعیت پیدا ہوگی۔ اور ہمارے مدارس مذہبی ضرورتوں کی تکمیل کے علاوہ عصری اور سماجی تقاضوں کے پورا کرنے کے اہل ہو سکیں گے۔ اور معاصر تعلیمی نظام کی طرح مدارس کے فضلاء بھی سماجی ذمہ دار بن کر کواڈا کرنے کے لائق ہو سکیں گے۔ اس نئے نظام تعلیم سے مسلمانوں کی سماجی حالت میں بہتری اقتصادی پسماندگی کی اصلاح اور صحت کی اتر صورت حال میں بدلاؤ کی امید ہے۔

## حوالے و حواشی

۱۔ ملاحظہ ہو۔ سورۃ الملک، آیت نمبر ۵، سورۃ الحمد، آیت نمبر ۴، سورۃ التین وغیرہ

۲۔ ابن ابی اصیبعہ، عیون الانباء فی طبقات الاطباء، جلد اول (اردو ترجمہ)، اشاعت ۱۹۹۰ء، سی سی آر پبلشرز

نئی دہلی، ص ۱۹ تا ۴۰

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ ”عربی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے“ (مدرسہ سسٹم پر ۱۹۹۰ء کے رائج۔ دہلی سیمیناروں کی روداد: مقالات اور بحث)، شائع کردہ: خدا بخش اور نیشنل پبلک

لائبریری، پٹنہ

۴۔ ملاحظہ ہو۔ ”عربی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم“ از محمد یوسف بنوری، پیشکش: سید سلمان حسینی ندوی، شائع کردہ: جامعہ سید احمد شہید، احمد آباد (کنوٹی)، طبع آباد، لکھنؤ

۵۔ ملاحظہ ہو۔ الغزالی، مرتبہ علامہ شبلی نعمانی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، اشاعت: ۱۹۲۸ء

۶۔ تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں، از ظفر الاسلام اصلاحی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ،

اشاعت: ۲۰۰۷ء، ص ۳۳

۷۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، از ابو الحسنات ندوی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ طبع

جدید ۲۰۰۸ء، ص ۷۲، ۷۳

۸۔ صحیح المسلم، کتاب القدر، باب الایمان

۹۔ ”زاد المعاد میں مذکور نباتی ادویہ کی تعیین، جدید بیانات کی روشنی میں“ از فخر عالم، ماہنامہ محدث، جنوری

۲۰۰۴ء۔ دارالترجمہ والتالیف، بنارس، ص ۲۵





## عالمی تعلیمی رجحانات کے تناظر میں بہار کے مدارس ملحقہ۔ مسائل، مشکلات اور حل

☆ مولانا وصی احمد شمشی

موجودہ دور میں علم و فن کی ترویج و اشاعت دنیا میں جس اعلیٰ پیمانہ پر جاری ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہر چیز سے یکسو ہو کر جب ہم سوچتے ہیں اور ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تو ہر طرف علمی و تعلیمی دنیا میں چہل پہل نظر آتی ہے۔ علم و فن کے میدان میں بھاگ دوڑ کا خوشگوار منظر آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ اور کانوں میں انکشافات جدیدہ کی مست انگیز صدا گونجنے لگتی ہے۔ آج کے گلوبلائزیشن کے دور میں عالمی تعلیمی رجحانات کے اندر امکانات کے تلاش و جستجو کے لئے نئی تدبیر و کوشش جاری ہے۔

حضرت محمد ﷺ جس دین اسلام کو لے کر تشریف لائے وہ ایک مکمل ضابطہ حیات اور دستور زندگی رکھتا ہے۔ انسانی معاشرہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کو اس سے الگ کہا جاسکے۔ جہاں اخلاقی اصلاحات و تعلیمات کے سارے لازوال چشمے بہائے گئے وہیں علم و فن کا شعبہ بھی اپنی عام اصلاحات کے ساتھ بروئے کار لایا گیا۔

جن لوگوں نے گہری نظر سے اسلام کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی بسم اللہ ہی تعلیم و تعلم، درس و تدریس اور کتاب و قلم سے ہوئی ہے۔ اس دین مکمل میں یہ تمام چیزیں

☆ روپس پور، دھمسائن، دربھنگہ، بہار

از بس ضروری ہے۔ غیر ممکن ہے کہ کوئی مسلمان بھی ہو اور تعلیم و تعلم اور کتاب و قلم کا منکر بھی۔  
 کون نہیں جانتا کہ رحمت عالم ﷺ پر ایک ایسا زمانہ بھی گذرا کہ آپ اپنے ماحول  
 سے گھبرا کر اور سب سے کنارہ کش ہو کر ”حرا“ نامی پہاڑ کے ایک غار میں غور و فکر کی زندگی شروع  
 کی دنیا کی گمراہی پر اپنے رب سے لطف و کرم کے امیدوار تھے۔ کہ رب کائنات کی طرف سے  
 حضرت جبریل امین تشریف لائے۔ اور پروردگار عالم کی طرف سے پیغام سنایا جو سب سے پہلا  
 پیغام تھا۔ اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ الانسان من علق۔ اقرا و ربك الاکرم۔  
 الذی علم بالقلم۔ علم الانسان ما لم يعلم۔ (سورہ علق پارہ۔ ۳۰، آیت  
 ۵) ”ترجمہ:- اپنے رب کا نام لے کر پڑھئے جس نے پیدا کیا انسان کو گوشت کے ٹوٹھڑے  
 سے بنایا، پڑھئے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا انسان کو وہ  
 باتیں سکھائیں جو ان کو معلوم نہ تھیں۔“ ان آیتوں کے پڑھنے پر آپ کو مجبور کیا گیا۔ آپ نے اپنا  
 عذر پیش کرتے ہوئے فرمایا میں پڑھنا نہیں جانتا مگر بار بار مطالبہ ہوا۔ اللہ کا جو حکم ہوا تھا اسے اللہ  
 ہی کی مدد سے آپ کو بجالانا پڑا، جو اشارہ تھا کہ کائنات انسانی ضلالت و ظلمت کی وادی سے نکل کر  
 ہدایت و نور کی شاہراہ پر اسی وقت آسکتی ہے جب وہ اللہ کا نام لے کر پڑھنا شروع کر دے اور  
 درس و تدریس اور کتاب و قلم پر ایمان لائے۔ فیصلہ کیا جائے جس دین میں پڑھنے لکھنے اور تعلیم و  
 تعلم کی یہ شان ہو۔

علم کی ترغیب کے سلسلہ میں ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خود رب کائنات، اس  
 کے فرشتے، زمین و آسمان اور حد یہ ہے کہ مچھلیاں پانی کے اندر اور چونٹیاں سوراخوں میں اہل علم  
 کے لئے دعا گو ہیں۔“

1857 کی تباہی و بربادی کے بعد اسلام کی اشاعت اور کتاب و سنت کی تعلیمات کو عام  
 کرنے کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اپنے رفقاء کے مشورہ سے چھوٹی سی بستی دیوبند

ضلع سہارن پور یوپی میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی جو بعد میں ام المدارس کی حیثیت سے ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں جگہ حاصل کیا۔ ملت کے علماء و دانشور اس سے ضرور واقف ہوں گے کہ گذشتہ صدی میں دیوبند، کاتھیریڈی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے دور انحطاط میں اخلاص و للہیت تواضع و سادگی، تقویٰ و طہارت، جرأت و حق گوئی کے اوصاف عالیہ کو زندہ کیا۔ اور ایسے انسان پیدا کئے جو ہندوستان میں ہزاروں مکاتب و مدارس اور دینی اداروں کے قیام کا ذریعہ بنے اور ایسے پاکیزہ سیرتوں کو پیدا کیا، جنہوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر علم دین کی خدمت کی اور ملک و ملت کے وقار کو بلند کیا۔

صوبہ بہار اس سے الگ نہیں رہا بلکہ صوبہ بہار کے علماء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بڑے بڑے مدارس اور ادارے قائم کئے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ صوبہ بہار میں مذہبی و دینی تعلیم کے آغاز کی تاریخ نو سو سال سے بھی زیادہ قدیم ہے اس دور قدیم میں علماء صوفیا کرام مکاتب اور خانقاہیں قائم کر کے ان مراکز میں تعلیم و تربیت کا درس دیا کرتے تھے۔ یہی طریقہ تعلیم آگے چل کر باضابطہ مدارس کے نظام کا سلسلہ جاری ہوا۔ جیسے حالات بدلتے رہے مدارس و مکاتب اور خانقاہوں کے دائرہ کار بڑھتے رہے۔ رفتہ رفتہ مدارس میں تعلیم و نصاب کے مطابق تعلیمی ماحول قائم ہوتے رہے۔ آگے چل کر دوستوں کی قسموں کی طرح مدرسوں کے بھی اقسام بنتے گئے۔ دیوبندی، بریلوی، شیعہ، سنی، اہل حدیث، ندوی، ملحقہ، غیر ملحقہ، عالیہ، نظامیہ، وفاقی، غیر وفاقی، دینی، دنیاوی، جتنے فرقے جتنے مکتبہ فکر اتنے افکار کے مدارس، اب تو ذاتی مفاد ذاتی اغراض ذاتی اختلافات روزی، روٹی کی بنیاد پر ایک ایک گاؤں ایک ایک قصبہ میں کئی کئی مدارس قائم ہوئے ہیں۔ آپسی وفاق اور توافق کے فقدان میں بڑے بڑے مدارس ویران ہو رہے ہیں ضرورت ہے ان مدارس کے درمیان رابطہ اور وفاقی نظام قائم کیا جائے اور کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے ہمارے علم میں ایسے بھی مدارس ہیں جو ذاتی مفاد کے لئے قائم کئے گئے طلباء

ساتذہ کا پتہ نہیں مگر وہ اپنے مدرسہ کی تائید معتبر اداروں سے حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ضرورت ہے ان اداروں کو محتاط ہونے کی ورنہ ایسے ہی مفاد پرست لوگوں کا بازار گرم رہے گا۔ مخلص پیچھے رہیں گے۔

مدارس اور دینی تعلیم کے اداروں کے قیام کا مقصد قرآن و حدیث دعوت و تبلیغ تھا جس کے انسانی معاشرہ میں مدرسہ صدق و صفا کا منبع انسانیت کا مرکز مانا جاتا تھا مگر اب کے زمانے میں بہت سے مدارس کذب و ریا کا چشمہ اور بد عنوانیوں کا اڈہ مانا جا رہا ہے۔

بہار میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کا قیام 1912 میں ہوا جس کو الحاج سید نور الہدیٰ صاحب نے اپنے والد جناب شمس الہدیٰ کے نام سے منسوب کیا۔ انہوں نے اپنی جائیداد خاص کی آمدنی تقریباً دو ہزار روپے جنوری 1912 میں وقف کر دی اس زمانے میں اس مدرسہ میں پچھلے باصلاحیت اساتذہ خدمت پر مامور کئے گئے اس زمانے میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا معیار بلند تھا۔ حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب امیر شریعت خامس بھی اس مدرسہ سے 1928 میں امتیازی نمبر سے کامیاب ہوئے تھے۔ انہیں سونے کا تمغہ ملا تھا۔ جناب سید نور الہدیٰ صاحب نے 1919 میں مدرسہ کو سرکار کی تحویل میں دے دیا۔ اسی مدرسہ کی بنیاد پر 1921 میں مدرسہ انزائمیشن کمیٹی قائم کی گئی۔ 27 فروری 1979 میں ایک آرڈیننس کے ذریعہ ”بہار اسٹیٹ مدرسہ انجیکیشن بورڈ“ کا قیام عمل میں آیا۔

اس وقت صوبہ بہار میں مدارس ملحقہ کی مجموعی تعداد 3588 ہے۔ جس میں امداد یافتہ 1128 غیر امداد یافتہ 2460 ہے۔ اس کے علاوہ مدرسہ نظامیہ جس کو عرف میں آزاد مدارس کہتے ہیں ان کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد ہے۔ موجودہ سرکار اپنے ایک مکتوب 11.02.11.162 کے حوالہ سے 2460 غیر امداد یافتہ کو امداد یافتہ کے زمرہ میں شامل کرنے کا حکم جاری کیا ہے۔ جس کے لئے ایک ارب آٹھ کروڑ بیس لاکھ چالیس ہزار روپے بھی مختص کیا ہے۔ جس سے ملازمین و اساتذہ



کے ایک سال کے تنخواہ کی ادائیگی ہوگی۔ اساتذہ و ملازمین کی شرح تنخواہ وہی ہوگی جو ابھی پرائمری اور سکندری اسکولوں کے اساتذہ و ملازمین کو ملتی ہے۔ مشکلات یہ ہیں کہ سرکار کے حکام و ملازمین کے اقلیتوں کے تئیں جو رویہ رہے ہیں ان تجربات کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ارب آٹھ کروڑ بیس لاکھ چالیس ہزار روپے جو مختص کئے گئے ہیں وہ ادائیگی کے لئے نہیں بلکہ ہمیں بھول بھلیوں کے جال میں پھنسنے رہنے کے لئے نہ کہ اقلیتی اداروں کے مسائل کے حل کرنے کیلئے۔

آج سے تقریباً 28 سال پہلے 2986 مدارس جگن ناتھ مشرا سرکار کے کابینہ سے منظور کرا کر مدرسہ بورڈ نے ملحق کیا مگر سرکار کے محکمہ مالیات نے ایک آرڈیننس جاری کیا کہ اگر آدیش تک مالیاتی منظوری ملتی رہیں گے۔ ظاہر ہے ایک طویل مدت کے بعد موجودہ سرکار مذکورہ روپے منظور کئے ہیں۔ سرکار کی طرف سے ضلع ایجوکیشن افسر (D.E.O) اپنی سطح سے جان کر رہے ہیں بعد میں اپنی رپورٹ مدرسہ بورڈ کو بھیجیں گے۔ پھر مدرسہ بورڈ اپنی سطح سے جان کرائے گی۔ ظاہر ہے۔ ان بھول بھلیوں کے جال سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

جانچ کے کام اور اساتذہ کی بحالیوں میں بغیر صلاحیت کی جانچ کئے ہزاروں روپے رشوت چندہ کے نام پر ایجنٹوں اور دلالوں کے ذریعہ وصول ہونے کی بات فضا میں سنائی دیتی ہیں۔ ایسے ماحول میں ان مفاد پرستوں کے ذریعہ جو مدارس قائم کئے گئے یا کئے جارہے ہیں ان مدارس کے تعلیمی نظام اور معیار کیسے ہوں گے فرضی امتحان دینے والوں سے امتحان دلوائے جائیں گے۔ اور مدرسہ بورڈ کی اسناد تقسیم کروائیں گے۔ پھر ان مدرسوں کو دینی تعلیم کا ادارہ صدق و صفا کا منبع کون کہے گا۔ البتہ کذب و ریا اور بدعنوانیوں کا اڈا کہا جائے گا۔ بہر حال یہ مشکلات ہمارے اندرونی ہیں ان کے اصلاح کے لئے ارباب و حل و عقد کے لئے ایک سوالیہ نشان ہے جس پر غور و فکر کرنا ہے۔ مشکلات یہ ہے کہ مدرسہ بورڈ کو ایکٹ کے ذریعہ بہت سارے اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن مدرسہ بورڈ محکمہ تعلیم کے باہر رہا نہیں ہونے کی صورت میں

درمیان ہی میں معاملہ رک جاتا ہے۔ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔ جناب انوار کریم صاحب اپنے دور میں بحیثیت چیئر مین ٹیچرس سروس کنڈیشن اور اصول و ضوابط تیار کر کے 1991 میں حکومت بہار کے محکمہ تعلیم کو دستیاب کرایا لیکن تادم تحریر حکومت بہار سے اس کی منظوری حاصل نہیں ہو سکی۔ جناب نور الاسلام صاحب موجودہ انسپکٹر مدرسہ بورڈ خود ہی بتاتے ہیں کہ میں نے ذاتی طور پر موجودہ اسپیشل ڈائرکٹر سے رجوع کیا لیکن سراغ نہیں مل سکا۔ تحریری طور پر آسانیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن عملی اقدام میں کافی دشواریاں اور مشکلات ہیں۔ اختیارات یا تو ہیں لیکن محدود وسائل کی وجہ سے بہت سے مثبت اقدام درمیان ہی میں رہ جاتے ہیں۔ گویا سرکاری بھول بھلیوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اور صرف اشتہار بازی اور پروپیگنڈہ کے شکار ہو رہے ہیں۔

مدارس ملحقہ کے تدریسی نظام کے متعلق میں نے قبل ہی تحریر کیا ہے کہ کچھ مدارس کو چھوڑ کر بھی کے تدریسی نظام اور امتحان غیر معیاری ہیں۔ بلکہ 2460 اور امداد یافتہ مدارس 1128 میں اکثر نام نہادی خانہ پری کرنے والے مدارس ہیں۔ جن میں وہ مدارس بھی ہیں جن کے ماضی میں بڑے نام تھے۔ آج وہ صرف ڈھانچوں کی شکل میں امت کے ذمہ داروں پر مرثیہ خواں ہیں۔ 31 جولائی 1976 کو نیا نصاب کا خاکہ حکومت بہار کو پیش کیا گیا جسے منظور کرتے ہوئے 1978 کے گزٹ میں شائع کر دیا گیا۔ جس میں مدرسہ بورڈ کے اسناد کو وسطانیہ برابر درجہ آٹھ (میڈل) فوقانیہ برابر میٹرک، عالم برابر بی اے تسلیم کیا گیا۔ 22 سال کے بعد مدرسہ بورڈ کا نیا نصاب تعلیم 2001 میں تیار ہوا جو مدرسہ بورڈ کے منظوری کے بعد مدارس ملحقہ ہیں۔ نافذ ہے نیا نصاب تعلیم وسطانیہ اور فوقانیہ کے لئے ہے۔ 1978 کے نصاب تعلیم میں حالات کے پیش نظر جو کمیاں محسوس کی گئیں اسے نصاب تعلیم میں مکمل کر دیا گیا۔ عصری علوم کے مضامین کو بھی CBSE کے مطابق نصاب تعلیم میں شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح علم طبیعیات علم کیمیا علم حیاتیات نظریاتی 75 اور عملی 25 نمبرات دے کر مجموعی نمبر 100 کا پرچہ سائنس ہے جو شامل نصاب ہے۔ درجہ

فوقانیہ کا نصاب CBSE کے نصاب تعلیم کے عصری علوم کے نظام تعلیم کے مساوی ہے۔ واضح ہو کہ مدرسہ بورڈ کے فوقانیہ مولوی کے اسناد کو کونسل آف بورڈس اسکول ایجوکیشن ان انڈیا (COBSE) نے منظوری دے دی ہے۔ مدارس ملحقہ میں تعلیمی نظام تشفی بخش نہیں ہے۔ شریک امتحان طلباء و طالبات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن ان بچوں اور بچیوں بلکہ کہنا چاہئے ان فرضی طالب علموں مردوں اور عورتوں میں تعلیمی فقدان تو دور کتنوں کو اپنا نام و پتہ بھی لکھنا نہیں آتا۔ اور ان کے فارم امتحان موٹی رقم کے عوض بھر دیئے جاتے ہیں۔ امتحان کا پریشن بھی مل جائے گا۔ اس طرح کے طرز تعلیم سے قوم و ملت کے نونہالوں کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہوگا۔ اس سمت میں اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ ان مدرسوں کے امتحانات اور کاپی جانچ اور تعلیم وغیرہ کی اصلاح کیسے ہو؟ ان مکانوں کے ڈھانچوں میں کیسے تعلیمی ماحول برپا کیا جائے، یہ ایک اہم سوال ہے؟

جب تک انسان اپنی ذمہ داری اور داعیانہ احساسات کو زندہ اور اپنے ذاتی اغراض و مفاد کو ملت نیم جاں کو زندہ کرنے کے لئے نہیں ترک کرے گا اس وقت تک ان مدرسوں میں تعلیمی بیداری نہیں آسکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم قوم و ملت کے درد و غم رکھنے والے ذمہ دار دانشور اور علماء کرام قوم و ملت کے جانباز نوجوانوں! ہم سب مل کر قوم کے اندر جو تعلیمی بدعنوانیاں ہیں عورتوں مردوں میں جو جہاں ہے اس کو ختم کرنے کے لئے بیدار ہو جائیں۔ اصلاح کیلئے ذمہ داروں کا ایجوکیشن ٹاسک فورس بنائیں چند مدارس کو ٹارگیٹ بنائیں اور لگاتار اصلاح کی سعی و کوشش کریں۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سرکاری تحویل میں دے دیئے جانے کے بعد بہار مدرسہ بورڈ کا وجود ہوا۔ اب جو مدارس بورڈ سے ملحق ہے وہ عرف میں سرکاری مدارس کہلاتے ہیں جو مدارس بورڈ سے ملحق نہیں ہیں وہ عرف میں آزاد مدارس کہلاتے ہیں۔ حالانکہ یہی آزاد مدارس والے ہر طرح کے اصول و ضوابط کے پابند ہیں۔ داعی بن کر داعیانہ جذبہ سے مدرسہ میں قربانیاں دے کر قرآن و سنت کی تعلیم کی درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ بہت سے ملحقہ مدارس



میں بھی زندہ تابندہ و سر تازہ کرام اراکین حضرات ہیں۔ جنکے دم قدم سے مدرسہ میں تعلیمی دینی روحانی ماحول قائم ہے۔

مدارس کے نصاب کو آج کے عالمی تعلیمی رجحانات کے اندر کیا امکانات ہو سکتے ہیں جن کو ہم اپنے مدارس میں اپنا کر عصری علوم و فنون کے بڑھتے دباؤ کو روک سکیں اور اپنی شناخت اور روایتی تہذیب و تمدن کو بھی بچائے رکھیں۔ بغیر محنت و کوشش سے مدرسہ بورڈ کے درجوں کے امتحانات میں اچھے نمبرات سے کامیابی مل جانے کی وجہ سے اب مدرسہ بورڈ کے امتحانات میں بہت سے غیر مسلم بچے بچیاں امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہوتے ہیں۔ بقول چیئرمین مولانا اعجاز احمد صاحب غیر مسلموں کا مدرسہ میں داخلہ لے کر پڑھنا ہمارے لئے فال نیک ہے۔ مستقبل میں کیسا رہے گا ایک سوالیہ نشان ہے۔ قابل غور ہے۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب معروف اسلامی اسکالر ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مدرسہ کی جدید کاری کا معاملہ اب محض نظریہ بن کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ بے شمار مدارس ایسے ہیں جہاں عملاً جدید کاری کا کام شروع ہو چکا ہے مثلاً دارالعلوم دیوبند اور جے پور میں واقع مدرسہ جامعہ الہدایہ نے اپنے نصاب میں جدید علوم جسے عصری علوم بھی کہتے ہیں کو شامل کر لیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند اور ملک کے دوسرے مدارس نے جدید طریقہ تعلیم کو اپنے یہاں رائج کیا ہے۔ وہاں کمپیوٹر کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور ہندی و انگریزی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ مدرسہ انتظامیہ کے متعلق جدیدیت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے مدرسہ میں بروئے کار نہ لایا جائے مسئلہ یہ ہے کہ مدرسہ سے پڑھنے والے بچوں کے لئے ملازمت کے وہ مواقع نہیں ہیں جو کہ سیکولر اداروں سے نکلنے والوں کے لئے ہیں۔ میرے تجربہ کے مطابق اگر تربیتی ادارے قائم ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمام مدارس عصری علوم اپنے یہاں نافذ کر دیں گے۔ (دیکھئے دی سنڈے انڈین اردو ص 50، 21 اگست 2011ء)۔ دینی و عصری علوم کے ادارے اسلامی ماحول میں جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم



اکل کو انند و ربار مہاراشٹر میں جناب مولانا غلام محمد دستا نوی مدظلہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے قائم کر کے عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ کوئی جائے وہاں دیکھے۔ اور سیکھے۔

مارگریٹ الوا گورنر اتر اکنڈ نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ 16 ستمبر کو عالمی تعلیمی رجحان کے جائزے اور امکانات کے بین الاقوامی سمینار جو IOS کے زیر اہتمام سنہا انسٹی چیوٹ پٹنہ کے ہال میں ہو رہا تھا 2011 کی مردم شماری میں کئی مثبت چیزیں ہیں جن میں سب سے نمایاں یہ ہے کہ ملک کی شرح خواندگی 74% تک پہنچ گئی ہے ملک اسی شرح خواندگی کے ساتھ ترقی کے راہ پر بھی گامزن ہوا ہے۔ کیونکہ تعلیم اور ترقی کا رشتہ چولی دامن کا ہے۔ آج ہندوستان دنیا کو امید کی ایک نئی کرن دے رہا ہے۔ اور ہم مسلمانوں کی حالت سچر رپورٹ میں دلت مہادلت سے بھی کمتر بتائی گئی ہے۔ کیا ہم اس حالت سے اوپر اٹھنا چاہتے ہیں کہ نہیں۔ اگر چاہتے ہیں تو پھر ہمیں آج ہی سے کمر کس لینا ہوگا۔ تب ہی حالات بدل سکتے ہیں۔ ورنہ یہ سمینار اور جلسے ہوتے ہی رہیں گے۔ اور حالت ہماری بدتر ہوتی چلی جائے گی۔

ملیشیا سے آئے مہمان دانشور ڈاکٹر محمد غزالی بن محمد نور نے کہا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ بہت سارے مواقع ابھر کر آج ہمارے سامنے آئے ہیں۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس عالمی تعلیمی رجحانات کے ماحول میں نظام تعلیم میں ہونے والی تبدیلیوں سے پیدا شدہ مواقع کا فائدہ اٹھانے کے لئے تیار بھی ہیں کہ نہیں۔ تعلیم بھی عالمی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سے مقامی کلچر اقدار رسم و رواج اور روایتی تعلیم کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ روایتی یعنی دینی تعلیمی اداروں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ کیونکہ یہی وہ ادارے ہیں جنہوں نے ماضی میں اقدار پر مبنی تعلیم کو فروغ دیا۔ اور ایسی امید مستقبل میں صرف انہیں دینی اخلاقی روحانی اداروں سے کی جاسکتی ہے۔ ملیشیا میں صرف انہی دینی اخلاقی روحانی سے کی جاسکتی ہے۔

ملیشیا کی معروف دانش گاہ ایشیا یونیورسٹی کے ماہر تعلیم پروفیسر جان ارول فلپس نے کہا کہ ملیشیا نے اس سلسلے میں پیش رفت کی ہے۔ جس کی وجہ سے وہاں روایتی تعلیمی اداروں کو درپیش خطرات سے بچایا جاسکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں تجربات کی روشنی میں ہندوستان میں بھی اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

مذکورہ مدارس کی اصلاح اور ان میں تعلیمی ماحول قائم کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اصلاح معاشرہ کے طرز پر عوام اور دانشوروں میں جلسے کئے جائیں۔ آپس میں تبادلہ خیال کر کے ہر شہر اور ہر مقامات پر علماء دانشور ذمہ دار جوانوں پر مشتمل کمیٹی یا وفد یا ایجوکیشن ٹاسک فورس بنا کر اصلاح کی کوشش کی جائے۔ طویل مدتی تعلیمی بیداری ایجنڈا بنایا جائے اور کام شروع کیا جائے۔ ان میں ہر طبقے کے افراد شامل کئے جائیں بلکہ سنجیدہ تعمیری ذہن کی خواتین کو شامل کیا جائے۔

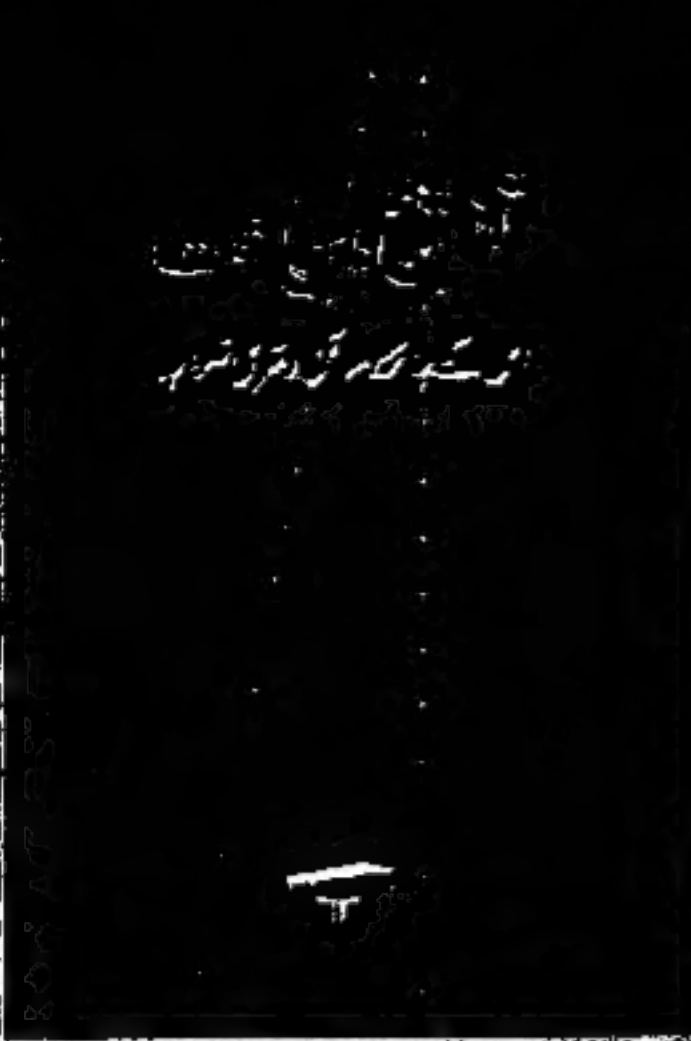
سرکاری سطح پر مسلمانوں کے لئے جو اسکیم اور فلاحی منصوبے و پروگرام ہیں اسے عام مسلم مرد و خواتین میں احساس دلایا جائے۔ مدارس کے تعلق سے تمام حکومتوں سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے اپنا لائحہ عمل بنائیں۔ ہندوستان خاص کر بہار میں مسلم اقلیت کے لئے تعلیم کی فنڈنگ اوقاف کانٹے وسائل کے طور پر استعمال میں لایا جائے۔

”بچوں کے مفت اور لازمی حصول تعلیم کا حق (جسے عام طور پر R.T.E ایکٹ کہا جاتا ہے اس قانون سے مدارس اسلامیہ پر سیدھی ضرب پڑے گی۔ اور اس کی گردن تن سے جدا ہو جائے گی۔ آئین ہند کے دفعہ 30 (بنیادی حقوق) کے تحت چلنے والے اداروں کے حقوق بھی اس ایکٹ سے پامال ہوں گے۔“

نہ تھک کے بیٹھ کہ تیری اڑان باقی ہے  
زمین ختم ہوئی آسمان باقی ہے

☆☆☆





## IFA Publications

161 - F, Basement, Joga Bai, Post Box No - 9708,  
Jamia Nagar, New Delhi - 110025

Tel : 26981327 Email: ifapublication@gmail.com